

## قیام امام حسینؑ کا جغرافیائی جائزہ

حرف آغاز

بسم الله الرحمن الرحيم

”الحمد لله الذي جعلنا من المتمسكين بالقرآن العظيم وبنبيه

واهل بيته المعصومين عليهم صلوة الله والصلوة المصلين نتبراء من اعدائهم

واعلم الله اجمعين، قال نبي صلى الله عليه وآله وسلم: ان الحسين مصباح

الهداء وسفينة النجات“

پہنچنے والی مرتبت کی یہ حدیث کہ ”حسینؑ ہدایت کے چراغ اور کشتی نجات ہیں“ مسلم

اور متواتر ہے فریقین کے نزدیک متفقہ علیہ ہے۔

یقیناً ”حسینؑ“ اس تاریکی اور گھٹا ٹوپ اندھیرے میں بھٹکتی ہوئی انسانیت کیلئے روشنی

کامینا رہیں۔ ہر دور اور خصوصاً آج کے دور میں ظلمات کے اس بیکراں سمندر میں ڈوبتی ہوئی

انسانیت کیلئے ایک سہارا اور نجات کی کشتی ہیں۔ اگرچہ ہمارے تمام آئمہ امت کے لئے ہدایت کی

روشنی اور نجات کی کشتی ہیں لیکن ان دو صفات و امتیازات کا درخشان تاج جیسا ”حسینؑ“ ابن علی

” کے سر پر سجا نظر آتا ہے ایسا کسی اور کے سر پر نہیں۔ اس لئے کہ یہ حسینؑ ابن علیؑ کی ذات ہے جس

نے اپنے وقت کے طاغوت اور ظالم و جاہل حکمران سے ایسے حالات میں نگرانی کی جب سب

زبانیں خاموش ہر طرف سناٹے کا عالم امت شعور اور اپنے احساسِ ذمہ داری سے عاری تھی

اور تو اور اس دور کی جید و ممتاز سیاسی، علمی و فقہی شخصیات ابن عباس جیسے حبر العلماء، ابو بکر خضومی

عبداللہ بن عمر، حنف بن قیس جیسے باخبر اور ہوشمند لوگ بھی حسینؑ کو قعود و سکوت کا مشورہ دے رہے

تھے اور اس وقت کے ضمیر فروشوں، دین فروشوں، منافعت پرستوں اور ہد جاہلیت سے بدتر جہلاء

کے خلاف قیام کرنے سے حسینؑ ابن علیؑ کو باز رکھنے کی کوشش کر رہے اور پیش آنے والے سنگین خطرات سے ڈرا رہے تھے۔

لیکن جو خوف لاحق تھا وہ پورا ہو کر رہا، لوگوں نے اس چراغِ ہدایت سے روشنی اور ہدایت نہیں لی اور اس کشتی نجات میں سوار ہونے کی بجائے جہالت، امریت، قتل و غارت گری، گمراہی اور ضلالت کے سمندر میں ڈوب گئے۔

اس چراغِ ہدایت کو بجھا دینے اور اس کشتی نجات سے کنارہ کشی کے نتیجے میں اپنے

وقت کا بدترین حاکم آخر کار امت پر مسلط ہو گیا اور اس وقت سے لے کر آج تک بد سے

بدتر اور ظالم سے ظالم تر حکمران امت پر مسلط ہوتے چلے آ رہے ہیں۔ یہ حکمران ایک وقت تک

تو اسلام ہی کے نام پر اور اسلام ہی کا لبادہ اوڑھ کر خلیفہ مسلمین کے نام سے امتِ اسلامی پر حکمرانی

اور اسلام کی ریشہ کنی کرتے رہے لیکن پھر بھی غنیمت تھا کہ یہ لوگ اپنے اقتدار کی بقاء و دوام کی

خاطر ہی سہی کم از کم اسلام اور مسلمانوں کے نام کو دنیا کے کفر پر غالب رکھنے کی کوشش کرتے رہے

لیکن بعد کے دور کے آنے والے حکمران تو ان سے بھی کہیں زیادہ بدتر ثابت ہوئے، انہوں نے

تو علانیہ اور بر ملا اسلام کو بھی خیر باد کہنا شروع کر دیا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ ان کے ضمیر اور قوم

فروشوں نے وطنِ اسلامی سے خیانت کرتے ہوئے اسلام و مسلمین کے مفادات کو بھی

داؤ پر لگا دیا اور مغربی استعماری قوتوں کا مسلمانوں پر تسلط قائم کر دیا۔ اب تو وہ کھل کر کہنے لگے ہیں:

”دین انفرادی زندگی کا ایک حصہ ہے اور اسلام میں حکومت یا حکمرانی کا کوئی خاص

تصور نہیں ہے“

اسلام، مسلمانوں اور وطنِ اسلامی سے حکمرانوں کی دوری ہر روز بڑھتی جا رہی ہے

مغربی ثقافت کا اسلامی ثقافت پر غلبہ روز بہ روز بڑھ رہا ہے اور امت اس حقیقت کو خوب سمجھ رہی

ہے کہ ہم تیزی کے ساتھ زوال و سقوط کی طرف جا رہے ہیں۔

آج بھی امتِ اسلامی پیغمبرؐ کے روشن کئے ہوئے اس چراغ سے آنکھیں بند کئے ہوئے اور اس کشتی نجات سے کنارہ کشی کئے ہوئے تاریکی اور گمراہی کی موجوں میں ڈوبی ہوئی ہے۔

عقل و شعور رکھنے والوں اور اہل فکر و نظر کے لئے لمحہ فکریہ ہے دانش اور دانشمندی کا تقاضہ ہے کہ پیغمبرؐ کی اس حدیث پر تحدید نظر کریں اور دیکھیں کہ:

آیا پیغمبرؐ کی اس حدیث کی سند میں ستم ہے؟ یا راہِ حسینی اپنانا ہمارے مفادات سے متصادم ہے۔ یا ہم اس حدیث کے مصداق حسین بن علیؑ کی راہ سے بالکل منحرف ہو چکے ہیں۔

حدیث کی سند میں تو کوئی ستم نظر نہیں آتا، یقیناً یہ ہماری ہی کورباطنی ہے کہ جس طرح کل حسینؑ کے دور میں امتِ پیغمبرؐ کی اس حدیث سے روگردانی کر کے ظلمت اور تاریکیوں کے سمندر میں ڈوب گئی، اسی طرح آج ہم بھی پیغمبرؐ کی اس حدیث کے مصداق حسین بن علیؑ کی راہ سے ہٹ گئے ہیں، جس کے نتیجے میں ظالم حکمرانوں کے شکنجوں میں تملارہے ہیں۔ ہماری مصیبت ہمارے اگلوں سے کہیں زیادہ ہے۔

اس دور کے لوگ یزید کو ایک منحرف اور ظالم حکمران سمجھتے تھے، اس کی حکومت کو قرآن و سنت سے متصادم دیکھ رہے تھے، وہ لوگ حسینؑ کو اس منصب و مقام کے لئے لائق اور سزاوار سمجھتے تھے لیکن یزید کی حکومت کو برطرف کر کے حسین بن علیؑ کو اس منصب پر فائز کرنے کیلئے جن قربانیوں کی ضرورت تھی اس کی اہمیت اور شدت کو وہ درک نہیں کر رہے تھے اور رد و اور کشاکش کا شکار تھے کہ آیا واقعاً یہ مسئلہ اتنی اہمیت کا حامل ہے کہ اس کیلئے اتنی قربانیاں دی جائیں؟ یا پھر وہ اس مسئلہ کو اور مسئلہ کی اہمیت کو درک کر رہے تھے لیکن اس کیلئے اپنے مفادات اپنا گھریا اور اپنے اہل و عیال کی جان کو داؤ پر لگا کر قربانی دینے کے لئے تیار نہیں تھے۔ بہر حال انہوں نے اس اہم مسئلہ پر اپنے مفادات کو مقدم رکھنے کو ترجیح دی جس کے نتیجے میں حسینؑ کو تنہا اس میدان میں

آنا پڑا اور اپنی اور اپنے قلیل انصار و اعموان کی قربانی دینی پڑی اور جو ہدف و مقصد حاصل کرنا چاہا تھا وہ حاصل نہ ہو سکا۔ جن لوگوں نے اپنے مفادات اور اپنی زندگی کو ترجیح دیتے ہوئے حسینؑ کا ساتھ نہ دیا انہوں نے اپنی زندگی میں چند روز کا اور اضافہ کر لیا لیکن اس چند روزہ زندگی میں نہ صرف یہ کہ وہ لوگ چین و سکون کی زندگی بسر نہ کر سکے بلکہ آنے والی نسلوں کے لئے ہمیشہ کے لئے غلامی کا طوق درشہ میں چھوڑ کر اپنی قبروں میں چلے گئے۔

آئیے! اب ذرا اپنے دور کے لوگوں کا جائزہ لیں۔ اُس دور کے لوگ کم از کم ایک تصور تو رکھتے تھے کہ ظالم حکمران کو ختم اور نابود ہونا چاہیے اور صالح حکمران کو اس منصب پر فائز ہونا چاہیے لیکن اپنے اس تصور کو وہ عملی جامہ پہنانے سے قاصر رہے تھے جب کہ آج کے دور کے مسلمان نے اس تصور کو بھی خیر باد کہہ دیا ہے۔ آج کے دور کا مسلمان اس تصور ہی سے عاری ہے کہ حکمران کو قرآن و سنت کی روشنی میں منتخب کیا جانا چاہیے اور اسلامی سربراہ مملکت کو اسلام سے آشنا اور اسلامی احکام پر پابند عمل ہونا چاہیے۔ آج کے دور کے مسلمان کے نزدیک اس شرط کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔ گویا جیسے یہ شرط ہی لغو ہے۔ اس لئے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ آج کا مسلمان قیام و انقلابِ حسینی کے اہداف و مقاصد کے بارے میں کل کے مسلمان کی نسبت زیادہ ناہیما اور نا آشنا ہے۔

چنانچہ پیغمبرؐ کی حدیث کہ ”حسینؑ چراغِ ہدایت اور کشتی نجات ہیں“ کا مفاد و مفہوم عملی میدان میں نہ اُس دور میں تطبیق ہوا اور نہ آج کے دور میں۔ خطیب اور ذاکر بارہا اس حدیث کی تلاوت کرتے ہیں اور اس حدیث کو امام حسینؑ کی عزاداری پر پاپا کرنے کی سند میں پیش کرتے ہیں، یہ حدیث سنتے سنتے ایامِ عزاء گزر جاتے ہیں لیکن ہمارے حالات بہتر ہونے کی بجائے بد سے بدتر ہوتے چلے جا رہے ہیں ترقی کی بجائے ہم زوال و سقوط کی طرف جا رہے ہیں، ہماری نظریں ”چراغِ ہدایت اور کشتی نجات“ حسینؑ کی بجائے اپنے جاہ و منصب، مقام و منزلت، مال

دولت اور اپنے مفادات کی طرف لگی ہوئی ہیں، ہم حسینؑ کشتی اور اسلام کی کشتی میں سوار ہونے کی بجائے اجنبیوں اور بے دینوں کی کشتی میں سوار ہو جاتے ہیں..... بالکل اسی طرح جیسے اس دور کے لوگ حسینؑ کے عقیدت مند اور حسینؑ کی حقانیت کا اعتراف کرنے کے باوجود اپنے مفادات کی خاطر ”کشتی اہل بیت“ میں سوار ہونے کی بجائے بنی امیہ کی ”کشتی“ میں سوار ہو گئے۔

پیغمبر ختمی مرتبتؐ کی اس حدیث کی سند کو تسلیم کرنے اور اس امر کا اعتراف کرنے کے بعد کہ اس حدیث کا مفاد و مفہوم ابھی تک تطبیق نہیں ہوا ہے، صاحبانِ عقل و شعور کے سامنے یہ سوال پیش آتا ہے کہ اس حدیث کے مفاد و مفہوم کو اپنے معاشرے میں تطبیق کرنے اور حسینؑ کو اپنی زندگی کے مسائل میں مشعلِ راہ بنانے اور ایک نئے عزم کے ساتھ ”حسینؑ کشتی“ میں سوار ہونے کے لئے کیا لائحہ عمل مرتب کرنے کی ضرورت ہے؟

اس سوال کا صحیح حل معلوم کرنے کیلئے حسینؑ قیام و انقلاب کی بنیادی ابجد کے مسائل کو روشن کرنا ضروری ہے اور یہ تجزیہ کرنا ضروری ہے کہ حسینؑ ابن علیؑ اپنی تحریک کے لئے کیا منطق پیش کرتے تھے اور یزید بن معاویہ اور اس کے حامی افراد اس منصب پر قابض رہنے کی کیا منطق پیش کرتے تھے۔ اس کے علاوہ حسینؑ منطق کو واضح اور روشن کرنے کے لئے آج ہمارے پاس کیا ذرائع اور وسائل میسر ہیں؟

قیام و انقلاب امام حسینؑ کی ابجد اور اس کے بنیادی نکات کا آغاز اس وقت کے خلیفہ مسلمین یزید بن معاویہ کے اس حکمنامہ سے ہوتا ہے جس میں اس نے والیٰ مدینہ ولید بن عقبہ کو حکم صادر کیا کہ تمام اہل مدینہ سے بالعموم اور حسینؑ ابن علیؑ سے بالخصوص مجھے بحیثیت خلیفہ مسلمین تسلیم کراؤ اور ان سے میری بیعت لو۔ یزید کا یہ مطالبہ اس دعویٰ پر مشتمل تھا:

”میں امتِ مسلمہ کا خلیفہ ہوں، جس طرح پیغمبرؐ کے بعد دوسرے خلفاء اس منصب پر فائز ہوئے آج میں اس منصب پر فائز ہوں، اسلام مجھ کو چلانا ہے، اسلامی سرحدوں کا محافظ

میں ہوں، حدود و تعزیرات کو جاری کرنے کا حق مجھے ہے، جمعہ و جماعت کی امامت و قیادت کا حقدار میں ہوں لہذا میں کسی کو بھی اپنی حکومت کی مخالفت اور اس کو ختم کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا اور نہ یہ اجازت دے سکتا ہوں کہ کوئی کسی کو میری حکومت کے خلاف ورغلائے اور اٹھائے، جو بھی میری حکومت کے خلاف بغاوت، میری اطاعت کے خلاف سر اٹھائے گا میں اس کو کینفر کر دار تک پہنچاؤں گا“۔

یزید کی اس منطق کے مقابلے میں حسینؑ نے فرمایا:

”یہ منصب..... منصب نبوت و رسالت ہے، کوئی بھی فاسق و فاجر، قتل و غارت پنا کرنے والا، شراب پینے والا، علانیہ جرائم کا ارتکاب کرنے والا، مالِ مسلمین کو اپنی اور اپنے خاندان کی جاگیر سمجھنے والا شخص اس منصب کا حقدار قرار نہیں پاسکتا، حکومت..... اسلام، قرآن اور سنت کی روشنی میں چلنا چاہیے، حکمران کو قرآن و سنت کی حدود میں رہنا پڑے گا، اگر کوئی حاکم اور سربراہ فسق و فجور کے ساتھ اس پر قابض ہو جائے تو اس کو ہٹانا ملت کے ہر فرد کے اہم ترین واجبات میں سے ہے“۔

یہ ہے قیام امام حسینؑ کی منطق کی ابجد اور اس کے بنیادی نکات۔ اس کی روشنی میں کیا آپ ان حقائق کو تسلیم نہیں کریں گے:

اس دور میں شراب نوشی کو یزید کے دور کے مقابلے میں کہیں زیادہ فروغ ملا ہے۔ حکومتی پرمٹ کے تحت شراب نوشی کیا اور اس دور کے مقابلے میں کہیں اور کئی گنا زیادہ نہیں؟

بے حجابی، عریانی، فحاشی، زنا اور شراب نوشی کو کیا آج کھلی چھٹی نہیں ملی ہوئی ہے؟

کیا آج مملکتِ اسلامی میں تعزیراتِ اسلامی اُس دور کے مقابلے میں کہیں اور کئی گنا زیادہ معطل نہیں ہیں؟

اس وقت صرف حکمرانوں کا انحراف حسینؑ کے لئے ناگوار اور قابل برداشت نہیں تھا، آج تو حکمرانوں کے انحراف کے علاوہ اسلام بھی تحریف کا شکار ہے۔ اس وقت حکمرانوں کے انحراف کو ناقابل برداشت دیکھ کر امام حسینؑ اور ان کے شیدائیوں نے کہا تھا:

”ان حالات میں زندگی سے موت بہتر ہے اس کی اصلاح کے لئے اپنی اور اپنی عزیزوں کی جانوں کی قربانی کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔“

لیکن..... آج کیا ملت نے اس مسئلہ کو طاقِ نسیان کی زینت نہیں بنا دیا ہے؟

آج اس مسئلہ کو کوئی اتنی بھی اہمیت دینے کے لئے تیار نہیں جتنی لوگ مستحبات اور مکروہات کو دیتے ہیں۔ رہبری و قیادت امت کی مسئلہ کا جنازہ نکل چکا ہے، لیکن حسینؑ چراغِ تلے زندگی بسر کرنے والے ہم حسینؑ عزاداروں کو یہ سب کچھ آخر کیوں نظر نہیں آ رہا ہے؟ جب تک اس مسئلہ کو عزادارانِ حسینؑ تمام تر اہمیت اور اہتمام کے ساتھ وسیع پیمانے پر نہیں اٹھائیں گے۔ پیغمبرؐ کی حدیث..... ”حسینؑ چراغِ ہدایت اور کشتی نجات ہیں“ کا مفاد و مفہوم تطبیق ہونا نظر نہیں آئے گا۔

اس مسئلہ کو کس طریقے سے اٹھایا جائے؟ اس کے لئے کن کن ذرائع کو اپنایا جائے؟ اس کا صحیح اور حقیقت پسندانہ طریقہ کیا ہے؟ ان سوالات کا جواب تحریر کرتے ہوئے ہاتھ تھرتاتا ہے اور دل لرزتا ہے۔ ہمیں مخالفوں اور سیاستدانوں سے اتنا ڈر نہیں جتنا خود اپنے مذہبی حلقوں اور ان حلقوں سے اٹھنے والی چیخ و پکار سے ہے۔ لیکن جو بھی ردِ عمل ہو اور جہاں سے بھی ہو ہم بہر حال اپنے دینی وظیفہ کو انجام دیتے ہوئے اس سلسلے میں چند تجاویز پیش کرنے کی جسارت کریں گے:

(۱) حوزہ ہائے علمیہ اور دینی مدارس سے فنِ خطابت اور تقریر سے لاتعلقی دوری اور اجنبیت کو ختم کیا جائے، طلبِ دینی میں امتِ اسلامی کو درپیش ضروری مسائل کو دور کرنے کی

صلاحیت اور ان میں اتنی قدرتِ بیان پیدا کی جائے کہ وہ وضاحت کے ساتھ ملت کو ان مسائل سے آگاہ اور روشناس کرائیں۔ اس فرسودہ سو کو کہ ”تقریر و خطابت انسان کو علمی صلاحیتوں اور بنیادی افکار سے دور کر دیتی ہے“ اب ختم ہونا چاہیے۔ یہ نظریہ کہ ”تقریر و خطابت نادانوں اور جاہلوں کا پیشہ ہے“ صحیح نہیں ہے نیز انبیاءؑ اور ائمہ اطہارؑ کی سیرت و کردار سے متصادم ہے.....

کیا کتب عقائد میں ”نبیؑ نبوت و امامت“ کے باب میں یہ نہیں لکھا کہ ”انبیاءؑ اور ائمہؑ کو فصیح اللسان اور ابلغ البیان ہونا چاہیے“

کیا یہ ذواتِ مقدسہ اپنے دور کے مبلغ اور خطیب نہیں تھے؟

کیا نوابِ زمان اور مفکرینِ عالم کے بارے میں تاریخ میں یہ نہیں لکھا کہ یہ سب فصیح اللسان اور ابلغ البیان تھے؟

لہذا۔ مقررین اور خطیبوں کو حقارت کی نظر سے دیکھنا آیاتِ روایات اور تاریخ سے نا آشنائی کی دلیل ہے۔ علم و فکر کو اگر معاشرے اور امت میں نہ پہنچایا جائے اور مدرسہ کے بند کمروں اور لوگوں کے سینوں تک محدود رکھا جائے تو یہ علم و فکر اس خزانہ اور ذخیرہ کی مانند ہے جو زمینوں میں دفن ہے اور زمین پر رہنے والے بھوک اور فقر میں مبتلا ہیں۔ حوزہ ہائے علمیہ اور دینی مدارس کے فارغ التحصیل افراد اصول فقہ اور فلسفہ کے کتنے ہی باریک دقائق اپنے سینوں میں رکھتے ہوں لیکن اگر وہ قدرتِ بیان نہ رکھتے ہوں تو وہ ایک ایسے گونگے انسان کے مانند ہیں جو قوتِ گویائی نہیں رکھتا۔

ہمارے ملک میں مومنین کے دین سے لگاؤ ہونے کے باوجود اسلامی معارف سے نا آشنائی کی سب سے بڑی وجہ ہی ہمارے علماء و فضلاء کی فنِ خطابت اور تقریر سے لاتعلقی ہے۔ اس کا سب سے بڑا نقصان ملتِ تشیع کو پہنچا ہے۔ عزا داری امام حسینؑ - میں مدارسِ دینی

اور طلبہ مدارس کی لاطلفی اور اجنبیت کے نتیجے میں ناخواندہ اور کم مایہ افراد حسینی منبر پر قابض ہو گئے اور ملت کو قیام حسین کے اہداف و مقاصد سے دور اور بے بہرہ رکھنے میں جو کردار انہوں نے ادا کیا وہ اظہر من الشمس ہے۔

لہذا ہم تمام علماء بزرگان اور اساتذہ مدارس سے التماس کرتے ہیں کہ وہ خطابت و بلاغت سے کہ جو ورثہ انبیاء و ائمہ ہے دوری اور اجنبیت اختیار نہ کریں اور اپنے مدارس میں فین خطابت و بلاغت کے لئے مقام منصب اور نصاب وضع کریں تاکہ مدرسہ کے طلبہ میں قوت بیانی پیدا ہو اور وہ قیام و انقلاب حسینی کے اہداف و مقاصد سے امت کو کما حقہ آشنا کرائیں۔

اس ضرورت کے پیش نظر ہم محترم حضرات سے بھی التماس کرتے ہیں کہ وہ آگے آئیں جہاں انہوں نے اس سے پہلے سینکڑوں دینی مدارس، مساجد اور بارگاہوں کی تعمیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، عزاداری امام حسین کے فروغ کی خاطر بھی ایسے مخصوص مدرسوں کی بنیاد ڈالی یا اپنے سے منسوب مدارس میں فین خطابت و تقریر کو نصاب میں شامل کرنے کے لئے اصحاب مدارس سے درخواست کریں کہ وہ ان مدارس میں امام حسین کے خطبات، کلمات، تاریخ و سیرت اور کتب مقال کے بارے میں درس و تدریس اور مخاطب و بیان کا سلسلہ شروع کریں۔

(۲) گزشتہ چودہ سو سال کے عرصے سے لے کر اب تک قیام و انقلاب امام حسین سے متعلق تاریخ، مقال اور کتب سیرت میں بہت کچھ تحریف ہوئی ہے بے شمار لغو داستانیں، قصہ کہانیاں، لوگوں کے بے سرو پا خوابوں کو کربلا کی داستان بنا کر حسینی انقلاب کے خدوخال کو مخ کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اسلام اور حسین کے دشمنوں نے اپنی تحریفات کے ذریعہ امام کے قیام و انقلاب کی سمت اور جہت کو کھرف کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ آج ضرورت اس امر کی ہے کہ تحقیق، تنقید اور ریسرچ کے ادارے قائم کئے جائیں اور ان تمام تحریفات کی تطہیر (Screening) کی جائے۔

(۳) آج کا دور مشینی دور ہے ہر شخص غم روزگار میں مبتلا اور مصروف ہے۔ اگرچہ لوگ دین شناسی اور دین سے آگاہی کا ذوق رکھتے ہیں لیکن کسی کے پاس ضخیم کتابوں کے پڑھنے کا وقت اور فرصت نہیں۔ معاشرے کا پڑھا لکھا طبقہ خصوصاً وکلاء، ڈاکٹر، انجینئر حضرات کو اپنے پیشے سے متعلق کتب، فنی اور مطالعہ کے بعد اتنا وقت نہیں ملتا کہ وہ دین شناسی اور حسین شناسی سے متعلق بڑی بڑی کتابیں پڑھنے کا وقت نکالیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ قیام حسینی اور عزاداری سے متعلق تحقیقی مقالہ جات، استفسار اور جوابات پر مشتمل باوقار مجلات کی اشاعت کی جائے تاکہ علمی بنیادوں پر نئی تحقیقات اور تجاویز کو عام کیا جائے۔

اس سلسلے میں علماء اور درویند وانشوران قوم کو چاہیے کہ وہ اپنی دینی مسئولیت کو پورا کریں اور اس خلاء کو پُر کر کے حسین کی عظیم قربانی کا صلہ اور اجر رسالت ادا کریں۔

(۴) ہمارے ملک میں امام حسین کے کلمات اور خطبات پر مشتمل اور قیام و انقلاب حسینی سے مربوط کتب اردو زبان میں موجود نہیں اگر ہوں بھی تو نہ ہونے کے برابر اس لئے کہ وہ بازار میں نظر نہیں آتیں۔ اس لئے قوم کے کچھ باصلاحیت افراد ایسی کتب کی دستیابی ان کی ترتیب و تنظیم اور اردو زبان میں ان کے ترجمہ اور طباعت کی ذمہ داری کا بیڑہ اٹھائیں اور حسین کے سامنے سرخراوا و عند اللہ ماجور ہوں۔

(۵) ہمارے ملک میں مطالعہ کتب کا ذوق افسوسناک حد تک کم ہے۔ اس لئے نوجوانوں کو اس کی تشویق اور ترغیب دلائی جائے اور اس کے لئے ملک میں جس طرح ذہنی آزمائش کے لئے سیاسی، معاشرتی، فقہی، عقیدتی مسائل پر سوال و جواب کے امتحانات کا طریقہ رائج ہے اسی طرح قیام حسین اور عزاداری امام سے مربوط سوالات و جوابات کے ذہنی آزمائش کے پروگرام ملک کی گوشہ و کنار میں رائج کئے جائیں اور اس پر انعامات بھی رکھے جائیں تاکہ نوجوانوں میں ذوق و شوق پیدا ہو۔

(۶) قیام و انقلاب امام میں بے شمار سبق موجود ہیں مثلاً:

- ظالم و جابر حکمران اپنی حکومت اور اپنے اقتدار کی بقاء اور دوام کے لئے ظلم و بربریت اور جرم و جنایت کے کیسے کیسے مکروہ اور گھناؤنے طریقے اپناتے ہیں اور پستی کی کن گہرائیوں میں غرق ہو جاتے ہیں۔ یا مثلاً:

- دنیاوی مقام و منصب کے لالچ میں عمر سعد جیسے پست فطرت لوگ حکمرانوں کی کاسہ لیسے اور خوشامد میں کیسے کیسے بھیانک جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں اور حق و حقیقت کا درک رکھنے کے باوجود دنیا و آخرت دونوں کی رسوائی مول لے لیتے ہیں۔

چنانچہ ضرورت ہے کہ ان واقعات کو تحریروں اور تقریروں میں مقام حیرت اور درس عبرت کے طور پر وضاحت اور تفصیل کے ساتھ اجاگر کیا جائے تاکہ عزاداران حسینؑ خطیبوں اور ذاکروں کو داد بخن دینے کی بجائے اپنی ”خود سازی“ کریں۔

اس کے علاوہ عزاداران حسینؑ کو اس حقیقت سے روشناس کرایا جائے کہ امام حسینؑ کی راہ اپنے کیلئے صرف امام کی معرفت اور امام کی حقانیت کا ادراک ہی کافی نہیں ہے بلکہ خود میں حرارت ایمانی، جذبہ ابراہیمی اور جراتِ زندانہ پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ ایک ایسی ”حرارت“ ایک ایسی ”زدانہ جرات“ جو حق و حقانیت کی معرفت کے بعد حق کی خاطر جب ”آتشِ نمرود“ میں کودنے کا وقت آئے تو اس امتحان میں نہ آل و اولاد کی محبت آڑے میں آنے پائے نہ گھریا رچھن جانے کا ڈر۔ ورنہ کربلا کی خونی داستان میں بہت سے ایسے لوگ نظر آئیں گے جو حسینؑ کی کما حقہ معرفت رکھنے کے باوجود اہل و عیال کی جدائی کے ڈر اور گھریا رچھن جانے کے خوف سے امام کی نصرت سے کنارہ کش رہے، بعض نے یزید کے لشکر میں بھی شمولیت اختیار کی اور بعض نے راہ فرار اختیار کی۔

(۷) اس وقت اس ملک میں عزاداری امام حسینؑ - شیعہ قوم کے لئے ایک مسئلہ بنی

ہوئی ہے اور یہ مسائل ایک ایسے ملک میں پیش آرہے ہیں جہاں نوے فیصد مسلمان رہتے ہیں۔ یہ مسئلہ نہایت غور طلب اور فکر انگیز ہے۔ علماء دانشور شیعہ، سنی غرض معاشرے کا ہر طبقہ خصوصاً شیعہ حضرات اور عزاداران امام بیٹھ کر ٹھنڈے دل سے سوچیں اور فیصلہ کریں:

کیا ہمارے دیگر مسلمان بھائیوں کو حسینؑ پسند نہیں ہیں یا ہماری عزاداری کے طور طریقے نا پسندیدہ ہیں؟

ان کو اگر حسینؑ پسند نہیں تو پھر ہمیں چاہیے کہ صدرا سلام سے دور حاضر تک خلفاء اصحاب، تابعین اصحاب، علماء اکابرین، بزرگ دانشور اور مفکرین کی وہ آراء اور نظریات جو انہوں نے فضائل حسینؑ کے سلسلے میں بیان فرمائے ہیں انہیں جمع کر کے سامنے لائیں اور نشر و اشاعت کے ذریعے ان تک پہنچائیں۔

اور اگر ہماری عزاداری کے طور طریقے یا بعض رسومات ان کو نا پسند ہیں یا جن سے ان کی دل آزاری ہوتی ہے تو وحدت امت کی خاطر اور استعمار اور دشمنان اسلام کے مسلمانوں کے درمیان اختلاف و امتنا رچھیلانے کے مذموم عزائم کا کام بنانے کی خاطر بحث و گفتگو کرنا چاہیے اور ان چیزوں کو جن کو ہم نے صرف اپنی انا کی خاطر قومی وقار بنا لیا ہے اور جن کے چھوڑنے سے روح عزاداری متاثر نہیں ہوتی ہے ان سے دستبردار ہونا چاہیے۔

(۸) امام حسینؑ - کے شیعہ اور عقیدہ مند ہر سال ایام عزائم میں کسی نہ کسی بہانے اور کسی نہ کسی انداز سے حسینؑ کے نام پر خرچ کرنا اپنے لئے باعثِ اجر و ثواب اور اپنے قلب کے لئے باعثِ اطمینان و سکون محسوس کرتے ہیں۔ ان خرچ کی جانے والی رقم میں یقیناً بعض اخراجات نہایت موزوں اور مناسب ہوتے ہیں اور عقل و شرع بھی ایک حد کے اندر ان اخراجات کو مستحسن قرار دیتی ہے۔ مثلاً بزم عزائم میں موجود عزاداروں کے لئے غذا اور کھانے کا اہتمام کرنا یا ان میں کھانے پینے کی چیزیں تقسیم کرنا یقیناً نیک اور مستحسن عمل ہے۔ لیکن بعض اخراجات ایسے ہوتے

ہیں جن سے نہ کسی مومن کو کوئی فائدہ پہنچتا ہے نہ یہ اخراجات کوئی فکری یا مادی سرمایہ چھوڑتے ہیں اور معاون ثابت ہوتے ہیں نہ ان اخراجات کے ذریعہ کوئی مسئلہ حل ہوتا ہے اور نہ ہی ان اخراجات کے ذریعہ عظمتِ حسین اور عظمتِ اسلام کا کوئی مظاہرہ ہوتا ہے۔

حسین کے نام پر خرچ کیا جانے والا سرمایہ معقولیت پر مبنی ہونا چاہیے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ حسین کے نام پر خرچ کیا جانے والا سرمایہ خود حضرت ابی عبد اللہ الحسین کے قیام و انقلاب کے مقدس مقصد پر اور ان اہداف کی نشر و اشاعت پر خرچ ہو۔ مثلاً سیرت و حیاتِ امام حسین سے مربوط کتابوں کی تصنیف و تالیف اور ان کتابوں کو لٹو رتیر کر تقسیم کرنے پر رقم خرچ کی جائے۔ ایسی کتابوں کو کم قیمت پر فراہم کرنے کی کوشش کی جائے تاکہ عزا داری اور اہدافِ قیام امام حسین کو فروغ حاصل ہو۔ امام حسین کے نام پر ایسا با مقصد اور با ہدف انفاق انشاء اللہ اجر و ثواب کا موجب اور امام حسین کے نزدیک مورد پسند ہوگا۔

ان تمام تجاویز کو پیش کرنے سے ہمارا مقصد ہرگز ہرگز معاشرے میں موجود معقول رسوم عزا داری پر تنقید کرنا نہیں ہے بلکہ ان کو با ہدف اور با مقصد بنانا مطلوب ہے۔ کیونکہ عزا داری امام حسین میں وقتی عواطف احساسات اور جذبات پر مشتمل بے مقصد رسومات دیرپا اور دور رس اثرات کی حامل نہیں ہوتیں۔ شاید ہماری عزا داری اس لئے غیر موثر اور دوسروں کے لئے ناپسندیدہ ہوتی جا رہی ہے کہ اس میں عقل و منطق کا دخل کم رہ گیا ہے ورنہ جو عقل و منطق اور دلیل و دہان پر مبنی ہو اس سے کوئی بھی صاحب عقل اور ذی فہم اجنبیت محسوس نہیں کرتا۔

اس لئے نام حسین اور قیام حسین کی اصل روح کو زندہ و تابندہ رکھنے کے لئے ان طور و طریق اور رسومات کو اپنانا چاہیے جو زندگی ساز اور کردار ساز ہوں اور ہماری عزا داری اس حقیقت کی آئینہ ہو کہ ہم نے اپنی عملی زندگی میں پیغمبرؐ کی اس حدیث کو رچا بسالیا ہے کہ حسین حقیقت میں ہمارے لئے چراغِ ہدایت اور کشتی نجات ہیں۔

آخر میں ہم اپنے ذہن میں موجود خیالات کو صفحہ قرطاس پر منتقل کرنے اور ان کی تنظیم و ترتیب ترتیب و تہذیب کے سلسلے میں بردار محترم سید امیر حسین رضوی کی گرانقدر مساعی پر ان کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں اور دعا گو ہیں کہ خدا ہمیں اس چراغِ ہدایت کی روشنی میں حقائق کے ادراک اور اس کشتی نجات کے ذریعے ساحلِ نجات تک پہنچنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اگر یہ ناچیز کاوش بارگاہِ احدیت میں شرفِ قبولیت سے ہمکنار ہو تو میں اسے اپنے والدین عزیز و اقارب علماء و شہداء اور تمام مومنین و مومنات کی ارواح کے ایصالِ ثواب کے لئے ہدیہ کرتا ہوں۔

والسلام

علی شرف الدین موسوی

۷/ ذی قعدہ ۱۴۱۷ھ

کراچی

تمہید:

دنیا بھر میں ہر قیام و انقلاب کے لئے موسس اور بانی انقلاب اپنی بصیرت فراست اور تدبیر سے اپنے انقلاب کے آغاز کے لئے کسی خاص زمان و مکان کا انتخاب کرتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ جہاں بھی افراد جمع ہو جائیں اور آواز لگائیں وہیں سے قائد انقلاب اپنی تحریک کا آغاز کر دے۔ انقلاب کے لئے ہر وقت اور ہر زمین سازگار نہیں ہوتی۔

جہاں تک زمان و مکان کا تعلق ہے تو انقلاب کے لئے اس کا انتخاب اتنا ہی نہیں ہوتا۔ اپنی ہفت اور انقلاب کے لئے بانیان انقلاب سختیاں جھیلتے ہیں، مصیبتیں برداشت کرتے ہیں اور مناسب زمان و مکان کی تشخیص اور تعین کے لئے انتظار کرتے ہیں۔

البتہ کبھی بیرونی حالات کی دگرگونی کے سبب انقلاب کا پروگرام فاش ہو جاتا ہے

اور ہنگامی اعلان کرنا پڑ جاتا ہے۔ مثلاً زید بن علی نے اپنے انقلاب کے لئے ایک وقت معین کر رکھا تھا لیکن اسرافاش ہونے کے سبب انہیں ہنگامی طور پر اپنے انقلاب کا اعلان کرنا پڑا۔ اسی طرح مسلم بن عقیل اپنے انقلاب کے آغاز کے لئے امام حسینؑ کی آمد کے منتظر تھے کیوں کہ انقلاب کے لئے وہی وقت معین تھا لیکن عبید اللہ بن زیاد کی کوفہ آمد اور ہانی بن عروہ کی گرفتاری کے سبب قبل از وقت ہنگامی طور پر انقلاب کا اعلان کرنا پڑا۔ یا مثلاً پیغمبر اسلامؐ جب تک سرزمین مکہ میں تھے آپؐ نے مکہ کو اپنے لئے سازگار نہ پایا اس لئے ہمیشہ ایک ایسی جگہ کی تلاش میں رہے جہاں سے اپنی دعوت کا آغاز کریں۔ اسی طرح امام حسینؑ کا قیام بھی اس اصول سے خارج نہیں تھا بلکہ کسی مناسب زمان و مکان کے انتخاب کا محتاج اور نیا زمند تھا۔ جہاں تک انتخاب زمانی کا تعلق ہے اس موضوع کو ہم یہاں زیر بحث نہیں لاتے اور کسی اور وقت کے لئے چھوڑتے ہیں البتہ یہاں ہم انتخاب مکانی کے بارے میں بحث کریں گے۔

امام حسینؑ - کے جغرافیائی قیام سے ہماری مراد وہ اماکن اور وہ مقامات ہیں جن کا ذکر قیام امام حسینؑ کے سلسلے میں آتا ہے، قطع نظر اس سے کہ امامؑ اس جگہ ٹھہرے یا صرف اس جگہ سے گزرے یا آپؑ کے دوران قیام و ہفت میں کسی اور عنوان سے اس جگہ کا ذکر ہوتا ہے۔ ہم ان مقامات وہاں پیش آنے والے واقعات اور ان جگہوں کے بارے میں تفصیل سے بیان کریں گے اس دوران ہم اس قیام و ہفت میں پیش آنے والی ترتیب کو مد نظر رکھنے کی کوشش کریں گے۔

مدینہ

سب سے پہلی جگہ جہاں سے اس تحریک کا آغاز ہوا وہ مدینہ ہے۔ مدینہ شہر کا نام ہے اور خود ”مدینہ“ کے معنی شہر کے ہیں یعنی وہ کسی خاص شہر کا نام نہیں بلکہ وہ کسی شہر کی طرف منسوب ہوتا ہے جیسے:

مدینۃ اصفہان یعنی اصفہان کا شہر۔

مدینۃ کراچی یعنی کراچی کا شہر۔

یا مدینۃ الاسلام یعنی اسلام کا شہر وغیرہ۔

مدینہ کا اصل نام یثرب ہے۔ اسی سے اسے ”یثربی“ بھی کہتے ہیں اور ”اثرابی“ بھی۔ یثرب کے لغوی معنی تغیر تو بیخ اور فساد کے ہیں، مثلاً آیت میں کہتے ہیں:

﴿لَا تَشْرِبْ عَلَیْکُمْ﴾ (یوسف ۹۲) ”یعنی تمہارے لئے کوئی حرج نہیں..... کوئی ملامت نہیں“

اس جگہ کا نام یثرب ہونے کی وجہ یہ ہے کہ سب سے پہلے اس مقام کو سکونت کے لئے انتخاب کرنے والا شخص ”یثرب“ تھا لیکن یثرب کون تھا اس کے بارے میں مورخین کے درمیان اختلاف ہے۔ اصل واقعہ اس طرح ہے کہ جب حضرت نوحؑ کی کشتی کوہ جووی پر رک گئی تو وہاں کشتی سے اتر کر اسی (۸۰) آدمی نکل کر شہر بابل میں داخل ہوئے۔ اس وجہ سے اس کا نام ”ثمانین“ رکھا گیا۔ کچھ عرصہ بعد نمرود بن کنعان بن سام بن نوح اس شہر پر مسلط ہو گیا۔ اس کے ظلم و تشدد سے کچھ لوگ فرار ہو گئے۔ ان میں سے دو افراد کے نام یثرب تھے۔ ایک نام یثرب بن قانیہ بن مھلائیل بن ارم بن عمیل اور دوسرا یثرب بن عمیل بن عوض بن ارم تھا۔ بہر حال ان دونوں میں سے جس کسی نے یہاں پہلے سکونت اختیار کی اس کے نام کی مناسبت سے اس کا نام یثرب پڑ گیا۔

پیغمبر اسلامؐ کے مدینہ آنے کے بعد تک اس شہر کا نام یثرب تھا۔ پیغمبر اسلامؐ نے اس کا نام بدل کر طیبہ (طیبہ و طابہ) رکھا۔ چنانچہ ابن عباس کا کہنا تھا کہ اس کے بعد اگر کوئی شخص اس شہر کو یثرب کہے تو تین بار استغفار کرنا پڑے گا۔ بعد میں عام لوگ طیبہ کی بجائے مدینۃ الرسولؐ کہنے لگے۔ رفتہ رفتہ لفظ رسولؐ کو حذف کر کے الف لام عہد و پٹی لگا کر المدینہ کہنے لگے۔ کچھ

عرصہ گزرنے کے بعد الف لام بھی حذف ہو گیا اور اسے صرف مدینہ کہا جانے لگا۔ عام طور پر جب صرف مدینہ کہا جاتا ہے تو اس سے صرف یہی شہر مراد ہوتا ہے۔

اس شہر کو پیغمبر اسلامؐ کی میزبانی اور اسلام کے پھلنے پھولنے کی جگہ ہونے کی وجہ سے یا اسلام کی پہلی مسجد مسجد نبوی ہونے کے سبب اس شہر کے مختلف نام وضع ہوئے لیکن سب سے معروف نام مدینہ ہی ہے۔ اس شہر کی فضیلت اور اس شہر کے بابرکت ہونے کے سلسلے میں پیغمبر اسلامؐ سے مروی بہت سی روایات ہیں۔ پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا:

”جو شخص اس مدینہ کی گرمی برداشت کرتے ہوئے یہاں قیام کرے گا قیامت کے دن ہم اس کے شفیع ہوں گے“

پیغمبر اسلامؐ جب مکہ چھوڑ رہے تھے تو آپؐ نے خدا کی باگاہ میں دعا کی:

”خداوند! تو نے مجھے اپنی بہترین زمین سے نکالا ہے تو اب مجھے اپنی بہترین جگہ عنایت فرما“

جب آپؐ مدینہ پہنچے تو آپؐ نے دعا کی:

”خداوند! اس زمین کو ہمارے لئے جائے قرار دے اور یہاں وسعتِ ارزاق عطا فرما“ پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا:

”کوشش کرو کہ موت تمہیں مدینہ میں نصیب ہو۔ جو شخص مدینہ میں مرے میں اس کا شاہد و شفیع ہوں گا“

غرض اس شہر کے بہت سے نام ہیں جن میں مدینہ طیبہ معروف ہے۔

یہ شہر اسلام اور مسلمین کا مور و عنایت اور مرکز توجہ تھا کیوں کہ اسی شہر سے اسلام کو فروغ ملا اور یہیں سے اسلام کو شہرت بھی ملی۔ اطراف و جوانب سے آنے والے مسلمانوں کو پناہ بھی اسی شہر میں ملی۔ اسلام کے طفیل و برکت سے یہ شہر فرشتگانِ الہی کی قدم گاہ بنا۔ اس شہر میں رسول اللہؐ

کا روضہ مطہر ہے۔

یہ شہر اہل بیت اطہارؑ کی خصوصی توجہ کا مرکز رہا۔ امام حسینؑ کی خصوصی عنایات و توجہ بھی اسی شہر کو حاصل تھی۔ کیونکہ یہاں رسول اللہؐ کا روضہ ہے، فاطمہ زہراؑ کی قبر ہے، امام حسنؑ اور اہل بیت اطہارؑ کی قبور مطہرہ اسی شہر مدینہ میں ہیں۔

امام حسینؑ اور دیگر اہل بیت اطہارؑ کو سختی زیادہ محبت اور لگاؤ اس شہر مدینہ سے ہے اتنی ہی نفرت و عناد بنی امیہ کو اس شہر سے رہی۔ معاویہ اور یزید کو اس شہر سے نفرت تھی۔ یزید کی اس شہر سے نفرت کی چند وجوہات اور اسباب ہیں:

(۱) پہلی وجہ یہ تھی کہ مشرکین کے دشمنوں اور ان کے نزدیک ناپسندیدہ افراد کو اس شہر والوں نے پناہ دی۔

(۲) پیغمبر اسلامؐ اور مشرکین کے درمیان ہونے والی جنگوں میں اس شہر کے رہنے والوں نے ہمیشہ رسول اسلامؐ کا ساتھ دیا یہاں تک کہ مسلسل اور پیہم ناکامیوں کے نتیجے میں کفار و مشرکین کو حضرت محمد ﷺ کے سامنے سر تسلیم خم کرنا پڑا۔

(۳) حضرت علیؑ اور معاویہ کے درمیان جنگ میں انصار مدینہ نے حضرت علیؑ کا ساتھ دیا۔ اور ایک دو افراد کے علاوہ اہل مدینہ میں سے کسی نے معاویہ کا ساتھ نہیں دیا۔ معاویہ کے مقابلہ میں حضرت علیؑ کو یہ امتیاز حاصل تھا کہ اس کے مقابلہ میں انصار مدینہ نے ہمیشہ علیؑ کا ساتھ دیا۔

(۴) پیغمبر اسلامؐ کے زیادہ تر اصحاب اسی شہر مدینہ میں رہتے تھے اور وہ خود کو یزید کے مقابلہ میں خلافت کا زیادہ حقدار سمجھتے تھے۔

خلافت کے لئے اگر کسی شوریٰ کا قیام عمل میں آتا اور اہلیت اور صلاحیت کی بنا پر خلیفہ کا انتخاب ہوتا تو یزید کے مقابلہ میں اس شہر میں بسنے والے اصحاب خلافت کے زیادہ اہل

اور سزاوار قرار پاتے۔ اس لحاظ سے یہ شہر یزید کے حریفوں اور رقیبوں کا شہر تھا۔

(۵) مکہ سے ہجرت کے بعد مدینہ بنی ہاشم کا مرکز بنا اور شام بنی امیہ کا۔ چنانچہ یزید اس شہر کو اس لئے ناپسند کرتا تھا کہ یہ بنی ہاشم کا مرکز ہے اور خصوصاً اس لئے کہ بنی ہاشم کے آقا و سردار امام حسینؑ یہاں قیام پذیر تھے۔

(۶) رسول اللہؐ کے خلاف بنی امیہ کے دلوں میں جو بغض و عناد بھرا ہوا تھا وہ کسی طور کم نہیں ہوا تھا بلکہ وہ کدورت بدرجہ اتم ان کے دلوں میں موجود تھی اور اس کی وجہ سے وہاں روضہ رسولؐ کا ہونا بھی ہے جس کا اظہار معاویہ نے کئی مرتبہ کیا۔

غرض بنی امیہ کے لوگ اس شہر کو پسند نہیں کرتے تھے اور نہ صرف پسند نہیں کرتے تھے بلکہ اس شہر سے نفرت، کینہ اور بغض رکھتے تھے۔ اس بغض و کینہ کا واضح ثبوت یہ ہے کہ معاویہ نے مردان بن الحکم اور عمر بن سعید اشدق جیسے بدترین دشمن رسولؐ کو یکے بعد دیگر اس شہر پر گورز کی حیثیت سے مسلط رکھا اور اس طرح اہل مدینہ سے انتقام لیا۔ اس کے علاوہ اپنی خلافت کے استحکام کے لئے یزید نے اسی شہر مدینہ سے دہشت گردی اور قتل و غارتگری کا آغاز کیا۔

### حسینؑ اور مدینہ

امام حسینؑ - ۳ شعبان المعظم ۳ھ کو نبوت و امامت کے گھرانے میں آنکھ کھولی۔ اس مولود سعید کے مراسم ولادت پیغمبر گرامیؐ نے خود بہ نفس نفیس انجام دیئے۔ اہل مدینہ نے پیغمبر اسلامؐ کی زبان اطہر سے یہ الفاظ سنے:

”یہ حسینؑ میری روح، میرا قلب اور میری آنکھوں کا تارا ہے، یہ مجھ سے ہے، میں اس سے ہوں، یہ بیٹھیں تو امام ہیں، کھڑے ہوں تو امام ہیں، یہ جنت کے جوانوں کے سردار اور آقا و مولا ہیں.....“

اہل مدینہ نے بارہا حسینؑ کو رسولؐ کی گود میں رسولؐ کی پشت پر اور رسولؐ کے دوش

مبارک پر دیکھا، یہ حسینؑ خامس اصحاب کسا ہیں، یہ نہ صرف زہرا = اور پیغمبر ختمی مرتبتؐ کے دل و جان ہیں بلکہ یہ اہل مدینہ کے بھی محبوب اور عزیز ہیں۔

حسینؑ اس شہر مدینہ میں سات سال اپنے جد پیغمبر اسلامؐ کے ساتھ اور تیس (۳۲) سال اپنے پدربزرگوار علیؑ مرتضیٰ کے ساتھ رہے جس میں خلفائے راشدین کا بچپن سالہ دور بھی شامل تھا۔ اس سال اپنے بھائی امام حسنؑ مجتبیٰ کے ساتھ مدینہ میں رہے۔ غرض پانچ سالہ کوفہ کی زندگی کے علاوہ اپنی ستاون (۵۷) سالہ عمر مقدس حسینؑ نے مدینہ میں گزاری۔

امام حسینؑ جہاں اہل علم و فضل اور اہل دانش کے لئے باب مدینہ العلم تھے وہاں وہ قرضداروں، بے نواؤں اور حاجتمندوں کے لئے باب الحوائج تھے۔ محتاجوں اور قرضداروں کی امیدیں اسی حسینؑ سے وابستہ تھیں۔ بیرون مدینہ سے آنے والے لوگ حسینؑ کا در ڈھونڈتے تھے اور پوچھتے تھے کہ حسینؑ بن علیؑ کا گھر کہاں ہے؟ حسینؑ نے حاجتمندوں اور مسائل کو حاجت روائی کے دوران کسی شرمندگی کا احساس نہیں ہونے دیا۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک مسائل کی حاجت روائی کے موقع پر امام حسینؑ نے خود کو دروازے کے پیچھے چھپا کر رقم عطا کی تاکہ مسائل شرمسار نہ ہو۔ یکا یک مسائل نے رونا شروع کیا۔ امامؑ نے فرمایا کہ مجھے معاف کر دو۔ اگر میرے پاس اور ہوتا تو میں تمہیں اور دیتا۔ مسائل نے عرض کیا کہ مولا ایسا نہیں ہے۔ آپؑ نے میری حاجت سے زیادہ عطا فرمایا ہے میں تو اس لئے رورہا ہوں کہ ایک دن یہ دست جو دو سخا پیوند زمین ہو جائیں گے۔ غرض امام حسینؑ اہل مدینہ کے لئے جو دو سخا کے مرکز و منبع تھے۔

۲۶ رجب المرجب سن ۶۰ھ کو والی مدینہ ولید بن عتبہ کو معاویہ بن ابوسفیان کی موت کی خبر ملی۔ ولید بن عتبہ بنی امیہ میں سب سے زیادہ اہل علم و دانش، فہم و فراست کا مالک، صاحب حکمت اور مدبر سمجھا جاتا تھا۔ ولید کے والی مدینہ ہونے اور خاندان بنی امیہ کا ایک معزز فرد ہونے کی وجہ سے بنی امیہ کے زعم و رئیس اور خلیفہ المسلمین معاویہ بن ابی سفیان کی موت اس کے لئے

کچھ زیادہ ہی افسوس ناک تھی اس کے لئے یہ خبر زیادہ پریشان کن اس وجہ سے بھی تھی کہ نئے خلیفہ یزید نے اپنے باپ معاویہ کی موت کی خبر دینے کے ساتھ ساتھ ولید کو اس امر پر مامور کیا تھا کہ وہ حسین بن علیؑ سے ہر صورت میں بیعت لے اور انکار کی صورت میں ان کا سر کاٹ کر اس کے پاس بھجوادے۔ اس حکم نے ولید کو ایک عجیب دورا ہے پر لا کھڑا کر دیا تھا، گویا اس کے ہاتھ میں ایک دودھاری تلوار تھما دی گئی تھی۔ ایک طرف یزید کا حکم تھا جس کی تعمیل میں اس کے اقتدار اور اس کی خاندانی حکومت کی بقا کی ضمانت تھی جب کہ دوسری طرف امام حسینؑ جیسی شخصیت کے قتل کے نتائج بھی اس کی نظروں کے سامنے تھے۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ اگر وہ حسین کو قتل کرتا ہے تو تنہا اس کے لئے نہیں بلکہ قتل حسینؑ کا گھناؤنا جرم بنی امیہ کے پورے خاندان کی ہلاکت کا سبب بن جائے گا اور حسینؑ کا قتل بنی امیہ کے کفر و شرک اور اسلام دشمنی کو بے نقاب اور طشت از بام کر دے گا۔

ولید یزید کا خط سامنے رکھ کر اس فکر میں ڈوبا ہوا تھا کہ دونوں صورتوں میں سے کون سی راہ اختیار کرے۔ سوچ رہا تھا کہ کوئی ایسی راہ نکل آئے کہ یزید کے حکم کی تعمیل بھی ہو جائے اور حسینؑ قتل بھی نہ ہوں۔ یزید بھی اس سے خوش رہے اور حسینؑ کے خون سے اس ہاتھ بھی رنگین نہ ہوں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یزید کی حکومت کو استحکام بخشنے اور اس کو خوش رکھنے کے لئے کس طرح خش اسلوبی خوش کلامی اور احترام کے ساتھ حسینؑ کو آمادہ کرے۔ لیکن کافی غور و خوض کے باوجود وہ کسی نتیجہ پہ نہ پہنچ سکا۔ اسی فکر و پریشانی کے عالم میں اچانک اس کے ذہن میں آیا کہ کیوں نہ اس سلسلہ میں مردان بن الحکم جیسے جہاندیدہ اور عمر رسیدہ شخص سے مشورہ لیا جائے جب کہ وہ بنی امیہ کے خاندان کے مصالحوں کو بہتر طریقہ پر سمجھتا بھی ہے۔ مردان اگرچہ ولید کا حریف و رقیب تھا لیکن ”ڈوبتے کو تھکے کا سہارا“ کے مصداق نہ چاہتے ہوئے بھی ولید نے اپنے حریف مردان کو مشورہ کے لئے دارالامارہ میں بلایا، معاویہ کی موت کو مد نظر رکھتے ہوئے تنہائی میں اس مسئلہ کو مردان کے

سامنے رکھا اور اس سے مشورہ طلب کیا کہ یزید کی مطالبہ بیعت کی خواہش کو کس طرح عملی جامہ پہنایا جائے۔

مردان ایک طرف تو امام حسینؑ سے انتہائی عداوت اور بغض و عناد رکھتا تھا، دوسری طرف خلافت اور گورزی کے لالچ کی وجہ سے وہ یزید اور ولید دونوں کا بدترین حریف تھا۔ اس سے کسی نیک اور صحیح مشورہ کی کیوں کر توقع کی جاسکتی تھی چنانچہ اپنی اندرونی خیانت اور فطری بد طبیعتی کے تحت اس نے ولید کو مشورہ دیا کہ معاویہ کی موت کی خبر شہر میں پھیلنے سے پہلے حسینؑ کو فوری طور پر بلا کر اسی وقت بیعت پر مجبور کیا جائے اور انکار کی صورت میں انہیں قتل کر دیا جائے۔ نہ صرف یہ بلکہ مردان نے ولید سے کہا کہ حسینؑ امیر المؤمنین معاویہ بن ابی سفیان سے سرکشی کا اظہار کرنے والوں میں سے ہیں وہ ہمیشہ ہمارے خاندان (بنی امیہ) کے خلاف رہے ہیں اور وہ اس سزا کے مستحق ہیں۔ اس نے ولید سے کہا کہ اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو حسینؑ کو ایک لحد بھی سوچنے اور حرکت کرنے کا موقع نہ دیتا۔

مردان کا یہ مشورہ اگرچہ ولید کو بہت شاق گزرا جس کی تلخی اس کے چہرے سے نمایاں تھی لیکن پھر بھی اس نے یہ کوشش کی کہ اس کی یہ ناگواری مردان پر ظاہر نہ ہو۔ چنانچہ یہ ثابت کرنے کے لئے کہ ولید یزید اور مردان کا خیر خواہ ہے اس نے مردان کے مشورہ پر عمل کرتے ہوئے اسی وقت آدمی بھیجا اور امام حسینؑ کو دربار میں طلب کیا۔ جب امام حسینؑ ولید کے دربار میں پہنچے تو ولید نے یا تو امام حسینؑ کے ساتھ بنی ہاشم کے جوانوں کی موجودگی کی وجہ سے یا اپنے علم و دانش اور فہم فراست کے تقاضوں کے تحت امام حسینؑ کو اپنے جال میں لانے کی غرض سے اپنے حُسن کلام اور مصنوعی اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ کر حسینؑ کا استقبال کیا، انتہائی ادب و احترام سے اپنی جگہ ان کو بٹھلایا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی وہ آپ کے لئے اپنے دل میں انتہائی نیک خیالات اور مقام و منزلت رکھتا ہے۔ ولید اپنی تجویز پیش کرنے سے پہلے پیش

بندی کے طور پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اگر اس کی تجویز امام حسینؑ کے لئے ناگوار اور ناقابل عمل ہو تو یہ اس کی بدعتی اور برے عزائم کی وجہ سے نہیں بلکہ نیک خواہشات اور مصلحت بنی کے تحت ہے۔

### امام حسینؑ - کلمہ بند سے خروج

مدینہ وہی شہر ہے جو امام حسینؑ کے جد کے توسط سے عالم اسلام کا مرکز بنا اور فرشتوں کی آمد و رفت اور تنزیل وحی کا مرکز قرار پایا۔ حسینؑ کے جد پیغمبر ختمی مرتبتؐ نے کل جن لوگوں کو اس شہر مدینہ سے ذلت و خواری کے ساتھ جلا وطن کیا آج انہیں ذلیل و کمین خصلت لوگوں نے حسینؑ پر اس شہر کی فضا اور زمین تنگ کر دی اور حسینؑ کو رات کی تاریکی میں مدینہ چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔

کون حسینؑ؟

وہی حسینؑ جس کے جد نے یہاں کے لوگوں کو آزادی عطا فرمائی۔

وہی حسینؑ جس کے بارے میں پیغمبر اسلامؐ نے اپنے قول و فعل کے ذریعہ بارہا بتایا کہ اس کا خون میرا خون ہے اس کی روح میری روح ہے اس کا گوشت میرا گوشت ہے اس کی محبت میری محبت ہے جس نے اسکو تکلیف پہنچائی اس نے گویا مجھ سے ذیت دی۔

وہی حسینؑ جس نے اپنے جد کے بعد اس شہر کو معمور و آباد کیا۔

آج اسی حسینؑ کو مدینہ چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا۔

امام حسینؑ - کے مدینہ چھوڑنے کے یقیناً کچھ اسباب و علل تھے اور ان اسباب و علل کے مقابلہ میں امامؑ کو لامحالہ کچھ اقدامات کرنا ناگزیر تھے۔

اس سلسلے میں جو حالات اور واقعات امامؑ کو پیش آئے ان کو ہم قارئین کے سامنے

ترتیب وار پیش کرنا چاہتے ہیں:

(۱) ۲۷ رجب ۶۰ھ کو نماز عشاء کے بعد وائے مدینہ نے امام حسینؑ کو دارالامارہ میں

طلب کیا۔

(۲) امام جب دارالامارہ پہنچے تو وائے مدینہ نے خوش اخلاقی اور نرم مزاجی کا مظاہرہ کرتے ہوئے تعظیماً امامؑ کو اپنی مسند کے نزدیک جگہ دی۔

(۳) مردان بن حکم بن عاص اس وقت دارالامارہ میں موجود تھا۔ یہ وہی مردان ہے جس کو پیغمبرؐ کے حکم سے مدینہ سے نکال دیا گیا تھا اور جس کی خیانت اور جرم کے نتیجہ میں خلیفہ سوم کو بغاوت اور بالآخر قتل کا سامنا کرنا پڑا۔ مردان اپنے بغض، کینہ، حسد اور اپنی اذلی خباثت کا مظاہرہ کرتے ہوئے امامؑ کے دارالامارہ پہنچنے پر آپؑ کے احترام میں اپنی جگہ سے ہلاکت نہیں گویا اس مجلس میں فرزند رسولؐ نہیں بلکہ کوئی عام اور اجنبی آدمی آ کر بیٹھا ہے۔

(۴) اس کے برخلاف جب امام حسینؑ دارالامارہ پہنچنے کے بعد اپنی مسند پر بیٹھے تو مردان کو مجلس میں پا کر امامؑ نے اپنے اخلاقی کریمہ اور حسن نیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے دلید اور مردان کو سبک دیکھ کر اپنی خوشی کا اظہار فرمایا اور فرمایا:

”مجھے تم دونوں کو اکٹھا دیکھ کر خوشی ہوئی ہے“ آپؑ نے فرمایا: ”ایک تو صلہ رحمی کا تقاضا ہے کہ آپس میں مل بیٹھ کر رہیں دوسرے اختلاف اور امتنا رکی بجائے اتحاد و الفت اچھی بات ہے“۔

(۵) وائے مدینہ نے امامؑ کو خلیفہ مسلمین معاویہ بن ابی سفیان کی موت کی خبر دیتے ہوئے کہا کہ اب نئے خلیفہ یزید بن معاویہ کی خواہش ہے کہ آپؑ سے بیعت لی جائے۔

(۶) امام حسینؑ نے معاویہ کی موت کی خبر سن کر کلامہ استرجع پڑھا اور وائے مدینہ اور اس کے خاندان کو تعزیت پیش کی۔

(۷) دلید کے تقاضائے بیعت کے جواب میں امام حسینؑ نے فرمایا:

”نئے خلیفہ کی بیعت کئے جانے کا معاملہ ایک معمولی عمل نہیں ہے۔ نہ ہی یہ ایک

انفرادی عمل ہے بلکہ اجتماعی عمل ہے۔ اس مطالبہ کو سب کے سامنے اجتماع میں پیش ہونا چاہیے اور وہاں طے ہونا چاہیے۔ تاہم مجھے یقین ہے کہ خفیہ طور پر کی جانے والی کسی بیعت پر اکتفا بھی نہیں کی جائے گی۔ میں ایک الگ انسان نہیں ہوں۔ جب سب کو بلایا جائے تو مجھے بھی بلالینا، وہیں اس مسئلہ کو طے کریں گے۔“

(۸) ولید کو امام حسینؑ کی اس خوش اخلاقی اور خوش اسلوبی کے مظاہرہ پر خوشی ہوئی اور اس نے آپؑ کی پیش کش کو دل سے قبول کر لیا۔ جب بیعت کے مسئلہ کو عام اجتماع میں اٹھانے کا فیصلہ کو قبول کر لیا گیا تو امامؑ نے رخصت ہونے کی اجازت چاہی اور ولید نے امامؑ کو رخصت ہونے کی اجازت دے دی۔

(۹) اگرچہ ولید کا امامؑ سے بیعت طلب کرنا آپؑ کے لئے نہایت گراں اور ناقابل برداشت امر تھا لیکن آپؑ نے اپنے غم و غصہ کو برداشت کیا اور نہایت خوش اسلوبی اور خندہ پیشانی سے ولید کو مطمئن اور قانع کیا۔

(۱۰) لیکن مردان جو مجلس ولید میں ایک غیر متعلق شخص تھا اور کسی صورت میں اس مسئلہ (مطالبہ بیعت) کا فریق نہیں تھانے مجلس کے اس حسن اختتام اور الفت و محبت کے مظاہرے کو کدورت، نفرت اور بغض و عناد میں بدل دیا۔

(۱۱) جب مردان نے ولید کے دربار میں افہام تفہیم اور حسن گفتگو کو کدورت اور تلخی و تندی میں بدل دیا اور اپنے چھپے ہوئے مذموم عزائم کو آشکار کر دیا تو امام حسینؑ کو مجبوراً اپنے منطقی عزائم کو کھل کر مظاہرہ کرنا پڑا۔ چنانچہ آپؑ نے واشگاف الفاظ میں اعلان فرمایا:

”یزید کسی بھی لحاظ سے مصہب خلافت کا اہل نہیں اور کسی بھی صورت میں یہ ممکن نہیں کہ مجھ جیسی شخصیت پر یزید جیسے شخص کی بیعت کرے۔ میں ہرگز اس کی بیعت نہیں کر سکتا۔ تاہم میں پھر بھی چاہتا ہوں کہ اس مسئلہ کو احسن طریقہ سے حل کرنے کی راہیں تلاش کی جائیں۔“

یہ کہہ کر امام حسینؑ دارالامارہ سے باہر نکلے اور اپنے ہمراہ آنے والے بنی ہاشم کے نوجوانوں کے حلقہ میں واپس اپنے گھر تشریف لے گئے۔

(۱۲) دارالامارہ سے واپسی کے بعد امام حسینؑ - انتہائی حزن و ملال کے عالم میں روضہ رسولؐ پر پہنچے، سلام و زیارت کے بعد اپنے درپیش مسائل کو بارگاہ ایزدی میں یہ کہہ کر پیش کیا: ”بارالہا! جو کچھ مجھے پیش آیا ہے تو اس سے خوب آگاہ ہے۔ پالنے والے! میں درپیش مسائل کے سلسلے میں تجھ سے تیرے رسولؐ کے توسل اور توسط سے اپنے وظیفہ اور ذمہ داری کے تعین کے لئے رہنمائی اور ہدایت کا خواستگار ہوں تو ہی میری راہنمائی فرما۔“

(۱۳) روضہ رسولؐ سے واپسی کے بعد امامؑ نے اپنے ان اعضاء سے ملاقاتیں کیں جنہیں آپؑ کو مدینہ ہی میں چھوڑنا تھا۔ ان شخصیات میں سے جن ہستیوں کا تاریخ میں نام ملتا ہے ان میں محمد بن حنفیہ، عمر اطرف، ام سلمہ اور دیگر خواتین بنی ہاشم ہیں۔ امامؑ نے ان سے وداع ہوتے ہوئے انہیں مدینہ چھوڑنے اور اپنے عزم سفر سے آگاہ کیا اور ان کو قسم دے کر اس مسئلہ کو پوشیدہ اور مخفی رکھنے کی تاکید کی۔

(۱۴) مدینہ چھوڑتے وقت آپؑ نے ایک وصیت نامہ اپنے بھائی محمد حنفیہ کے سپرد کیا جس میں آپؑ نے اپنے سفر کے اہداف و مقاصد بیان کئے تھے۔ آپؑ نے ان سے فرمایا: ”آپ مدینہ میں قیام کریں اور مدینہ میں پیش آنے والے حالات سے مجھے مسلسل آگاہ رکھیں۔“

(۱۵) ان تمام تیاریوں کے بعد ۲۸ رجب ۶۰ھ کو رات کی تاریکی میں اپنے اعضاء کے ساتھ امامؑ خوف کے عالم میں مدینہ سے نکلے مبادا بنی امیہ کے حکام متوجہ ہو جائیں۔ مدینہ چھوڑتے وقت آپؑ اسی آیت کی تلاوت فرما رہے تھے جو حضرت موسیٰؑ کے مصر چھوڑنے کے

بارے میں ہے:

﴿فخرج منها خائفاً يترقب.....﴾ (قصص ۲۱)

(۱۶) مدینہ سے باہر نکلنے کی بعد آپؑ نے جب اسی عام راستہ کو اختیار کیا جو مکہ جاتا ہے تو آپؑ کے ہمراہ کاب افراد میں سے بعض نے یہ تجویز پیش کی آپؑ بھی مکہ جانے کے لئے کوئی دوسرا راستہ اختیار کریں جیسا کہ عبداللہ بن زبیر نے مدینہ چھوڑتے وقت اختیار کیا تھا تا کہ آپؑ دشمن کے ہاتھ نہ آسکیں۔

یہ تھے وہ حالات اور واقعات جو مدینہ چھوڑتے وقت امام حسینؑ - کو پیش آئے۔ ان حالات و واقعات کے پیش نظر بہت سے سوالات ہیں جو انسان کے ذہن میں ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ ان سوالات کا تجزیہ و تحلیل نہایت اہم اور ضروری ہے۔ ضروری اس لئے ہے کہ ان سوالات کے تجزیے اور تحلیل کے ذریعہ ہمیں قیام امام حسینؑ کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔ ان حالات و واقعات کو جاننے کے بعد یوں تو مختلف لوگوں کے ذہنوں میں بہت سے سوالات آسکتے ہیں لیکن اس وقت جو سوالات ہمارے ذہن میں ہیں وہ ہم قارئین کے سامنے پیش کرتے ہیں:

(۱) حاکم مدینہ ولید نے امام حسینؑ کو رات کو بے وقت کیوں طلب کیا؟ معاویہ کی موت کی خبر اور مطالبہ بیعت کا مسئلہ کیا صرف امام حسینؑ سے وابستگی رکھتا تھا جب کہ امام حسینؑ نہ تو بنی امیہ کے عزیزوں میں تھے اور نہ ان کے قریبی حلقوں میں آپؑ کا شمار ہوتا تھا کہ ان کے سامنے معاویہ کی موت پر دکھا اور مصیبت کا اظہار کیا جائے یا یزید کی بیعت کے بارے میں ان سے صلاح و مشورہ لیا جائے۔ پھر کیوں صرف امام حسینؑ ہی کو اس بے وقت طلب کیا گیا؟

(۲) مردان بن حکم کے ولید سے اچھے اور خوشگوار تعلقات نہیں تھے۔ یہ ایک دوسرے کو پسند بھی نہیں کرتے تھے۔ بلکہ ایک دوسرے کے حریف و رقیب تھے۔ اس کے علاوہ ولید کا نقطہ نظر مردان کے نقطہ نظر سے قطعاً ہم آہنگ نہیں تھا۔ اس کے باوجود اس مسئلہ میں مردان

کو کیوں شامل کیا گیا؟

(۳) ولید کا امام حسینؑ کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنا اس کا آپؑ کے ساتھ گفتگو میں ادب و لحاظ بعد میں مردان سے خطاب پھر عبید اللہ بن زیاد کے نام اس کے خط سے اور ان تمام باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ ولید امام حسینؑ کے بارے میں اچھا خیال رکھتا تھا اور اس کے دل میں امام کا ایک مقام تھا۔ آخر اس کے کیا وجوہات ہیں؟ وہ کیوں امام حسینؑ کے بارے میں اچھا خیال رکھتا تھا؟

(۴) اس کے برخلاف مردان کا امامؑ سے اتنی خیانت اور عداوت و دشمنی کا مظاہرہ اور ولید کو ان سے اسی وقت اور فوری بیعت طلب کرنے کی تاکید کی کیا وجوہات ہیں؟

(۵) امام حسینؑ - جو عظیم حق و عدالت کے علم بردار ہیں ہمیشہ حق و صداقت کی راہ پر گامزن ہیں، کسی کو نہ کبھی دھوکا دیتے ہیں اور نہ کسی کو تارکی میں رکھنا پسند کرتے ہیں، جو نہ کسی سے ڈرتے اور نہ کسی تذبذب کا شکار تھے بلکہ اس کے برخلاف ایک عزم راسخ رکھتے تھے کہ کسی بھی صورت میں یزید کی بیعت نہیں کریں گے..... انہوں نے کیوں مطالبہ بیعت کے جواب میں ولید سے تاخیر کرنے اور دونوں فریقوں کو اس مسئلہ پر سوچنے، سمجھنے اور فیصلہ کرنے کے لئے موقع دینے کی خواہش کی؟

(۶) مردان کی اس تاکید اور اصرار کے باوجود کہ امام حسینؑ سے اسی وقت بیعت لی جائے یا انہیں گرفتار اور قتل کیا جائے..... ولید نے کیوں امام حسینؑ کو دربار سے باہر جانے کا موقع دیا جب کہ ایک لحاظ سے امامؑ بیعت کرنے سے انکار کر چکے تھے؟

جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا امام حسینؑ - ولید کے دربار سے گھر واپس تشریف لانے کے بعد روضہ رسولؐ پر گئے۔ روضہ رسولؐ سے وداع ہونے کے بعد آپؑ مدینہ چھوڑنے کا مصمم ارادہ کیا اور اپنے اعزاء کو خدا حافظ کہا جنہیں مدینہ چھوڑنا تھا۔ خصوصاً اپنے بھائی محمد بن حنفیہ کو مدینہ میں

اپنا جائشین قرار دیا ایک وصیت نامہ ان کے سپرد کیا اور تاکید فرمائی کہ وقتاً فوقتاً مجھے مدینہ کے حالات سے آگاہ کرتے رہنا۔ اس کے بعد اپنے خاندان کے جن افراد کو اپنے ساتھ لیا تھا ان کو ساتھ لے کر رات کی تاریکی میں اس وقت مدینہ سے نکلے جب لوگ بخواب تھے۔

مدینہ چھوڑتے وقت آپؑ اس آیت کریمہ کی تلاوت فرما رہے تھے جو حضرت موسیٰ کی مصر سے نکلنے کی کیفیت کو ظاہر کرتی ہے: ﴿فَخَرَجَ مِنْهَا خَائِفًا يَتَرَقَّبُ.....﴾

امامؑ کا اس آیت کریمہ کی تلاوت کرنا بتاتا ہے کہ آپؑ ایک خوف کے عالم میں نکلے جب کہ متعدد آیات قرآنی اور بہت سی روایات میں مردانِ خدا خدا کے سوا کسی سے خوف نہیں کھاتے۔ چنانچہ امیر المومنین امام علیؑ - سے نبی البلاغہ میں منقول ہے:

”میں موت سے نہیں گھبراتا، موت مجھ پر آ پڑے یا میں موت پر جا پڑوں“

خود امام حسینؑ نے اپنے مکہ کے خطبہ میں فرمایا:

”مجھے اپنے بزرگوں سے ملنے کا اتنا ہی شوق ہے جتنا یعقوبؑ کو یوسفؑ سے ملنے کا شوق

تھا“

لہذا سوال پیدا ہوتا ہے کہ مدینہ سے نکلنے وقت امام حسینؑ کو کس چیز کا خوف تھا؟

کیا آپؑ حاکمِ وقت یزید اور اس کے کارندوں سے خوف زدہ تھے؟ یا مدینہ کے عوام سے خوف کھاتے تھے؟ یا پھر آپؑ کس خوف کی برگشت خدا کی طرف تھی؟

اس خوف کی تفسیر میں عقلی تحلیل و تجزیہ کرنے سے جو چیز سامنے آتی ہے وہ مندرجہ ذیل

خطرات ہیں جن سے امامؑ اس وقت دوچار تھے:

(۱) آپؑ کو ڈر تھا کہ حکومتِ وقت آپؑ کو اس سفر سے روک دے گی اور آپؑ

کو شہر بند کر دے گی۔

(۲) اگر حکومت کو آپؑ کی روانگی کا علم ہو جاتا تو آپؑ کو ڈر تھا کہ حکومت کے

کارندوں اور آپؑ کے درمیان جنگ ہوگی اور مدینہ جنگ کا میدان بن جائے گا۔

(۳) یہ خطرہ لاحق تھا کہ آپؑ کو گرفتار کر کے قید کر دیا جائے گا۔

(۴) یا پھر ہو سکتا ہے کہ مردان کی تجویز کے تحت آپؑ کو قتل کر دیا جائے۔

مندرجہ بالا چاروں احتمالات میں سے جو بھی احتمال درپیش آتا اس کا لازمی نتیجہ یہ

ہوتا کہ آپؑ اپنے الہی و وظیفہ اور مسئولیت کی ادائیگی سے عاجز رہتے اور جو الہی ذمہ داری آپؑ

کو ادا کرنی تھی اس سے آپؑ کو روک دیا جاتا۔ اس لئے امامؑ سر دست ایک ایسی جگہ کی ضرورت

محسوس کر رہے تھے جہاں مندرجہ بالا خطرات میں سے کوئی خطرہ لاحق نہ ہوتا کہ آپؑ اپنے اہداف

اور مسئولیت کو عملی جامہ پہنا سکیں۔ اس کے علاوہ آپؑ چاہتے تھے کہ یہ جگہ ایسی ہو جہاں سے امت

اسلامی سے آپؑ رابطہ رہے اور ان تک جلد سے جلد اپنا پیغام پہنچا سکیں۔

اس لحاظ سے مدینہ کی سرزمین کسی طرح بھی آپؑ کے مقاصد کے لئے مناسب نہ

تھی۔ نہ صرف مدینہ بلکہ مکہ کے علاوہ روئے زمین پر کوئی بھی جگہ امامؑ کے مقاصد سے ہم آہنگ نہ

تھی۔ مکہ ہی وہ سرزمین ہے جو بِلدِ امینِ حرمِ امینِ خدا اور مسلمانانِ عالم کا مرکز اجتماع

ہے۔ پھر ایامِ حج و عمرہ میں اس کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ لہذا امام حسینؑ ان خطرات سے

بچنے اور اپنے قیام و انقلاب کے لئے مناسب ترین سرزمین یعنی مکہ مکرمہ پہنچنے کیلئے ۲۸ رجب

المرجب ۶۰ ہجری کی رات کی تاریکی اور خوف کے عالم میں مدینہ سے نکلے تاکہ دشمن آپؑ کے

سفر سے باخبر نہ ہو جائے۔ مدینہ سے نکلنے وقت آپؑ سورہ قصص کی اس آیت کی تلاوت فرما رہے

تھے:

﴿فَخَرَجَ مِنْهَا خَائِفًا يَتَرَقَّبُ قَالَ رَبِّ نَجِّنِي مِنَ الْقَوْمِ

الظَّالِمِينَ﴾ (قصص ۲۱)

اس آیت کی تلاوت اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آپؑ کو اپنا پیچھا کرنے والے

دشمنوں سے خوف لاحق تھا۔

غرض آپؑ ۳ شعبان المعظم ۶۰ ہجری کو سورہ قصص کی اس آیت کو تلاوت کرتے ہوئے سرزمین مکہ میں وارد ہوئے:

﴿وَلَمَّا تَوَجَّهَ تَلْقَاءَ مَلِئِينَ قَالَ عِيسَىٰ رَبِّيٰ اَنْ يَّهْلِكَنِي سِوَا السَّبِيلِ﴾ (قصص ۲۲)

مکہ

امام حسینؑ کے مقدس قیام کے حوالے سے جس دوسرے شہر کا نام آتا ہے وہ مکہ مکرمہ ہے۔ حکمرانوں نے جب آپؑ کے لئے مدینہ کی مقدس سرزمین اور اس کی فضا کو تنگ کر دیا اور وہ آپؑ کے خون کے درپے ہو گئے تو آپؑ نے اپنے لئے سرزمین مکہ کا انتخاب کیا۔ ۳ شعبان المعظم ۶۰ ہجری سے لے کر ۸ ذی الحجہ تک آپؑ نے مکہ میں قیام فرمایا۔ مکہ مکرمہ میں اس قلیل مدتی لیکن بابرکت مصروفیت کی بعد ہنگامی اور غیر متوقع حالات میں امامؑ نے لوگوں کی غمخوارانہ وادہان کو حیران و سرگردان چھوڑ کر مکہ کو ترک کیا اور عراق کی طرف متوجہ ہوئے۔ مدینہ کے بعد سرزمین مکہ کا انتخاب کرنا اور مکہ میں اپنے مختصر قیام کے دوران غیر معمولی سرگرمی اور مصروفیات کے بعد ہنگامی حالت میں عین ایسے موقع پر جب پوری دنیائے اسلام کی توجہ مکہ کی طرف تھی آپؑ کا مکہ سے نکلنا ایک ایسا سوالیہ نشان ہے جو اس وقت سے لے کر آج تک لوگوں کے ذہنوں کو دعوتِ فکر دے رہا ہے اور مختلف نوعیت کے سوالوں کو ذہنوں میں ابھارنے کا سبب بنا ہوا ہے۔

ہماری ہر ممکن کوشش ہوگی کہ اس سلسلے میں جو سوالات ذہن میں اب تک آ بھرے ہیں یا آئندہ سامنے آسکتے ہیں ان تمام سوالات کا اور ان سب جوابات کا جو اس سلسلے میں اب تک دیئے گئے ہیں یاد دہائیے جاسکتے ہیں اس مختصر گفتگو میں احاطہ کیا جائے۔ لیکن ان سوالات اور ان کے جوابات سے پہلے سرزمین مکہ کی تاریخی اور شرعی حیثیت اور مسلمانوں کے نزدیک مکہ کا جو مقام

دنزلت ہے اسے پیش کرنا ضروری ہے۔

مکہ یا مکہ

قرآن کریم میں اس شہر کا ”مکہ“ اور ”بکہ“ کے نام سے ذکر ہوا ہے۔ سورہ فتح کی آیت ۲۴ میں ”مکہ“ کے نام سے جب کہ سورہ آل عمران کی آیت ۹۶ میں اس کا ذکر ”بکہ“ کے نام سے ہوا ہے۔

بعض اہل لغت کے نزدیک ”مکہ“ یا ”بکہ“ دونوں ہی مسمیٰ رکھتے ہیں جبکہ بعض کی نزدیک یہ دو اسم اور دو مسمیٰ ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ لغت عرب میں ایک قاعدہ کے مطابق ایک حرف دوسرے حرف کی جگہ لیتا ہے جیسے لفظ ”لازم“ کے ”میم“ کو بدل کر اس کی جگہ ”ب“ لگا دیں اور اسے ”لازم“ کی بجائے ”لاب“ کہا جائے۔ جب کہ بعض مفسرین کے نزدیک ان دونوں میں فرق ہے جیسا کہ بعد میں وضاحت کی جائے گی۔ پہلے ہم لغت کے لحاظ سے لفظ مکہ کے معنی کی وضاحت کریں گے:

(۱) م ک ک: مضاعف ہے اور کتب لغت میں اس کے مختلف معنی بیان ہوئے ہیں۔ لسان العرب میں مکک کے معنی ہیں چوسنا، جیسے ہڈی میں موجود مغز کو چوسنا یا اونٹنی کے بچہ کا اس کے پستان سے دودھ چوسنا۔ چنانچہ بیان ہوا ہے کہ ”مک الفصیل مافی ضرع امہ“ یعنی اونٹنی کے بچہ نے اس کے پستان سے تمام دودھ چوس لیا۔

(۲) مجمع البحرین میں ”المکک“ نقض اور ہلاکت کے معنوں میں بیان ہوا ہے۔

(۳) اس کے علاوہ تنگ اور بے آب و گیاہ سرزمین کو مکہ کہا گیا ہے۔

بہر حال یہ تینوں معنی اس سرزمین پر صادق آتے ہیں اور اس سے مطابقت رکھتے ہیں۔ جہاں یہ چوسنے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے وہاں دلحاظ سے یہ مفہوم اس پر صادق آتا ہے ایک یہ کہ یہ سرزمین اطرافِ عالم سے اپنے لئے زائر، مہمانوں اور رزاق کو اپنی طرف

کھینچتی اور انہیں جذب کرتی ہے، جیسا کہ سورہ ابراہیم کی آیت ۳۷ میں ہے:

﴿فاجعل افضلہ من الناس تھوی الیہم وارزقہم من الثمرات لعلہم یشکروں﴾ ”پروردگارا! لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف مائل کر اور انہیں طرح طرح کے پھلوں سے روزی عطا کرنا کہ یہ لوگ تیرا شکر ادا کریں“

چوسنے اور جذب کرنے کے معنی اس لحاظ سے بھی اس پر صادق آتے ہیں کہ یہ سرزمین اپنے زائرین اور مہمانوں کے گناہوں کو چوس لیتی ہے۔ جب کوئی زائر اور حاجی خانہ خدا کی طرف آنے کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے قصد و نیت سے لے کر اس کے واپس جانے تک ہر لمحہ اور ہر ذوق پر یہ سرزمین اس کے گناہ چوستی رہتی ہے اور جب وہ واپس جاتا ہے تو ہر گناہ سے پاس ہو کر ایک نومولود بچہ کی طرح معصوم ہو کر واپس جاتا ہے، تمام آٹا رنگناہ اس سے محو ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ کتاب ”الحج فی الکتاب و سنیہ“ کے صفحہ ۲۸۵ پر ”کتاب ثواب الاعمال“ (تالیف شیخ صدوق علیہ الرحمہ) کے حوالے سے ہے کہ امام جعفر صادق نے پیغمبر اسلام سے نقل کیا ہے:

”حاجی جب حج کیلئے اپنے سامان کو تیار کرتا ہے تو سامان اٹھانے اور رکھنے میں ہر بار اس کے دس گناہ محو ہو جاتے ہیں اس کیلئے دس حسنات کا ثواب لکھا جاتا ہے اور اس کے دس درجات بلند ہوتے ہیں جب وہ اپنے سفر کا آغاز کرنے کے لئے اپنی سواری پر سوار ہوتا ہے تو ہر قدم پر اس کے دس گناہ معاف ہوتے ہیں اس کے لئے دس حسنات کا ثواب لکھا جاتا ہے اور اس کے دس درجات بلند ہوتے ہیں۔ جب وہ کعبہ کا طواف کرتا ہے تو طواف ختم ہوتے ہی اس کے تمام گناہ بخشے جاتے ہیں جب وہ صفا اور مردہ کے درمیان سعی کرتا ہے تو وہ گناہوں سے بالکل پاک ہو جاتا ہے جب وہ عرفات میں قوف کرتا ہے تب بھی اس کے گناہ بخشے جاتے ہیں جب مشعر الحرام میں قوف کرتا ہے اس وقت بھی اسکے گناہ بخشے جاتے ہیں جب وہ رمی جمرات کرتا ہے تب بھی وہ اپنے گناہوں سے پاک ہوتا ہے۔ اس طرح ہر موقع حج جس میں وہ قوف

کرتا ہے اور مناسک حج انجام دیتا ہے اس کے گناہ معاف ہوتے رہتے ہیں۔“

یعنی اگر پہلے مرحلہ میں وہ نہ بخشا گیا یا کچھ گناہ باقی رہ گئے تو دوسرے مرحلے میں وہ بخشا جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مکہ اس طرح اپنے مہمانوں کے گناہوں کو چوستا ہے جیسے بچہ اپنی ماں کا دودھ چوستا ہے۔

مکہ کے دوسرے معنی نقص و ہلاکت کے ہیں۔ چنانچہ کسی چیز کے توڑنے کو ”مکک“ کہتے ہیں۔ سرزمین مکہ اس مفہوم سے بھی مطابقت رکھتی ہے۔ سورہ حج کی آیت ۲۵ میں خانہ خدا کی حرک حرمت کرنے والوں کو دردناک عذاب کی وعید دی گئی ہے۔ یہ عذاب شرعی حکم کے علاوہ نکلونی طور پر بھی نازل ہوا ہے۔ چنانچہ ہم یہاں اس کے تین شواہد پیش کرتے ہیں:

(۱) زمانہ جاہلیت میں اساف بن علی نامی شخص اور نائلہ بنت زید نامی عورت نے خانہ خدا میں گناہ کبیرہ کا ارتکاب کر کے اس گھر کی حرک حرمت کی خدا وند عالم نے ان کو مسخ کیا۔ اہل مکہ نے حرک حرمت کرنے والوں کو ملنے والی سزا کو عبرت کے نمونہ کے طور پر کوہ صفا پر اساف کا مسخ شدہ پتلا اور کوہ مردہ پر نائلہ کا مسخ شدہ پتلا نصب کیا تا کہ لوگ عبرت حاصل کریں۔ لیکن ایک مدت گزرنے کے بعد ان دونوں پتلوں کو لوگوں نے بت بنا لیا۔ چنانچہ سعی کرتے وقت مشرکین عرب ان کو چومتے تھے۔ ان دونوں بتوں کے صفا اور مردہ پر نصب ہونے کی وجہ سے مسلمانوں پر صفا اور مردہ کے درمیان سعی کرنا بہت گراں گزرتا تھا۔ چنانچہ پیغمبر اسلام نے ان دونوں بتوں کو وہاں سے ہٹایا اور سورہ بقرہ کی آیت ۱۵۸ کے تحت مسلمانوں کو صفا اور مردہ کے درمیان سعی بجالانے کا حکم دیا۔

(۲) ”شفاء الغرام“ جلد اول، صفحہ ۳۰۲ پر لکھا ہے کہ یمن کا بادشاہ تاج حمیری مدینہ سے

گزر رہے ہوئے جعفہ اور مکہ کے درمیان بنی ہذیل کے قبیلہ کے چند افراد سے ملا تو انہوں نے اس

کو خانہ کعبہ کو جلانے اور اس کی اہانت کرنے کا مشورہ دیا۔ ان لوگوں کا یہ مشورہ یا کعبہ سے بد نیتی پر مبنی تھا یا خود بادشاہ یمن سے بد نیتی پر تا کہ وہ عذاب الہی میں گرفتار ہو۔ جبکہ حرمت کے ارادہ سے یہ شخص جب مکہ سے نزدیک ہوا تو آندھی چلی اور اس کے سر میں درد ہوا اور وہ سخت بیمار ہو گیا۔ اس نے وہاں موجود عیسائی علماء سے اس کا علاج پوچھا تو انہوں نے کہا کہ شاید تم نے خانہ خدا کے متعلق کچھ بُری نیت کی تھی بادشاہ یمن نے اس کا اقرار کیا اور کہا کہ مجھے بنی ہذیل نے اس کا مشورہ دیا تھا۔ اس پر علمائے نصاریٰ نے کہا کہ ایسا مشورہ دے کر انہوں نے تمہاری ہلاکت اور نابودی کا بندوبست کیا تھا کیونکہ جو بھی اس گھر کے خلاف بُری نیت کرے گا وہ یقینی طور پر ہلاکت اور نابودی سے دوچار ہوگا۔ بادشاہ یمن نے پوچھا کہ اب اس کا کیا چارہ ہے تو انہوں نے جواب دیا کہ اس گھر اور اہل کعبہ کے ساتھ نیک نیتی کرو۔ چنانچہ اس نے سوا دن ذبح کئے اور غلاف کعبہ کی نذر کی تو اس کو شفا نصیب ہوئی۔

(۳) اس کے علاوہ اصحابِ فیل کا وہ مشہور واقعہ جس کا سورہ فیل میں ذکر ہوا ہے اس

امر کا تیسرا شاہد ہے۔

مکہ کے تیسرے معنی بے آب و گیاہ خشک سر زمین۔ یہ مفہوم اس لحاظ سے اس پر صادق آتا ہے کہ یہ جگہ خشک اور غیر آباد ہے۔ چنانچہ حضرت ابراہیم نے جب حضرت اسماعیل اور حضرت ہاجرہ کو اس سر زمین پر چھوڑا تو دعا کرتے ہوئے فرمایا:

”پروردگارا! میں نے اپنی ذریت میں سے بعض کو تیرے محترم مکان کے قریب بے آب

و گیاہ وادی میں چھوڑ دیا ہے“ (ابراہیم ۳۷)

بکے

مکہ کا دوسرا نام مکہ ہے جس کے معنی ہیں دبانا اور مارنا۔ یہ معنی بھی اس لحاظ سے مطابقت رکھتا ہے کہ جو بھی ظالم و جاہل خانہ خدا کی اہانت کرے گا خدا اس کی گردن کو دبا دے

گا اور متکبرین کے غرور کو خاک میں ملا دے گا۔

کچھ لوگوں کے نزدیک مکہ کے معنی ازدحام ہیں۔ ازدحام کے مفہوم کے لحاظ سے بھی یہ نام مطابقت رکھتا ہے۔ ازدحام کے مفہوم کے اعتبار سے حجر اسود اور مقام ابراہیم اس کا مصداق جلی ہے۔ اس کے بعد پورا مصافحہ اس کے بعد پوری مسجد حرام اور اس کے بعد پوری مکہ کی سر زمین جائے ازدحام ہے۔

اس شہر کا تیسرا نام ”بلدِ امین“ ہے۔ چنانچہ یہ سر زمین ہر کسی کے لئے خلی بنات و حیوانات اور انسانوں کے لئے بھی مقامِ امن ہے۔ یہاں تک کہ اس مجرم کے لئے بھی جائے امن ہے جو یہاں آ کر پناہ لے۔ لیکن ایسا شخص جو اس مقدس سر زمین پر جرم کرے اس کو مکہ ہی میں سزا دی جائے گی کیونکہ اس نے اس گھر کی حرمت کی ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں سورہ ابراہیم کی آیت ۳۵، تین ۳، بقرہ ۱۲۶، نمل ۹۱ میں اسے بلدِ امین کہا گیا ہے۔

اس شہر کا چوتھا نام ”ام القریٰ“ ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں سورہ انعام کی آیت ۹۲ اور سورہ شوریٰ کی آیت ۷ میں اس شہر کو اس نام سے پکارا گیا ہے۔ ”ام القریٰ“ دو لفظوں ”ام“ اور ”قریٰ“ سے مرکب ہے۔ قرآن کریم میں لفظ ”ام“ ۲۳ مرتبہ آیا ہے۔ اہل لغت نے کسی چیز کی آخری برگشت کو ”ام“ کہا ہے۔ قرآن کریم میں آیاتِ محکمات کو ام الکتاب اس لئے کہا گیا ہے کیونکہ آیاتِ متشابہات کی برگشت آیاتِ محکمات کی طرف ہوتی ہے جیسا کہ سورہ آل عمران آیت ۷، رد ۳۹، زخرف ۴ میں بیان ہوا ہے۔

دوسرا لفظ ”قریٰ“ ہے جو قریہ کی جمع ہے۔ کسی چیز کے اجتماع کو قریہ کہتے ہیں چنانچہ حوض کو قریہ کہتے ہیں۔ حیض کو بھی قریہ کہتے ہیں۔ اس لحاظ سے مکہ کو ام القریٰ کہنے کی چند وجوہات ہیں:

(۱) پوری زمین کی بنیاد مکہ سے شروع کی گئی ہے۔ یہاں سے دح و الارض

کیا گیا ہے یعنی زمین کو یہاں سے کھینچا گیا ہے گویا زمین کی برگشت یہ سر زمین ہے۔

(۲) بیت اللہ: قبلہ عالم ہے۔ دنیا بھر کے رہنے والے نمازی اس گھر کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ جس طرح کسی بادشاہ کا محل اس کی رعایا کے گھروں کے مقابلہ میں فوقیت اور منزلت رکھتا ہے اسی طرح عرف میں بیت اللہ بھی دوسری جگہوں پر فوقیت اور منزلت رکھتا ہے۔ چنانچہ کوئی آن اور کوئی لحظہ ایسا نہیں جس میں اس کی طرف متوجہ نہ ہو جاتا ہو۔

(۳) مکہ: اجتماع انسانی کا عظیم ترین مرکز ہے جس کے مقابلے میں پوری دنیا میں کوئی اور دوسری جگہ ایسی نہیں جہاں ہمہ وقت اس کثرت کے ساتھ لوگوں کی آمد و رفت رہتی ہو۔

### مکہ کی فضیلت اور شرف

مکہ کو یہ مقام شرف و فضیلت اور خصوصیات اس بیت مکرم کعبہ کی وجہ سے حاصل ہوئیں۔ اس بیت کے چند نام ہیں:

۱۔ بیت:

خداوند متعال نے قرآن کریم میں ۱۶ مقامات پر اس گھر کا بیت کے نام سے ذکر فرمایا ہے، دو مرتبہ خدا نے اس گھر کو خود اپنی طرف نسبت دی ہے: (حج ۱۲۶ اور بقرہ ۱۲۵) ایک جگہ حضرت ابراہیم - نے اس گھر کو خدا کی طرف نسبت دی ہے: (ابراہیم ۳۷) تین مقامات پر خداوند عالم نے اس گھر کو لوگوں کی طرف نسبت دی ہے: (آل عمران ۹۶، مائدہ ۹۷، بقرہ ۱۲۵) اور دس جگہوں پر خداوند عالم نے بغیر نسبت کے اس کا ذکر فرمایا ہے۔

۲۔ بیت عتیق:

سورۃ حج کی آیت ۳۲ اور ۳۹ میں اس گھر کو ”بیت عتیق“ کہا گیا ہے۔ اس کو بیت عتیق

کہنے کی چند وجوہات ہیں:

(۱) عتیق: آزادی کو کہتے ہیں۔ چنانچہ ”عنق الرقبہ“ کے معنی ہیں غلام آزاد کرنا۔

خداوند عالم نے روزِ اول ہی سے اس گھر کو بندوں کی ملکیت سے آزاد قرار دیا ہے اس لئے اسے بیت عتیق کہتے ہیں۔ اس گھر کے ارد گرد جتنے بھی گھر ہیں وہ کسی کی ملکیت میں شمار نہیں ہوتے بلکہ وہ سب اس گھر کے حریم ہیں۔ ان کو کعبہ میں شامل کرنے کے لئے ان کے مالکان سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں۔

آزادی کے مفہوم کے لحاظ سے اسے ”بیت عتیق“ اس لئے بھی کہا گیا ہے کہ جو شخص اس گھر کا طواف کرتا ہے خداوند عالم اسے جہنم کی آگ سے آزاد فرماتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ گھریا ش، سیلاب اور طوفانِ نوح وغیرہ سے محفوظ اور آزاد رہا۔

(۲) خداوند عالم نے اس گھر کو ظالم اور جاہلوں کی دستبرد سے محفوظ اور آزاد رکھا۔ جس نے بھی اس گھر کے خلاف بُری نیت کی اور اس کی حرمت کو بر باد کرنا چاہا خدا نے اسے ہلاک کر دیا جیسا کہ اسف بن یعلیٰ، نائلہ بنت زید، تیج حمیری اور اصحابِ فیل کے واقعات سے ظاہر ہے۔

(۳) اس کے علاوہ ”عتیق“ کے معنی قدیم کہنہ اور پرانا بھی ہیں۔ چونکہ یہ گھر سب سے قدیم حثی زمین و آسمان سے بھی قدیم اور پرانا ہے اسلئے اسے ”بیت عتیق“ کہتے ہیں جیسا کہ سورۃ آل عمران میں ہے:

﴿ان اول بیت وضع للناس للذی ببکہ﴾ ”لوگوں (کی عبادت) کے واسطے

جو گھر سب سے پہلے بنایا گیا وہ تو یقیناً یہی (کعبہ) ہے“

۳۔ مسجد الحرام

اس گھر کا تیسرا نام مسجد الحرام ہے۔ اس کو مسجد الحرام اس لئے کہتے ہیں کہ یہاں مشرکین کا داخلہ حرام ہے۔

۴۔ کعبہ

اس گھر کا چوتھا نام کعبہ ہے۔ اس گھر کو کعبہ کہنے کی توجیہ میں مفسرین کہتے ہیں کہ کعبہ چار گوشوں کو کہتے ہیں۔ چونکہ اس گھر کے چار گوشے ہیں اس لئے اسے کعبہ کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ کسی بلندی کو بھی کعبہ کہتے ہیں۔ مثلاً پاؤں کی ابھری ہوئی ہڈی کو کعبہ کہتے ہیں یہ گھر چونکہ بلند مقام و منزلت رکھتا ہے اس لئے اسے کعبہ کہتے ہیں۔

سورہ مبارکہ مائدہ کی آیت ۱۹۵ اور ۹۷ میں کعبہ کا ذکر ہوا ہے۔

علل الشرائع میں ہے کہ امام جعفر صادق - سے پوچھا گیا کہ کعبہ کو کعبہ کیوں کہتے ہیں تو آپؑ نے فرمایا کہ کعبہ چار گوشہ ہے اس لئے اسے کعبہ کہتے ہیں۔ پوچھا گیا کہ کعبہ کیوں چار گوشہ ہے تو آپؑ نے فرمایا کہ یہ بیت المعمور کے عین نیچے ہے اور چونکہ بیت المعمور چار گوشہ ہے اس لئے یہ چار گوشہ ہے پوچھا گیا کہ بیت المعمور کیوں چار گوشہ ہے تو آپؑ نے فرمایا کیونکہ یہ عرش کے نیچے ہے اور عرش چار گوشہ ہے اس لئے بیت المعمور چار گوشہ ہے پھر پوچھا گیا کہ عرش کیوں چار گوشہ ہے تو آپؑ نے فرمایا کہ اسلام کی بنیاد چار کلمات پر ہے اور وہ چار کلمات تسبیحاتِ اربعہ ہیں۔

امام سے منقول ہے کہ حضرت ہودؑ پیغمبر کے پاس آ کر لوگوں نے بہت سے سوالات کئے ان سوالات میں سے ایک سوال یہ بھی تھا کہ کعبہ کو کعبہ کیوں کہتے ہیں تو انہوں نے جواب دیا کہ یہ دنیا کے وسط میں ہے اس لئے اسے کعبہ کہتے ہیں۔

امام جعفر صادق - سے کسی نے کہا کہ ایمان اور اسلام میں کیا فرق ہے تو آپؑ نے فرمایا کہ ایمان اور اسلام کی مثال کعبہ اور حرم کی مثال ہے جو کعبہ میں ہے وہ حرم میں ہے اور جو حرم

میں ہے وہ کعبہ میں نہیں ہے۔

امام صادق - سے ہی مروی ہے کہ خداوند عالم نے روئے زمین میں سے مکہ کو منتخب کیا، مکہ سے مسجد کو منتخب کیا اور مسجد سے کعبہ کو منتخب کیا۔

کعبہ کی تفسیر میں آئمہؑ نے فرمایا کہ ”ہم آئمہ کعبہ ہیں“۔

امام سجاد - نے فرمایا کہ علیؑ وہ کعبہ ہیں جن کی طرف متوجہ ہونے کا لوگوں کو حکم دیا گیا اور کہا گیا کہ اس دنیا میں ان کی اقتدا کرو۔ جس طرح مشرکین کی روگردانی سے کعبہ کی عظمت و شرافت میں کوئی فرق نہیں پڑتا اسی طرح لوگوں کی علیؑ سے روگردانی اور ان کو پیچھے کرنے سے ان کی بزرگی، عظمت اور شرافت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

آئمہؑ کو کعبہ کا مصداق قرار دینا لفظی اعتبار سے بھی درست ہے کیونکہ لغت میں علو اور بلندی کو کعبہ کہتے ہیں اور آئمہؑ اپنی عظمت و بزرگی میں ایک بلند مرتبہ رکھتے ہیں۔ (مقدمہ تفسیر برہان ص ۲۹۵)

کعبہ کی مثال ایسے ہی ہے جیسے انسانی وجود میں اس کا ”دل“۔ جب تک دل باقی ہے انسان کا وجود باقی ہے اور اگر دل کام کرنا چھوڑ دے تو آدمی ختم ہو جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح مسلمانوں کی بقاء کا دار و مدار کعبہ پر ہے چنانچہ روایات میں آیا ہے کہ اسلام اس وقت تک باقی ہے جب تک کعبہ باقی ہے۔

اس گھر کی خصوصیات

اس گھر کی چند خصوصیات ہیں:

پہلی خصوصیت

معبداور جائے پرستش کے لحاظ سے یہ سب سے پہلا گھر ہے جیسا کہ سورہ آل عمران کی

آیت ۹۶ میں ہے:

﴿ان اول بیت وضع للناس للذی ببکۃ مبارک وھدی للعالمین﴾ ”لوگوں (کی عبادت) کے واسطے جو گھر سب سے پہلے بنایا گیا وہ تو یقیناً ہی (کعبہ) ہے“

دوسری خصوصیت

یہ گھر تمام جہانوں کے لئے رہنما ہے، جیسا کہ سورۃ آل عمران کی آیت میں ہے:

﴿ان اول بیت وضع للناس للذی ببکۃ مبارک وھدی للعالمین﴾ ”لوگوں (کی عبادت) کے واسطے جو گھر سب سے پہلے بنایا گیا وہ تو یقیناً ہی (کعبہ) ہے جو مکہ میں بڑی (خیر و) برکت والا اور سارے جہان کے لوگوں کا رہنما ہے“

تیسری خصوصیت

جیسا کہ سورۃ آل عمران کی اوپر بیان کی گئی آیت میں ہے کہ ”یہ گھر خیر و برکت والا ہے

“

لفظ برکت مصدر ثلاثی مجرد ہے۔ اس کا مادہ برک (ب ر ک) ہے جو مختلف ابواب اور مختلف صیغوں میں مجموعی طور پر قرآن کریم کی بائیس سورتوں میں بتیس جگہوں پر آیا ہے۔

خداوند عالم نے اس صیغہ کو مندرجہ ذیل آیات میں خود اپنی ذات کے لئے استعمال

فرمایا ہے:

سورۃ اعراف ۵۴، مومنون ۱۴، فرقان ۱۰، مومن ۶۴، زخرف ۵۷، ملک ۱۔

قرآن کریم میں یہ صیغہ درج ذیل آیات میں خود قرآن کیلئے استعمال ہوا ہے:

سورۃ النعام ۹۲، انبیاء ۵۰، ص ۲۹۔

جن پیغمبروں کے لئے قرآن کریم میں یہ صیغہ استعمال ہوا ہے ان کی تفصیل اس طرح

ہے:

(۱) حضرت نوح -

سورۃ ہود ۲۸، مومنون ۲۹۔

(۲) حضرت ابراہیمؑ اور حضرت ائیلؑ

سورۃ ہود ۲۸، صافات ۱۱۳۔

(۳) حضرت عیسیٰ -

سورۃ مریم ۳۱۔

اس کے علاوہ کعبہ کیلئے یہ صیغہ قرآن کریم کے سورۃ آل عمران کی آیت ۹۶ میں اور مسجد اقصیٰ کے لئے سورۃ بنی اسرائیل کی آیت میں استعمال ہوا ہے۔

اس کے علاوہ جن جن چیزوں کو خداوند عالم نے مبارک قرار دیا ہے ان کی تفصیل یہ

ہے:

(۱) طور: سورۃ مبارکہ قصص ۳۰۔ (۲) زیتون: سورۃ مبارکہ نور ۳۵۔ (۳) شب

قدر: سورۃ مبارکہ دخان ۳۱۔ (۴) پانی: سورۃ مبارکہ ق ۹۔

پانی آسمانی برکت ہے جب کہ زمینی برکتیں بنزیاں پھل، میوہ جات اور اجناس وغیرہ

ہیں۔

برکت کی معنی ہیں جمع ہونا، زیادہ ہونا اور بقاء و دوام۔ اسی لحاظ سے حوض کوبرک کہتے

ہیں۔

کعبہ کو مبارک کہنے کی توجیہ یہ ہے کہ مکہ میں مسلسل ارزاق باہر سے آتے ہیں جیسا کہ

سورۃ قصص کی آیت ۵۷ میں ہے۔

زیادہ ہونے کے مفہوم کے لحاظ سے کعبہ کو مبارک اس لئے کہتے ہیں کہ یہاں بجالائی

جانے والی عبادات نماز، تلاوت قرآن، صدقہ، وغیرہ دوسری جگہوں کے مقابلہ میں کئی گنا فضیلت

رکھتی ہیں۔ دوام و بقاء کے مفہوم کے لحاظ سے اسے مبارک اس لئے کہتے ہیں کہ یہ گھر ہمہ وقت طواف نماز و رکوع و سجود کا مرکز رہتا ہے۔

### چوتھی خصوصیت

کعبہ جائے قیام ہے چنانچہ خداوند عالم فرماتا ہے:

﴿جَعَلَ اللَّهُ الْكَعْبَةَ لِلْبَيْتِ الْحَرَامِ قِيَامًا لِلنَّاسِ﴾ ”خداوند عالم نے اپنے محترم

گھر کعبہ کو لوگوں کے لئے جائے قیام بنایا ہے“ (مائدہ ۹۷)

قرآن کریم میں لفظ قیام بہت سے معنوں میں استعمال ہوا ہے جن میں چند یہ ہیں:

(۱) کسی کام میں مصروف ہونا: جیسا کہ سورہ مزمل کی آیت ۲۰ میں ہے۔

(۲) کسی امر کے یا کسی خاص بات کے واقع ہونے کے معنوں میں بھی یہ لفظ استعمال

ہوا ہے جیسا کہ سورہ روم کی آیت ۱۱۲ اور ۱۴ میں ہے۔

(۳) قائم کرنے کے معنوں میں بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے جیسا کہ سورہ بقرہ کی آیت

۱۳ اور ۲۳ میں ہے۔

(۴) سورہ مبارکہ مائدہ کی آیت ۶ میں یہ لفظ عزم و ارادے کے معنوں میں استعمال

ہوا ہے۔

(۵) قائم اور دائم ہونے کے معنوں میں بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے جیسا کہ سورہ روم کی

آیت ۲۵ میں ہے۔

لفظی اعتبار سے تو لفظ قیام بیٹھنے کی ضد کو کہتے ہیں لیکن درحقیقت یہ رکود و جمود کی ضد ہے

۔ انسانی زندگی میں جمود نہ صرف انسان کے مقصد حیات کی موت ہے بلکہ رفتہ رفتہ یہ پورے

معاشرے کی اجتماعی اقتصادی اور سیاسی موت پر منتج ہوتا ہے۔ چنانچہ بندگانِ خدا اور صالحین کی یہ

سنت رہی ہے کہ وہ معاشرے میں پھیلے ہوئے فساد اور لوگوں کے جمود کو ٹوڑنے کے لئے قیام

کرتے رہے ہیں۔

جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ یہ قیام کس کے لئے اور کس کے خلاف ہوتا ہے

تو صالحین اور خدا کے نیک بندوں کا قیام ہمیشہ مخلوقِ خدا کے لئے اور مخلوقِ خدا میں پھیلے ہوئی

فساد اور برائیوں کے خلاف ہوتا ہے۔ انسانی معاشرے میں عموماً معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی تین

ہی قسم کی برائیاں پیدا ہوتی رہتی ہیں، اس لئے قیام کی بھی عموماً تین ہی اقسام ہوتی ہیں:

(۱) اجتماعی قیام۔ (۲) اقتصادی قیام۔ (۳) سیاسی قیام۔

### (۱) اجتماعی قیام

یہ قیام انسانی معاشرے میں موجود اس سسٹم اور نظام کے خلاف ہوتا ہے جس کی

برائیوں اور خرابیوں سے معاشرہ دوچار ہے مثلاً اگر معاشرہ طبقاتی کشمکش اور عدم مساوات

کا شکار ہے، وہ اپنی فطری جائز اور شرعی آزادی اور حریت سے محروم ہے، بد امنی، طبقہ بندی

اور امتیاز و امتیاز کا دور دورہ ہے تو ضروری ہے کہ اس سسٹم اور نظام کو بدلنے اور اس سے بہتر نظام

لانے کے لئے خدا کا کوئی نیک بندہ اٹھے اور اس نظام کے خلاف اور معاشرے کی فلاح کے لئے

قیام کرے۔

### (۲) اقتصادی قیام

اگر کسی معاشرے میں دولت، ثروت اور سرمایہ کی تقسیم غیر منصفانہ ہو، دولت

چند ہاتھوں میں سمٹ کر آگئی ہو، کوئی گروہ اتنی دولت جمع کر لے کہ اسے رکھنے کیلئے جگہ نہ ہو جب

کہ اکثریت فقروں و فاقہ میں مبتلا ہو، وقت کی روٹی کی بھی محتاج ہو اور محرومیت کا شکار ہو تو اس

صورتِ حال کو ختم کر کے دولت کی منصفانہ تقسیم افراد کی حیات کا بندوبست کرنے کی کوشش

وجہ و جہد کا نام قیام اقتصادی ہے۔

### (۳) سیاسی قیام

کوئی ملک اور اس کا نظام اگر نااہل افراد کے ہاتھوں میں آجائے جہاں متفقہ عدلیہ، بحریہ یہاں تک کہ سربراہ مملکت بھی اہلیت اور صلاحیت سے عاری ہوں، قومیت، گروہ بندی اور طاقت کے بل بوتے پر کرسی اقتدار حاصل کرنے کی رسم جڑ پکڑ چکی ہو تو اس ملک کے کمزوروں، ناتوانوں اور مستضعفین کی نجات کیلئے ملک کے آمروں کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کا نام قیام سیاسی ہے۔

یہ حقیقت کسی وضاحت کی محتاج نہیں، اظہر من الشمس ہے کہ اجتماعی اور اقتصادی قیام کے مطلوبہ نتائج سیاسی قیام کے بغیر برآمد نہیں ہو سکتے۔ اجتماعی اور اقتصادی اصلاحات ایک صالح نظام کے سائے میں ہی ممکن ہیں چنانچہ سورہ مائدہ کی آیت ۶۶، جن ۱۶، اعراف ۱۹۶ اس حقیقت کی شاہد ہے۔

کسی محدود علاقہ اور محدود قبیلہ میں چند افراد کے درمیان امن و امان قائم کرنا اور ان کو روزگار فراہم کرنا ممکن ہے آسان ہو لیکن پوری مملکت یا پوری دنیا کی اجتماعی اور اقتصادی اصلاح کیلئے ایک صالح سیاسی نظام کا قیام نہایت ضروری ہے۔ جس میں جہاں حکومت و قیادت اہل باصلاحیت اور صالح ترین افراد کے ہاتھوں میں ہو۔ اس کے بغیر اجتماعی اور اقتصادی خوشحالی ممکن نہیں۔ چنانچہ معاشرے کے اہل فکر و نظر باصلاحیت اور صالح افراد کو چاہیے کہ وہ سیاسی اصلاحات کو ترجیح دیں اور اسے بنیاد بنائیں تاکہ اس کے نتیجے میں اجتماعی اور اقتصادی اصلاحات رونما ہو سکیں۔

چنانچہ اسلامی شریعت میں جو اہمیت، مقام و منزلت اور فضیلت مسئلہ امامت کو حاصل ہے وہ کسی اور مسئلہ کو نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امام حسین نے اس وقت معاشرے میں پھیلی ہوئی اجتماعی، اقتصادی اور سیاسی برائیوں کا جائزہ لے کر اپنے مقدس قیام کی بنیاد سیاسی نظام کی اصلاح کو بنایا کیونکہ ایک بھرپور سیاسی قیام ہی تمام اصلاحات کا ضامن ہو سکتا ہے۔ اپنی الہی مسؤلیت

کا احساس کرتے ہوئے امام اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنے قیام کا آغاز بیت اللہ الحرام کعبہ سے کیا کیونکہ یہی صالحین کے قیام و ہفت کی جگہ ہے جیسا کہ قرآن کریم میں ہے:

﴿جَعَلَ اللَّهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيَمًا لِلنَّاسِ﴾

جہاں تک امام کے اجتماعی قیام کا تعلق ہے تو آپ نے مکہ چھوڑنے کے اپنے اقدام سے حجاج پر واضح کیا:

”لوگو! اس بات کو اچھی طرح سمجھ لو کہ جو حکومت بیت اللہ الحرام میں حجاج اور خدا کے مہمانوں کو امن و امان اور تحفظ نہیں دیتی اس سے مملکت اسلامی اور عامۃ المسلمین کے امن و امان کی ضمانت اور حفاظت کی توقع نہیں کی جاسکتی“

آپ کا بار بار یہ فرمانا کہ ”اگر میں یہاں سے نہ نکلوں تو یہ لوگ مجھے قتل کر دیں گے.....“ اسی مسئلہ یعنی قیام اجتماعی کی ضرورت کی طرف لوگوں کی توجہات مبذول کرانے کے سلسلے کی کڑی تھا۔

وادی تعینم میں یزید کیلئے لے جائے جانے والے تحفہ و تحائف پر قبضہ کر کے انہیں مستحق اور ضرورت مندوں کا حق قرار دینا اس امر کی دلیل ہے کہ غاصب حکمران معاشرے میں اقتصادی بد حالی کے بھی ذمہ دار ہیں اس کو لگام دینا اور ان کی اقتصادی ناکہ بندی کرنا ضروری ہے۔

جہاں تک آپ کے سیاسی قیام کے اقدامات کا تعلق ہے تو آپ نے مکہ پہنچتے ہی خط و کتابت کا سلسلہ شروع کیا اور سیاست اور خلافت یزید کو اپنی بحث و گفتگو کا محور قرار دیا۔

### پانچویں خصوصیت

خانہ کعبہ کی پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ یہ مرکب امن ہے۔ امن اجتماعی مسائل میں ایک عالمی مسئلہ ہے آئمہ نے اپنے روایات میں اسے ایک نعمت مجہولہ قرار دیا ہے۔ نعمت مجہولہ اس نعمت کو کہتے ہیں جس کی لوگ قدر نہیں کرتے، جس کی قدر و قیمت کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے

جب یہ نعمت خدا نخواستہ چھین جائے۔ دنیا کے تمام ادیان اور مذاہب کے مقابلے میں اجتماعی امن کی اہمیت کو جتنا اسلام نے اجاگر کیا ہے اتنا کسی اور مذہب نے نہیں کیا۔ اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ قرآن کریم کے ستر سوروں میں ۷۲۵ آیات میں ۸۷۹ جگہوں پر مختلف ابواب سے مختلف صیغوں میں امن کا ذکر ہوا ہے۔

خداوند عالم نے اپنے پیغمبروں کو امین اور امن کا پیغمبر کہا ہے چنانچہ حضرت نوحؑ، حضرت ہودؑ، حضرت صالحؑ، حضرت لوطؑ، حضرت شعیبؑ، حضرت موسیٰؑ اور حضرت یوسفؑ کو امین اور امن کا پیغمبر کہا گیا ہے۔ اسکے علاوہ سورہ شعراء کی آیت ۱۹۳ اور سورہ تکویر آیت ۲۱ میں حضرت جبرئیلؑ کو امین کہا گیا ہے۔ سورہ دخان کی آیت ۵۱ میں جنت کو جائے امن کہا گیا ہے۔ سورہ بقرہ کی آیت ۱۲۵، ۱۲۶، آل عمران ۹۷، قصص ۵۷، عنکبوت ۶۷، ابراہیم ۳۵ میں مکہ کو جائے امن قرار دیا گیا ہے۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کعبہ کو جائے امن قرار دینے سے کیا مراد ہے؟ کیا یہ امن تکوینی ہے یعنی جو بھی یہاں پہنچ جائے یا اس سر زمین میں بس جائے وہ خود بخود فقر و فاقہ، چوری، ڈاکہ، قتل و غارتگری، ظلم و تشدد اور ہر قسم کے خطرات سے محفوظ ہو جاتا ہے؟ جب کہ تاریخ بتاتی ہے کہ بہت سے لوگوں کو یہاں امن نصیب نہیں ہوا۔ چنانچہ حجاج بن یوسف اسی مسجد الحرام میں قتل ہوا۔ امام حسینؑ کو قتل ہو جانے کے خوف سے مکہ چھوڑنا پڑا تو پھر کیا یہ امن شرعی ہے؟ یعنی قرآن اور شریعت اسلام نے یہاں رہنے والوں اور یہاں آکر پناہ لینے والوں کے لئے امن کا اعلان کیا ہے؟

یوں تو دوسری جگہوں کی نسبت یہاں ایک طبعی اور تکوینی امن موجود ہے جسے سب محسوس کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ شریعت اسلام نے تمام پناہ لینے اور رہنے والوں کے لئے امن کا شرعی حکم دیا ہے۔ سوائے ان لوگوں کے جو اس سر زمین پر جرم کریں اور اس گھر کی حریم حرمت

کریں۔ اگر کوئی شخص اس امن کو چھیننے اور اس کو خطرے میں ڈالنے کا مرتکب ہو تو وہ شریعت اسلام کے تحت سزا اور عتاب کا مستحق قرار پائے گا۔ خلیفۃ المسلمین یا امیر حج جو حاجیوں کے لئے امن و امان کا محافظ اور ضامن ہے اس سزا کے حکم کو نافذ کرنے کا پابند ہے۔

لیکن اگر کوئی خود حکومت اور حاکم ہی جرم کا ارتکاب کریں اس گھر کے امن کو خطرے میں ڈالیں اس گھر سے امن چھین لیں تو پھر یہ ذمہ داری علماء امت کے بیدار افراد اور پوری امت پر عائد ہوتی ہے کہ وہ ایسے حاکم کو ہٹائیں تاکہ خانہ خدا کا امن بحال ہو جائے۔ جب کہ ہماری فقہ کی رو سے حقیقی دارالن پیغمبر یعنی آئمہ طاہرینؑ اس فریضے کے ذمہ دار ہیں چنانچہ ۶۰ ہجری میں یہ مسئولیت پیغمبرؐ کے وارث حقیقی حسین بن علیؑ کے کاندھوں پر تھی۔

### کعبہ اور غلاف کعبہ

اس گھر کی بزرگی، شرف اور عظمت کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ خداوند عالم نے اس کو براہی کو حجاب و درحجاب رکھا ہے تاکہ عاشقان الہی اور زائرین بیت اللہ ہر قسم اور ہر مرحلہ پر خشوع و خضوع اور آداب بندگی کے ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے اس گھر سے قریب ہوں۔ کعبہ کے غلافوں کی تفصیل درج ذیل ہے:

### پہلا غلاف

پہلا غلاف غلاف موافیت ہے۔ موافیت میقات کی جمع ہے یہ صیغہ اسم زمان اور اسم مکان دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے چنانچہ حج کیلئے ایک تو میقات زمانی ہے جس کی طرف سورہ بقرہ کی آیت ۱۸۹ میں ارشاد ہوا..... یعنی حج کیلئے ایک مخصوص مہینہ (ذی الحجہ) اور اس کی تاریخیں ہیں ہر موسم اور ہر زمانے میں حج انجام نہیں دیا جاسکتا۔ جب کہ حج و عمرے کیلئے ایک میقات میقات مکانی ہے جس کیلئے پیغمبر اسلام ﷺ کے اقوال و اعمال سند ہیں۔ میقات مکانی سے مراد یہ ہے کہ زائر بیت الہی جب حج و عمرے کی نیت سے گھر سے نکلتا ہے تو اسے کچھ آداب

داصول کی پابندی کرنا پڑتی ہے مثلاً کوئی شخص جب کسی باعظمت ہستی کے حضور پیش ہونا چاہے تو اس کے لئے لازم ہے کہ وہ اس عظیم ہستی کی شخصیت کے مطابق اپنی وضع قطع کو ڈھالے۔ جب اس کے در پر پہنچے تو باادب ہو کر اجازت طلب کرے۔ چنانچہ جب ایک عام انسان کی ملکیت اور حرم میں داخل ہونے سے پہلے صاحب خانہ سے اجازت لینا ضروری ہے اور اس کی اجازت کے بغیر اس کے گھر میں داخل ہونا حرام ہے تو پھر بیعت نبیؐ اور بیعت الہی میں بغیر اذن و اجازت کے داخل ہونے کا کیوں کر تصور کیا جاسکتا ہے لہذا سورہ احزاب کی آیت ۵۳ سورہ نور کی آیت ۶۱۲ میں اس کی سختی سے تاکید کی گئی ہے۔ پھر گھروں میں داخل ہونے کے لئے خدا کا حکم ہے کہ گھروں میں گھر کے دروازے سے داخل ہو جیسا کہ سورہ بقرہ کی آیت ۱۸۹ میں حکم دیا گیا۔

چنانچہ حج بیت اللہ اور عمرے کی نیت سے خانہ خدا کی طرف رخ کرنے والوں کے لئے حکم ہے کہ ان خاص جگہوں (میقات) پر جب پہنچو تو وہاں سے آگے اس وقت تک قدم نہ بڑھاؤ جب تک کہ اپنی وضع قطع کو اس احساس کے ساتھ درست نہ کر لو کہ تم ایک عظیم ہستی کے دربار میں داخل ہونے جا رہے ہو۔ یہاں سے اپنے تمام امتیازات ترک کر دو اپنے فاخرانہ لباس کو اتار دو اور احرام کے فقیرانہ لباس میں سب سے بڑے غنی کے دربار میں حاضر ہونے کی اجازت طلب کرو اور پھر اسکے گھر کی طرف قدم بڑھاؤ۔ چنانچہ میقات وہ پہلا حجاب ہے جہاں سے آگے عام حلیہ میں داخل نہیں ہوا جاسکتا۔ پیغمبر اسلامؐ نے دنیا کے مختلف گوشہ و کنار سے آنے والوں کیلئے جو مواعیت مقرر کئے ہیں وہ یہ ہیں:

(۱) ایک میقات ”مسجد شجرہ“ ہے جسے ذوالحلیفہ کہتے ہیں اور ”ابیار علی“ بھی کہتے ہیں۔ یہ مدینہ سے ۸ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے اور مکہ یہاں سے ۶۳ کلومیٹر ہے۔

(۲) وادی عقیق دوسرا میقات ہے۔ یہ وادی عقیق میں تین جگہ ہے: (۱) مسلخ، (۲) غمر،

(۳) ذات عرق۔ یہ مکہ سے ۹۳ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔

(۳) تیسرا میقات قرن المنازل ہے جو طائف سے آنے والوں کے لئے میقات ہے۔ یہ مکہ سے ۹۰ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔

(۴) چوتھا میقات بلعام ہے جو جبل تہامہ پر ہے اور مکہ سے ۹۳ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔

(۵) بیعتہ۔ یہ مکہ سے ۲۲۰ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔

ہر وہ شخص جو ان مواعیت سے باہر ہو اور حج یا عمرے کی نیت سے یہاں سے گزرے اس کیلئے احرام کے بغیر یہاں سے آگے گزرنا حرام ہے۔ (مزید تفصیل کیلئے مجتہدین کے مناسک حج سے رجوع فرمائیں)

### دوسرا غلاف

دوسرا غلاف دائرہ حرم ہے اس بیعت مکرم کے چاروں طرف خداوند عالم نے ایک نہ ایک نشانی نصب کی ہے جس کے اندر کے علاقہ کو حرم کہتے ہیں جیسے:

(۱) مسجد الحرام سے جو راستہ عرفات کی طرف جاتا ہے وہاں ایک نشانی نصب ہے، مسجد الحرام سے اس کا فاصلہ ۱۸۳۳۳ کلومیٹر ہے۔

(۲) حرم سے معمیں جاتے ہوئے معمیں سے پہلے ایک نشانی نصب ہے جس کا فاصلہ ۶ یا ۶ کلومیٹر بتایا جاتا ہے۔

(۳) حرم سے جدہ کے راستہ میں جو نشانی نصب ہے اس کا فاصلہ مسجد الحرام سے ۱۰ کلومیٹر ہے۔

(۴) اسی طرح حرم سے یمن کے راستہ میں جو نشانی نصب ہے اس کا فاصلہ مسجد الحرام سے ۶ کلومیٹر ہے۔

ان چاروں نشانیوں کے دائرے میں جو علاقہ آتا ہے اسے حرم یا مکہ کہتے ہیں، حرم کے

اس پورے علاقے میں شکار کرنا، درخت کاٹنا، کسی انسان کو پکڑنا منع ہے۔ مندرجہ بالا نشانیاں جو نصب ہیں ان کی بنیادی حیثیت کے بارے میں دو روایات ہیں:

ایک یہ کہ جب حضرت آدم - کوزمین پر اتارا گیا تو وہ حیران اور خوفزدہ ہوئے، شیطان سے ڈرے اور تہائی محسوس کی تو خداوند عالم نے اس بیت مکرم کے گرد دائرہ کھینچا اور وہاں فرشتوں کو مقرر کیا اور آدم سے فرمایا کہ آپ کی حفاظت کیلئے ہم نے فرشتوں کو مقرر کیا ہے۔

دوسری روایت کے مطابق حضرت ابراہیم - نے جب حجر اسود کو نصب کیا تو اس سے چاروں طرف ایک نور پھوٹا اور اس کی شعائیں جہاں جہاں تک پہنچیں اس حد کو دائرہ حرم قرار دیا گیا۔

### تیسرا غلاف

تیسرا غلاف مسجد الحرام ہے۔ مسجد الحرام دنیا بھر کی تمام مساجد کے مقابلہ میں ایک خاص امتیاز اور فوقیت رکھتی ہے بیت المقدس، مسجد کوفہ اور مسجد نبوی سے بھی زیادہ فضیلت رکھتی ہے۔ خداوند عالم نے اس مسجد کا ذکر سورہ بقرہ کی آیات ۱۴۳، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۹۶، ۲۱۷، انفال کی آیت ۳۳، توبہ کی آیات ۱۹، ۲۸، اسراء کی آیت الحج کی آیت ۲۵ اور سورہ فتح کی آیات ۲۵، ۲۷ میں فرمایا ہے۔

دنیا کے گوشہ و کنار سے کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے والوں اور کعبہ کے درمیان ایک طویل فاصلہ حائل ہے لیکن کتنے خوش نصیب ہیں وہ نمازی کہ جنہیں مسجد الحرام میں نماز پڑھنے کی سعادت نصیب ہوتی ہے اور ان کی نظریں خود کعبہ پر پڑتی ہیں۔ مسجد الحرام میں نماز پڑھنے کے بارے میں جب ائمہؑ سے پوچھا گیا کہ مسجد کے کس حصہ میں نماز پڑھیں تو انہوں نے فرمایا کہ حطیم میں نماز پڑھیں اور اگر وہاں ممکن نہ ہو تو مقام ابراہیم میں اس کے بعد حجر اسماعیل میں نماز پڑھیں۔ اس کے بعد جب پوچھا گیا تو فرمایا کہ جس حد تک ممکن ہو کعبہ کے قریب

ہو کر نماز پڑھیں۔ مسجد نبوی میں پڑھی جانے والی ایک رکعت کا ثواب دس ہزار رکعت کے برابر ہے جبکہ مسجد الحرام میں پڑھی جانے والی ایک رکعت کا ثواب دوسری مساجد میں پڑھی جانے والی نماز کے مقابلہ میں ایک لاکھ رکعت کے برابر ہے۔ مسجد الحرام میں باجماعت نماز اگر اسلام کی عظمت و شوکت کے اظہار کی نیت اور دشمنان اسلام پر ہیبت طاری کرنے کے لئے پڑھی جائے تو ایسی نماز کی عظمت و فضیلت کا اندازہ انسانی عقل اور اعداد و شمار کے دائرے میں نہیں آ سکتا۔ لیکن کتنے افسوس کا مقام ہے کہ ہمارے بعض کج فکر اور خشک مزاج مذہبی علماء نادان عوام کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے نہ صرف یہ کہ انہیں مسجد الحرام میں نماز جماعت میں شامل ہونے اور واجب نمازیں وہاں پڑھنے کی تشویق نہیں دلاتے بلکہ انہیں اپنے قول و فعل کے ذریعہ مسجد سے باہر نماز پڑھنے کی ترغیب دیتے ہیں اور اس کا جواز پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ باہر باجماعت نماز پڑھنا حرم میں فراہمی نماز پڑھنے سے بہتر ہے، جبکہ جب ایک مرتبہ امام رضا - سے بزنطی نے پوچھا کہ اپنی رہائش گاہ پر باجماعت نماز پڑھنا بہتر ہے یا مسجد الحرام میں فراہمی تو امام نے فرمایا کہ مسجد الحرام میں فراہمی پڑھنا بہتر ہے۔ نیز مسجد الحرام میں دیگر مسلمانوں کے ساتھ باجماعت نماز ادا کرنا بذات خود کئی گنا فضیلت اجر و پاداش رکھتا ہے۔

### چوتھا غلاف

چوتھا غلاف 'غلاف کعبہ' ہے۔ یہ غلاف کعبہ اس لئے ہے کہ بندہ کو یہ احساس رہے کہ وہ اپنے مولود آقا کے حضور ایک فقیر کی حیثیت سے حاضر ہے اور جس طرح ایک حقیر اور عاجز فقیر اپنے آقا کے دامن سے لپٹ کر دست سوال بلند کرتا ہے اور اس کے بدن کو ہاتھ لگانا جسارت اور سوائے ادب سمجھتا ہے اسی طرح بندہ غلاف کعبہ کو تھا متا ہے اور دیوار کعبہ کو ہاتھ لگانے کی جسارت نہیں کرتا۔

### پانچواں غلاف

پانچواں غلاف 'غلافِ عظمت و ہیبت' ہے۔ رب کعبہ نے اپنے اس گھر کو ایک عظیم ہیبت و جلال سے نوازا ہے۔ دیکھنے والا اس پر نظر کر کے تھک جاتا ہے لیکن اس گھر کی عظمت و ہیبت کی انتہا کو نہیں پہنچ پاتا۔ چنانچہ مسجد الحرام کی مخصوص عبادات میں سے ایک عبادت کعبہ پر نظر کرنا ہے۔



### مکہ کی اسلامی سیاسی تاریخ

مکہ کی اسلامی سیاسی تاریخ کا باقاعدہ آغاز ۸ ہجری سے ہوا۔ اگرچہ اسلام کی دعوت کا آغاز اسی مقدس سرزمین سے ہوا تھا لیکن وہاں کے اس وقت کے مشرک حاکموں نے اس دعوت کو کئی شدید مخالفت کی اور پیغمبر اسلامؐ اس قدر اذیتیں دیں کہ آپؐ ہجرت پر مجبور ہو گئے۔ بالآخر ۸ ہجری میں فتح مکہ کے بعد یہاں اسلامی حکومت قائم ہوئی۔ شام کی مانند یہاں بھی پہلے مسلم گورنر کا تعلق اموی خاندان سے تھا۔ اس والی کا نام عتاب اسید بن ابی العیص بن امیہ بن عبد القیس بن عبد مناف تھا اس کی کنیت ابو عبد الرحمن یا ابو محمد کی تھی اس وقت اس کی عمر ۲۰ سال تھی۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ذہین اور زیرک شخص تھا۔ تاریخ میں ملتا ہے کہ جب فتح مکہ کے بعد صحابی رسولؐ حضرت بلال حبشیؓ نے کعبہ پر چڑھ کر اذان دی تو جن لوگوں نے اس موقع پر نفرت و انزجار کا مظاہرہ کیا ان میں عتاب بن اسید بھی شامل تھا۔ اس نے اس نفرت کا مظاہرہ ان الفاظ میں کیا کہ آج کے دن خدا نے میرے باپ اسید کو اس کالے کی آواز سننے سے محفوظ رکھا۔

پیغمبر اسلامؐ کی رحلت کی خبر سن کر عتاب بن اسید روپوش ہو گیا تا کہ خلافتِ نبیؐ کے سلسلے میں کسی قسم کے اظہار رائے سے محفوظ رہ سکے اور جب تک اسے اپنے خاندان کی جانب سے مدینہ سے ہدایت موصول نہیں ہو گئی ظاہر نہیں ہوا۔

عتاب حضرت ابو بکر کے دور میں بھی والیٰ مکہ رہا اس کی وفات عین اسی دن ہوئی جس دن حضرت ابو بکر نے وفات پائی۔ اس کے بعد سن ۳۶ ہجری تک مکہ پر متعدد دوالیٰ فائز رہے۔ ۳۶ ہجری کے بعد جب حضرت علیؑ - مسندِ خلافت پر بیٹھے تو آپؑ نے حضرت عثمان کی طرف سے منسوب مکہ کے گورنر خالد بن عاص بن ہشام کو برخواست کر کے اس کی جگہ پطرا بوقنادہ انصاری کو نصب کیا، کچھ ہی عرصہ بعد انہیں ہٹا کر ان کی جگہ قثم بن عباس کو والیٰ مکہ معین کیا۔ یہ حضرت علیؑ کی شہادت تک اس منصب پر فائز رہے۔ ۶۰ ہجری میں جب امام حسینؑ مکہ تشریف لائے تو اس وقت عمرو بن سعید اشدق مکہ کا گورنر تھا۔

### فتح مکہ ۸ھ سے ۶۰ھ تک رہنے والے دلیان مکہ کی فہرست

۸ ہجری	عتاب بن اسید امیہ۔
۱۳ ہجری	الحارث بن حارثہ قسطنطین بن عمیر بن جدعان، فافع بن الحارث
	خزاعی، خالد بن العاص بن ہشام بن المغیرہ، احمد بن خالد طارق بن مرتفع، الحارث بن نوفل القرشی۔
۲۳ ہجری	علی بن عدی بن ربیعہ الحارث بن نوفل القرشی، عبد اللہ بن خالد بن اسید، خالد بن العاص بن ہشام، عبد اللہ بن عامر خضرمی، نافع بن الحارث خزاعی۔
۳۶ ہجری	ابوقنادہ الانصاری، القثم بن عباس۔
۳۹ ہجری	عتبہ بن ابی سفیان، مروان بن الحکم، سعید بن العاص، عمرو بن سعید المعروف بالاشدق، خالد بن العاص مخزومی، عبد اللہ بن خالد بن اسید۔
۶۰ ہجری	عمرو بن سعید الاشدق۔

(نوٹ) معاویہ اپنے دورِ خلافت میں مدینہ میں بار بار کبھی مروان اور کبھی سعید اشدق کو گورنر مقرر کرتا تھا کیونکہ یہ دونوں پیغمبرؐ اور ان کے اہل بیتؑ سے سخت عناد رکھتے تھے

- سعید اشراق جب مدینہ کا گورنر بنا تو اپنے بیٹے عمر کو مکہ میں اپنا نمائندہ مقرر کرنا تھا۔ (نقل از تاریخ توہم ج ۶، ص ۱۴۰)

### امام حسینؑ اور مکہ

امام حسینؑ - مدینہ مدینہ میں پیدا ہوئے وہیں پلے بڑھے اور پروان چڑھے۔ اسی مدینہ میں آپؑ نے عزت و شرافت کی زندگی گزاری۔ انصار و مہاجرین کے نزدیک مدینہ میں اس وقت سب سے محبوب و محترم شخصیت امام حسینؑ ہی تھے۔ یہاں آپؑ کا گھر تھا اہل و عیال تھے عزیز واقربا تھے آپؑ کے جد بزرگوار پیغمبر اسلام ﷺ کا روضہ تھا آپؑ کی مادر گرامی جناب زہرا = اور آپؑ کے برادر عزیز امام حسنؑ کی قبور مطہرہ تھیں۔ مدینہ شہر تھا کہ جہاں آپؑ کے جد بزرگوار نے مکہ میں خطرہ لاحق ہونے کے بعد ہجرت کی اور پناہ حاصل کی۔ جب کہ مکہ وہ جگہ تھی کہ جہاں آپؑ کے جد گوارا حلقہ بگوش اسلام ہونے والوں کو طرح طرح کی اذیتیں دی گئیں اور مجبور ہو کر آپؑ کو مدینہ ہجرت کرنا پڑی۔ ہجرت کے بعد اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کے خلاف جنگ کرنے کے لئے مسلسل دس سال تک ابوسفیان کی قیادت میں دشمنان اسلام اسی مکہ سے نکلتے رہے۔ ہاں ابوسفیان اور اس کے پیروکاروں نے مجبوری اور شکست کے عالم میں اسلام قبول کر لیا تھا لیکن پیغمبر اسلامؐ کو ان کے دلوں سے جاہلیت کی جڑوں اور اس کے آثار کو صاف اور تطہیر کرنے کا موقع نہیں مل سکا اور نہ ہی آپؑ کو مکہ میں اپنے اہل بیتؑ کے لئے فدائیوں اور شیدائیوں کا کوئی حلقہ بنانے کا موقع مل سکا۔

ان حالات میں بنی امیہ کی طرف سے اپنے قتل کا حتمی فیصلہ سننے کے بعد امام حسینؑ کا مکہ کی طرف رخ کرنا اور مکہ کی سرزمین کو اپنے لئے وطنِ ثانی کے طور پر انتخاب کرنا ایک ایسا مسئلہ ہے کہ جو سوالیہ نشان بن کر ذہنوں میں ابھرتا ہے خصوصاً جب کہ یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ مکہ بھی اسی طرح بنی امیہ کی حکومت کی عملداری میں تھا جس طرح مدینہ۔ پھر کسی ہدف

و مقصد کے تحت اگر آپؑ نے مکہ کا انتخاب فرمایا تھا تو عین اس وقت کہ جب ایام حج میں کہ عالم اسلام کا مرکز بنا ہوا تھا آپؑ اپنے اس ہدف کو پس پشت ڈال کر ایک ہنگامی عالم میں اس شہر کو چھوڑ کر نکلے؟ اپنے مقدس قیام کے لئے سرزمین مکہ کا انتخاب کرنا پھر یکا یک عین حج کے موقع پر اس شہر کو ہنگامی حالات میں چھوڑنا ایسے پیچیدہ مسائل ہیں جو خود ایک بہت بڑے سوالیہ نشان کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ان سوالات کو حل کرنے اور حقائق تک پہنچنے کیلئے ضروری ہے کہ ہم ریاضی کے دو اور دوچار کے اصولوں پر تاریخی واقعات کا وقت نظر سے تجزیہ کریں اور اس تجزیہ میں عام افراد کی نفسیات اسلام اور قرآن کے تقاضوں اور خانوادہ پیغمبرؐ کے پروردہ حسینؑ جیسی شخصیت کی سیرت و کردار کو پیش نظر رکھیں۔ چنانچہ ایسے حالات میں کہ جب بنی امیہ کی ظالم حکومت کی طرف سے اس جاہر حکومت کو تسلیم کرنے یا دوسری صورت میں قتل کئے جانے کا حتمی فیصلہ صادر ہو چکا ہو تو اس سے نمٹنے اور اس کے مدارک کے لئے رد عمل کا انحصار انسان کی بنیادی سوچ اور فکر پر ہے۔ ایسے حالات میں ہر انسان اپنی راہ کا تعین ان بنیادوں پر کرے گا کہ جن افکار اور ضابطہ حیات کے اصولوں کو اس نے اپنی زندگی میں اپنایا ہے اور جن افکار اور اصولوں پر وہ پروان چڑھا ہے۔ اصول و افکار کی بنیاد پر انسانی معاشرے کی تقسیم بندی کچھ اس ہو سکتی ہے:

### پہلی قسم

وہ افراد جو دنیا طلب ہیں اور جن کے دلوں میں حب دنیا رچی بھی ہوئی ہے۔ ایسا شخص جس کے دل میں دنیا کی محبت جاں گزیر ہے وہ چاہے ظاہری طور پر دینداری اور دینتداری کا مظاہرہ کرے لیکن ایسے مشکل حالات میں کہ جب اس کی زندگی خطرے میں ہو وہ وہی فیصلے کرے گا:

(۱) ایک یہ کہ وہ حالات سازگار ہونے تک روپوشی اختیار کرے تاکہ حاکم کے غیظ

وغضب سے خود کو محفوظ رکھ سکے۔ ایسے لوگوں کیلئے کہ جو حیاتِ اخروی پر یقین نہیں رکھتے اور دنیاوی زندگی ہی کو اول و آخر سمجھتے ہیں روپوشی کی زندگی یقیناً بہت بڑی غنیمت ہے یا پھر.....

(۲) ایسا شخص روپوشی اختیار نہ کر سکے یا نہ کرے تو ان مشکل حالات میں وہ اپنی اس چند روزہ زندگی کو مقدم رکھتے ہوئے اس جاہر حکومت کے سامنے سرنگون ہو کر ذلت و خواری کا طوق پہن لینا گوارا کر لے گا کیونکہ اس کی بنیادی سوچ و فکر کا محور چہ دنیا اور حیاتِ دنیا ہی ہے۔

### دوسری قسم

دوسری قسم کے لوگ وہ ہیں جو دنیاوی زندگی کے مقابلہ میں تو آخرت کے طلب گار ہیں اور اخروی زندگی کو دنیاوی زندگی پر ترجیح دیتے ہیں لیکن اپنے لئے کسی اجتماعی ذمہ داری اور مسئولیت کا احساس نہیں رکھتے۔ ایسے لوگوں کے لئے دنیاوی زندگی یا جلد مرنا یا دیر سے مرنا کوئی معنی نہیں رکھتا بلکہ وہ طبعی موت کے مقابلہ میں شہادت کو اپنے لئے اختیار سمجھتے ہیں۔ لہذا ان کے پیش نظر صرف وہی چیزیں ہوتی ہیں..... ”حیات“ یا ”شہادت“۔

### تیسری قسم

تیسری قسم میں وہ لوگ آتے ہیں جو باہد ف ہیں، لیکن کسی ہدف کو اپنانے کی غرض یہ نہیں کہ ان کا مقصود و مطلوب ”زندگی“ ہے بلکہ وہ زندگی اور زندہ رہنا اس لئے چاہتے ہیں تاکہ وہ اپنے ہدف تک پہنچ سکیں۔ ان کے اہداف ان کے ذاتی مفادات بھی نہیں ہوتے بلکہ ان کے اہداف اجتماعی ہیں اور وہ شرعی، اجتماعی اور سیاسی مسئولیت رکھتے ہیں۔ وہ اپنی زندگی کا تمام تر مقصد اپنی مسئولیت کی ادائیگی ہی میں سمجھتے ہیں۔



ان وضاحت کے بعد ہم امام حسینؑ کی سیرت و کردار اور روش کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اپنی مخصوص طبیعت و مزاج، طرز فکر اور زندگی کے وہ اصول و ضوابط جو اسلام

قرآن اور پیغمبر ختمی مرتبتؐ کے سائے اور خالص الہی ماحول میں آپؑ نے اپنائے۔ ان کی روشنی میں آپؑ کا ردِ عمل اور لائحہ عمل کیا ہونا چاہیے تھا:

(۱) امام حسینؑ اگر (معاذ اللہ) دنیا طلب اور جاہ طلب انسان ہوتے تو ان سنگین حالات میں یا تو آپؑ روپوشی اختیار کر لیتے یا پھر آپؑ کو یزید کی بیعت کر لینا چاہیے تھی اور یزید کو بھی اگر یہ عندیہ مل جاتا کہ آپؑ اس کی حکومت کے خلاف قیام نہیں کریں گے تو یقیناً یہ اس کے لئے باعثِ افتخار ہوتا۔ اس صورت میں نہ صرف وہ آپؑ سے کوئی تعارض نہیں کرتا بلکہ آپؑ کو عزت و مقام بھی دیتا۔ اس صورت میں امام حسینؑ کی زندگی تو یقیناً محفوظ ہو جاتی لیکن یزید کی فاسق اور جاہر حکومت کے لئے ایک شرعی اور قانونی جواز حاصل ہو جاتا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ امام حسینؑ یہ راہ اختیار نہیں کیونکہ وہ دنیا طلب تھے نہ جاہ طلب۔

(۲) اگر امام حسینؑ کا شمار (معاذ اللہ) دوسری قسم کے لوگوں میں کیا جائے اور کہا جائے کہ وہ آخرت اور شہادت کے طلبگار تھے لیکن کوئی اجتماعی ذمہ داری اور مسئولیت نہیں رکھتے تھے۔ یعنی وہ فقط دنیاوی زندگی کے مقابلہ میں آخرت کی زندگی کو ترجیح دیتے تھے اور طبعی موت کی بجائے شہادت کے طلبگار تھے تو اس صورت میں چند دن کی زندگی کے لئے مدینہ چھوڑ کر کسی اور جگہ کی طرف ہجرت کرنا کوئی مفہوم نہیں رکھتا جب کہ شہادت تو آپؑ کو مدینہ میں بھی نصیب ہو سکتی تھی۔

(۳) لیکن ایک ایسا شخص جو ہدف و مقصد رکھتا ہو اور زندگی کو اپنی مسئولیت اور الہی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کا ذریعہ اور خدا کی امانت سمجھتا ہو وہ اپنی راہیں بڑی احتیاط اور احساسِ ذمہ داری کے ساتھ متعین کرتا ہے۔ معاویہ کی موت کے بعد اس کی جگہ یزید جیسے فاسق و فاجر کی ولی عہدی اور حسینؑ جیسی شخصیت سے اس کے لئے بیعت کا مطالبہ ایسے سنگین مسائل تھے جن سے امامؑ اس وقت دوچار تھے۔ ان حالات میں آپؑ کیلئے ایک ایسی جائے پناہ تک

خود کو پہنچانا نہایت ضروری تھا جو جائے امن ہو اور جہاں حکومت کے جبر و استبداد سے محفوظ و مامون رہا جاسکے۔

نیز وہ جگہ ایسی ہو کہ جہاں امامؑ اپنی اجتماعی ذمہ داریوں اور مسئولیت کو انجام دے سکیں اور اپنا پیغام دوسروں تک پہنچا سکیں۔

چنانچہ جائے امن ہونے کے لحاظ سے مکہ سے بہتر کوئی اور جگہ نہیں ہو سکتی تھی۔ شریعت اسلامی کی رو سے مکہ بلد الامین ہے جہاں نہ صرف انسان بلکہ نباتات و حیوانات حتیٰ وہ مجرم افراد بھی پناہ کا حق رکھتے ہیں کہ جنہوں نے مکہ کی سر زمین سے باہر کوئی جرم کیا ہو۔ اس لحاظ سے مکہ بنی امیہ کے ریاستی جبر سے محفوظ رہنے کیلئے بہترین جگہ تھی۔ اس کے علاوہ اپنی مسئولیت اور ذمہ داریوں کو پورا کرنے اور اپنا پیغام دوسروں تک پہنچانے کے لئے سر زمین مکہ سے بہتر کوئی جگہ نہیں تھی، خصوصاً ان ایام میں جن میں امام حسینؑ نے مدینہ چھوڑا، کیونکہ یہ وہ ایام تھے کہ جب خانہ خدا میں اطراف عالم سے عمرہ مفردہ کی غرض سے آنے والے لوگوں کا جھوم تھا۔

چنانچہ یہی وجہ تھی کہ جب امامؑ نے مدینہ کی فضا کو اپنے اہداف و مقاصد کیلئے سازگار نہ پایا تو آپؑ نے مکہ کا رخ کیا تاکہ وہاں جا کر عالم اسلام کے گوشہ و کنار سے آنے والے لوگوں تک اپنا پیغام پہنچا سکیں اور بنی امیہ کے باطل عزائم اور یزید کے مکروہ چہرے کو بے نقاب کر سکیں۔

### مکہ اور مکہ میں سفر کی آمد و رفت

۶۰ ہجری کے ۳ شعبان المعظم سے ۸ رزی الحجہ تک مکہ کی سر زمین ایک سرد جنگ کا محاذ بنی ہوئی تھی کیونکہ حکومت مخالف اکثر و بیشتر عمائدین نئے خلیفہ کے خلاف مہم چلانے کیلئے اس مقدس سر زمین کے جائے امن اور مرکز اجتماع ہونے کا فائدہ اٹھا رہے تھے۔ لیکن سب سے زیادہ توجہ کا مرکز ابو عبد اللہ الحسینؑ کی ذات گرامی تھی۔ حج و عمرہ کے فقہی مسائل اور دیگر مسائل شرعی کی بحث کے بعد سب سے بڑا دوسرا مسئلہ جو مورد بحث و تنقید بنا ہوا تھا وہ یزید کے خلاف

عمائدین اسلام بالخصوص حسینؑ ابن علیؑ کا قیام اور معارضہ تھا۔ یقیناً ایک وسیع النظر و وسیع البینا دور ہمہ گیر قیام و انقلاب کی خصوصیات اور امتیازات میں سے ایک خصوصیت اور امتیاز یہ ہے کہ قائد اور رہبر انقلاب ایک مرکز سے اپنے نمائندوں کو اور اپنے پیغام کو دور دراز علاقوں میں اپنی تحریک و قیام سے مربوط افراد تک پہنچاتا ہے اور اس انقلابی فکر کے حامل حامی اور معتقد افراد ان دور دراز علاقوں سے آ کر مرکز میں جمع ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس وقت محمد ابن حنفیہ اور عبد اللہ ابن عباس جیسی برجستہ شخصیات نے امام حسینؑ کو یہی مشورہ دیا کہ آپؑ اطراف و اکناف عالم میں خطوط و مراسلات اور اپنے نمائندے بھیجیں اور اگر لوگ آپؑ کی دعوت کو قبول کریں تو پھر آپؑ قیام کریں۔

پہلے بھی یہ سوال ہوا ہے اور اگر آج بھی یہ سوال کیا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ آپؑ نے مملکت اسلامی کے علاقوں میں رہنے والوں کو کس حد تک اپنے اعتماد میں لیا اور محمد حنفیہ اور عبد اللہ بن عباس کے مشوروں پر کہاں تک عمل کیا۔ اس سوال کا جواب بہت عجیب ہے لیکن اس سوال کے جواب سے پہلے اس وقت کے حالات کا ایک سرسری جائزہ پیش کرنا ضروری ہے اور یہ کہ امام حسینؑ جس دن سے مکہ تشریف لائے آپؑ کے دروازے سب سے لئے کھلے ہوئے تھے، آپؑ کی دعوت عام اور اعلانیہ تھی۔ وقت کے لحاظ سے بھی ماہ رمضان المبارک عمرہ و عبادات کا مہینہ ہونے کی وجہ سے مکہ لوگوں کی آمد و رفت کا مرکز بنا ہوا تھا، پھر رمضان کے بعد حاجیوں کی آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا اس لئے یہ کہا جاسکتا کہ یزید کے خلاف آپؑ کے قیام کی خبر کہیں نہ پہنچی ہو۔ یہ خبر تو یقینی طور پر اس وقت ہر جگہ پہنچ چکی ہوگی۔ اب سوال یہ ہے کہ امامؑ کے قیام کی دعوت کے جواب میں کس کس جگہ سے اور کہاں کہاں سے مسلمانوں نے اپنے نمائندے آپؑ کے پاس بھیجے اور اپنی تائید و نصرت کا اعلان کیا؟

صرف کوفہ اور بصرہ سے سفر کی مکہ میں آمد کا ذکر تو تاریخ میں ملتا ہے لیکن کسی دوسری

جگہ سے کسی کے آنے کا ذکر تاریخ میں نہیں ملتا۔ اس کی دو وجوہ ہو سکتی ہیں:

☆ ایک یہ کہ دوسری جگہوں سے آنے اور جانے والوں کی رپورٹ تاریخ میں نقل نہ ہوئی ہو اور لوگوں کو حالات اور واقعات سے بے خبر رکھا گیا ہو جیسا کہ آج بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ حکومتوں کی مخالف تحریکوں کے روابط ریکارڈ پر اور اخبار میں نہیں آتے۔

☆ دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اسلامی مملکت میں اس وقت مرکزی حیثیت صرف مدینہ مکہ کوفہ اور بصرہ ہی کو حاصل تھی اس لئے دوسرے شہروں کی نظریں انہیں چار شہروں کے رہنے والوں کی طرف لگی ہوئی تھیں کہ یہ لوگ کیا اقدام کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ حکومت وقت کو بھی خطرہ انہیں شہروں کی طرف سے تھا اس لئے حکومت انہی پطرنظر رکھے ہوئے تھی۔ خود امام حسینؑ بھی انہیں شہروں کے لوگوں سے امیدیں رکھتے تھے۔ چنانچہ تاریخ میں ان کے بارے میں جو نقل ہوا ہے وہ ہم یہاں پیش کرتے ہیں:

### مکہ سے سمرقند کی روانگی

(۱) امام حسینؑ کے مکہ پہنچنے ہی مکہ کے گورنر نے امامؑ کی مکہ میں آمد ان کے گھر پر لوگوں کی مسلسل آمدورفت اور حکومت کے خلاف سرگرمیوں کی ایک رپورٹ دمشق روانہ کی

(۲) بصرہ میں موجود پانچ سیاسی اجتماعی اور مذہبی شخصیتوں کے نام امام حسینؑ نے ایک خط بھیجا جس میں انہوں نے یزید کے خلیفہ بننے کی وجہ سے اسلام اور مسلمین کو لاحق ہونے والے خطرات سے انہیں آگاہ کرتے ہوئے اپنے قیام ذہنیت کے اسباب و علل بیان کئے اور انہیں اپنے قیام میں شرکت کی دعوت دی۔ آپؑ نے یہ خط اپنے قریبی معتمد شخص سلیمان بن زرین کے ہمراہ بصرہ روانہ کیا۔

(۳) کوفہ سے کثیر تعداد میں خطوط اور نمائندے آنے کے بعد امام حسینؑ نے اپنے

گھرانے کی معتمد شخصیت یعنی اپنے چچا زاد بھائی مسلم بن عقیل کو کوفہ روانہ کیا۔

### مکہ میں سمرقند کی آمد

☆ یزید بن معاویہ نے اپنے نمائندوں کو مکہ اور مدینہ کے گورنروں کے نام خطوط لکھ کر روانہ کیا جس میں انہیں خاص ہدایات دی گئیں۔ اس کے علاوہ عبداللہ بن عباس کے نام ایک خط بھی روانہ کیا کہ وہ امام حسینؑ کو اس کے خلاف قیام سے روکیں۔

☆ امام حسینؑ کی مکہ میں آمد کی خبر سنتے ہی کوفہ سے مسلسل خطوط اور اہل کوفہ کے نمائندے مکہ پہنچنے لگے جنہوں نے انتہائی اصرار اور تاکید کے ساتھ امامؑ سے خواہش ظاہر کی کہ وہ اپنے قیام ذہنیت کے لئے کوفہ کو مرکز بنائیں۔

### مکہ میں حسینؑ کی آمد سے سیاسی بے چینی

۳ شعبان ۶۰ھ کو امام حسینؑ کے مکہ میں پہنچنے کے بعد ۸ ذی الحجہ ۶۰ھ تک کا دور زائرین، حجاج اور اہل مکہ کے لئے تاریخ کا وہ بہترین دور تھا جس میں ان کو ایک صالح قیادت اور بیت اللہ کے حقیقی وارث کی طرف متوجہ ہونے اور اس کی قیادت سے بہرہ مند ہونے کا موقع میسر ہوا۔ دیگر حریمان اور امیداران اقتدار اور خود حکومت اور صاحبان اقتدار کیلئے بھی یہ عرصہ ایک عجیب بے چینی کا دور تھا۔

مکہ کے گورنر عمر بن سعید اشدق کو یقیناً یہ خبر مل چکی ہوگی کہ حسینؑ یزید کی بیعت کو مسترد کر کے مکہ پہنچے ہیں۔ اس نے بہر حال یہ خدشہ محسوس کر لیا ہوگا کہ امام حسینؑ کا عمرے کے ایام گزرنے کے بعد مکہ پہنچنا کہیں کسی سیاسی مہم کی غرض سے تو نہیں؟ چنانچہ اسی تشویش کے تحت بے چینی کے عالم میں وہ امام حسینؑ کی خدمت میں گیا اور آپؑ سے مکہ آنے کا سبب دریافت کیا۔ امامؑ نے جواب دیا کہ میں خدا سے اس کے گھر میں پناہ لینے آیا ہوں۔ حاکم مکہ نے امامؑ کی قیام گاہ پر لوگوں کی مسلسل آمدورفت کو دیکھا اور دیکھا کہ وہاں پر مسئلہ خلافت موضوع بحث

بنارہتا ہے۔ اس نے اسے ایک خطرہ محسوس کرتے ہوئے اپنی رپورٹ یزید کو بھیجی اور اس سے اس سلسلے میں آئندہ کے لئے مزید احکامات طلب کئے۔ یزید کو مدینہ سے مروان بن حکم کی طرف سے امام حسینؑ کے مدینہ چھوڑ کر جانے اور مدینہ کے گورنر ولید بن عتبہ کی سستی اور نااہلی اور خلیفہ کے حکم کو اہمیت نہ دینے کی رپورٹ پہلے ہی مل چکی تھی اور اب مکہ کے گورنر عمر بن سعید اشدق کی طرف سے امام حسینؑ کی مکہ میں آمد اور ان کے پاس لوگوں کی مسلسل آمدورفت اور سیاسی سرگرمیوں کی جب یہ رپورٹ دمشق پہنچی تو دمشق کی فضا بھی بے چینی میں تبدیل ہو گئی۔

مکہ کی سرزمین کوئی ایسی جگہ نہیں تھی کہ وہاں موجود مخالفین کے خلاف یزید عجلت میں کوئی فیصلہ صادر کر دیتا کیونکہ اس کے نتائج مسلمان برداشت نہیں کرتے۔ یہی بات یزید کے لئے بے چینی کا سبب تھی۔ بہت غور و خوض کے بعد اس نے طے کیا کہ اس سلسلے میں عبداللہ بن عباس سے مدد لی جائے۔ چنانچہ اس نے عبداللہ بن عباس کو خط لکھا:

”تمہارے ابن عم (حسینؑ) اور دشمن خدا عبداللہ بن زبیر میری بیعت سے انکار کر کے مکہ آئے ہیں اور فتنہ برپا کرنے میں سرگرم ہیں اور اس طرح خود کو ہلاکت میں ڈال رہے ہیں۔ جہاں تک ابن زبیر کا تعلق ہے مجھے اس کی کوئی پروا نہیں ہے کیونکہ وہ آج نہیں تو کل مر جائے گا۔ لیکن حسینؑ کے بارے میں تمہارے خاندان سے معذرت چاہوں گا۔ میں حسینؑ کے بارے میں اس لئے پریشان ہوں کہ اہل عراق انہیں بٹا رہے ہیں اور ان کو خلافت سنبھالنے کی دعوت دے رہے ہیں۔

آپ جانتے ہیں کہ ہمارے اور آپ کے درمیان جو قرابت داری ہے، حسینؑ اس کو توڑ رہے ہیں۔ آپ اس خاندان کے بزرگ اور سربراہ ہیں۔ آپ حسینؑ کو اس بات سے روکیں۔ اگر حسینؑ نے آپ کی بات مان لی تو ان کو میری طرف سے نہ صرف امان ہے بلکہ میں ان کو انعام و اکرام سے بھی نوازوں گا۔ اگر سابقہ وظائف ان کیلئے کم ہیں تو میں ان کو مزید دینے کے لئے بھی تیار ہوں۔ آپ

میری طرف سے ان کو ضمانت دے سکتے ہیں کہ میں اس سلسلے میں بڑی سے بڑی قسم کھانے اور ہر قسم کے عہد و پیمان اور یقین دہانی کے لئے تیار ہوں۔“

اس خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت دمشق اور مکہ کس سیاسی بے چینی کے دور سے گزر رہے تھے۔

ادھر عبداللہ بن زبیر مصعب خلافت کا امیدوار تھا اور خود کو اس کا اہل اور حقدار سمجھتا تھا۔ جب یہ مکہ پہنچا تو لوگ اس کے پاس آمدورفت رکھتے تھے اور صحابی رسولؐ اور رسولؐ کے قرابت داری کی بنا پر اور یزید کی دلی عہدی کے خلاف ہونے کی وجہ سے بھی لوگ اس کی طرف رجوع کرتے تھے۔ لیکن جوں ہی امام حسینؑ مکہ پہنچے لوگ اس سے کٹ گئے اور اس کے پاس جانا چھوڑ دیا۔ اب امام حسینؑ لوگوں کی توجہ کا مرکز بن گئے۔ عبداللہ بن زبیر نے جب یہ دیکھا تو سمجھ لیا کہ جب تک حسینؑ مکہ میں ہیں لوگ میری طرف رجوع نہیں کریں گے۔ امام حسینؑ کے ہوتے ہوئے وہ اپنی امید داری کی الگ سے کوئی تحریک بھی نہیں چلا سکتا تھا اور اپنے اندر چھپی ہوئی خباثت اور خلافت کا حریص ہونے کی وجہ سے خود کو امام حسینؑ کی تحریک میں ضم بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ امید داری سے دستبردار ہونے کے لئے بھی آمادہ نہ تھا۔ اس لحاظ سے وہ بھی ایک عجیب بے چینی کی زندگی بسر کر رہا تھا اور طے نہیں کر پا رہا تھا کہ کس طرح اس مسئلہ کا حل نکالے۔ کبھی وہ امام حسینؑ کو شوق دلانا تھا کہ وہ مکہ چھوڑ کر عراق چلے جائیں اور کہتا تھا اگر مجھے اتنے افراد حمایت میں مل جاتے تو میں بلا تاخیر کے چلا جاتا، کبھی اپنے اوپر عائد تہمت کو رفع کرنے کے لئے امام کو مکہ میں ہی قیام کی تجویز دیتا۔ غرض اس حوالے سے عبداللہ بن زبیر بھی سخت بے چینی کا شکار تھا۔

جہاں تک خود امام حسینؑ کی ذات گرامی کا تعلق ہے تو اگرچہ ان کو مدینہ کی سرزمین کی نسبت مکہ میں امن و آسودگی کی فضا نصیب ہو گئی تھی جہاں وہ اپنے اہداف و مقاصد کو کھل کر واضح

اور بنی امیہ کی حکومت کے جرائم اور مکروہ عزائم کو بے نقاب کر رہے تھے۔ لیکن وہ مکہ میں اس سے زیادہ کچھ اور کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ اگرچہ سرزمین مکہ آیات قرآنی کی نص کے تحت جائے قیام ہے لیکن کسی کے خلاف چاہے وہ کتنا ہی ظالم انسان کیوں نہ ہو یہاں مسلح قیام نہیں کیا جاسکتا اور اگر امام حسینؑ ایسا کرتے تو وہ آپ کے مفاد میں نہیں بلکہ الٹا حکومت بنی امیہ کے مفاد میں ہوتا۔ ایسا کرنے سے حکومت وقت کو واضح کرنے کے لئے بحث و تہیج اور بیانات دینے کی حد تک یہ جگہ مناسب اور موزوں تھی۔ کسی نہضت و قیام کو عملی شکل دینے کے لئے مکہ سے باہر ایک وسیع فضا کی ضرورت تھی۔ اس لئے امام حسینؑ ایک ایسی فضا کی تلاش میں تھے۔ چنانچہ ایک طرف تو امامؑ نے بصرہ میں موجود اشرف بصرہ کے نام خط لکھا دوسری طرف آپ کے منتظر تھے کہ کوفہ والے اس وقت کیا موقف اختیار کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ والی مکہ اور حکومت کی نقل و حرکت پر بھی آپ نظر رکھے ہوئے تھے اور بنی امیہ کی حکومت کی تدابیر اور چالوں کو دیکھتے ہوئے اپنے اگلے اقدام کا انتظار کر رہے تھے۔

### مکہ میں مخفی انداز میں قتل کی سازش

ادھر دمشق اور مکہ کے دارالامارہ کے درمیان امام حسینؑ کی سرگرمیوں کے بارے میں طویل بحث و تہیج کے بعد بنی امیہ کی حکومت اس انتظار میں تھی کہ امام حسینؑ کی طرف سے کوئی ایسا اقدام سرزد ہو جسے جواز بنا کر حکومت آپ کو گرفتار اور قتل کر سکے۔ لیکن حسینؑ بن علیؑ جیسی دانا اور مدبر شخصیت کی طرف سے حکومت کو ایسا کوئی جواز میسر آ جانا ناممکن تھا۔ چنانچہ اپنے مکروہ عزائم میں ناکام ہونے کے بعد حکومت نے مکہ کی سرزمین میں امامؑ کے مخفیانہ قتل کی سازش تیار کی۔ حاجیوں کی لباس میں اپنے کارندے مکہ بھیجے تاکہ امام حسینؑ کو مکہ میں قتل کر دیں۔

حکومت اپنے من مخالفین کو قتل کرنے کے درپے ہوتی ہے وہ عموماً دو طرح کے ہوتے ہیں..... ایک وہ کہ جن کو کوئی پشت پناہی حاصل نہیں ہوتی اور ان کے قتل ہو جانے سے قوم کی ایک

طرف سے کسی سخت رد عمل یا غم و غصہ کے اظہار کا کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ حکومت ایسے افراد کو برسر عام قتل کرنے سے نہیں بچکپاتی کیونکہ اس طرح نہ اس کی پوزیشن پر کوئی اثر پڑتا ہے اور نہ کوئی اسے محرم ٹھہراتا ہے۔ البتہ حکومت کے مخالفین کا ایسا گروہ جس کا کردار صاف و شفاف ہوتا ہے اور جس کے دامن پر کسی بھی قسم کا کوئی دھبہ نہیں ہوتا اور نہ لگایا جاسکتا ان کے وجود کو حکومت اتنی آسانی سے ختم نہیں کر سکتی کیونکہ اس صورت میں حکومت کو شدید عوامی رد عمل اور قوم کے غیظ و غضب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے ایسے افراد کے وجود کو صغیر ہستی سے مٹانے کیلئے عیارانہ سازشوں کا سہارا لیا پڑتا ہے۔ ایک ایسی سازش کہ جس سے حکومت کا مخالف بھی ختم ہو جائے اور قاتل کا پتہ بھی نہ چل سکے۔ ایسے افراد کے قتل کے بعد حکومت مقتول کے غم میں سوگوار ہونے کا ڈھونگ بھی رچاتی ہے ان کے جنازے اور تجہیز و تکفین میں شرکت بھی کرتی ہے تاکہ حکومت کے دامن پر قتل کے تہمت نہ لگے۔ چنانچہ ہمارے اکثر و بیشتر آئمہ کا قتل بھی اسی طرح ہوا خلیفہ اور حکمران ان کے جنازے میں شریک ہو کر سوگوار ہونے کا لٹا ڈرامہ بھی رچاتے تھے۔

بنی امیہ اور اس کے کارندے کچھ اسی طرح امام حسینؑ کو قتل کرنے کی سازش کر رہے تھے کیونکہ ”حسینؑ“ جیسی شخصیت کو نہ تو کوئی تہمت لگا کر قتل کیا جاسکتا تھا اور نہ کھلم کھلا سامنے آ کر۔ لہذا حکومت ایک ایسی عیارانہ سازش کر رہی تھی کہ حسینؑ قتل بھی ہو جائیں اور حکومت پر اس کی ذمہ داری بھی عائد نہ ہو۔

لیکن امام حسینؑ نے ان کی اس سازش کو نہ صرف کامیاب ہونے کا موقع نہیں دیا بلکہ ان کے مکروہ عزائم کو اپنے قول و فعل دونوں سے برملا فاش کر دیا۔

وہ مکہ کہ جہاں ہر شخص کو پناہ لینے کا حق ہے اس جائے امن سے بھی گواماٹ کو محروم ہونا پڑا لیکن آپ نے مکہ چھوڑ کر ان کے عزائم کو بے نقاب کر دیا۔ آپ نے خاموشی سے رات کی تاریکی میں نہیں بلکہ دن کی روشنی میں ہزار ہا انسانوں کی آنکھوں کے سامنے مکہ چھوڑا۔ آپ نے مکہ

چھوڑنے کی تین وجوہات بیان فرمائیں:

(۱) ”اگر میں مکہ سے نہ نکلوں گا تو یہ لوگ مجھے مکہ ہی میں قتل کر دیں گے۔“

(۲) ”مکہ سے باہر قتل ہو جانا مجھے زیادہ پسند ہے۔“

(۳) ”میں نہیں چاہتا کہ میرے قتل ہونے کی وجہ سے اس گھر (بیت اللہ) کی حرمت

حرمت ہو۔“

امام کے پہلے جملہ کا مقصد یہ ثابت کرنا اور لوگوں پر یہ واضح کرنا تھا کہ حکومت مجھے قتل کر دینے کے درپے ہے۔ مکہ میں چار ماہ کی قیام کی مدت میں امام حسین کا یہ بیان سخت ترین بیان ہے جس میں آپ نے واشکاف الفاظ میں بنی امیہ کے مذموم عزائم اور ارادوں کو فاش کیا۔ یعنی آپ نے وہاں موجود حجاج کو بتلایا کہ تمہارا خلیفہ وہ شخص ہے جو جرم و فساد میں اس حد تک بڑھ چکا ہے کہ مکہ جیسی سر زمین میں بھی انسانی خون بنانے سے نہیں چوکتا۔ آپ نے بتایا کہ تمہارا یہ حاکم جو امیر حج ہے اس کے ہاتھوں حجاج کی جان و مال تو کجا اسلام کے محافظین بھی محفوظ نہیں۔

دوسرے جملے سے آپ نے یہ ظاہر فرمایا کہ میں قتل ہو جانے سے نہیں ڈرتا لیکن اس طرح کے قتل سے میں ضرور فزرا اختیار کروں گا جس میں قاتل کا چہرہ چھپا رہے اور مجرم بے نقاب نہ ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ میں مکہ کی سر زمین سے باہر نکلوں چاہے ایک بالشت ہی سہی تاکہ میں ان قاتلوں کا مقابلہ کروں جو میرے پیچھے آتے ہیں اور اس طرح ان کو ان کے جرائم کو بے نقاب کروں چنانچہ مکہ کے گورنر عمر بن اشدق نے اپنے بھائی تکی بن سعید اشدق کی قیادت میں ایک لشکر امام حسین کے تعاقب میں روانہ کیا۔ آپ نے اس کا مقابلہ کیا اور اس کو مکہ واپس پلٹنے پر مجبور کر دیا۔

امام کا تیسرا جملہ خدا کے گھر کی عظمت اور حرمت کی اہمیت کو واضح کرتا ہے۔ آپ نہیں چاہتے تھے کہ آپ کے قتل ہو جانے کی وجہ سے اس گھر کی حرمت ہو۔ اگرچہ آپ کے قتل

ہو جانے میں آپ کا کوئی کردار نہیں ہوتا اس لئے کہ حرم کی حرمت کا مرتکب قاتل ہے نہ کہ مقتول کہ جس کو بے گناہ قتل کیا جا رہا ہے۔ لیکن چونکہ آپ جانتے تھے کہ آپ کے خلاف حکومت جس قسم کی سازش کر رہی ہے اس میں قاتل گنہگار اور بے نقاب رہے گا اس طرح خانہ خدا کی حرمت حرمت کرنے والا ہمیشہ کیلئے مجہول رہے گا اور آپ یہ نہیں چاہتے تھے کہ بیت اللہ کی حرمت کا مرتکب مجہول قرار پائے۔

اس کے علاوہ مسئلہ یہ نہیں کہ خانہ خدا کی حرمت کون کر رہا ہے یا اس گھر میں قتل ہونے والے مقتول کا اس میں کوئی کردار نہیں ہے بلکہ اصل مسئلہ اس گھر کے تقدس کو برقرار رکھنا ہے۔ قاتل کو تو اس کی کوئی پروا نہیں ہوتی کہ اس کی وجہ سے اس گھر کی حرمت ہو رہی ہے کیونکہ وہ مجرم ہے لیکن اگر مقتول کے امکان میں یہ بات ہو کہ وہ اس محترم جگہ پر قتل ہونے سے خود کو بچا سکتا ہے تو اس پر یہ ذمہ داری بہر حال عائد ہوتی ہے کہ جس حد تک ممکن ہو وہ یہاں سے نکلنے کی کوشش کرے تاکہ اس گھر کی حرمت کو بر باد ہونے سے بچا سکے۔ چنانچہ امام حسین جو یہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ انہیں ہر حال میں قتل ہونا ہے وہ کس طرح یہ گوارا کر سکتے تھے کہ ان کا قتل ہونا اس گھر کی حرمت پامال ہونے کا سبب بنے۔ یہاں اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کو اس گھر سے کتنی محبت تھی اور اس گھر اور اس گھر کے تقدس کا کتنا پاس اور احترام تھا۔ آپ نے اپنے منافدات کو چھوڑ کر مکہ کی حرمت کا خیال رکھا جب کہ دوسری طرف ہم عبد اللہ بن زبیر کو دیکھتے ہیں کہ اس نے اپنے تحفظ کو کعبہ کی حرمت پر مقدم رکھا اور بنی امیہ نے اپنے اقتدار کو کعبہ کی اہانت کی قیمت پر بھی بحال رکھا۔

### امام حسین اور حج

فرائض اسلامی میں حج اہم ترین اور جامع ترین فریضہ شمار ہوتا ہے۔ حج کی جزیں حضرت آدم صلی اللہ سے شروع ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ جاہلیت بت پرستی اور خود پرستی کے

دور میں بھی مشرکین یہ رسم کسی نہ کسی شکل میں بجالاتے تھے۔ فریضہ حج کی اہمیت اور ضرورت کے بارے میں شواہد ملتے ہیں یہاں تک کہ قرآن کریم میں ایک سورہ سورہ حج اس فریضہ کے نام سے موسوم ہے جبکہ کسی اور فریضہ کو یہ شرف حاصل نہیں۔ اسلام کی بقاء کعبہ سے مربوط ہے۔ اسلام اس وقت تک باقی ہے جب تک کعبہ باقی ہے اور کعبہ کی بقاء حج و عمرہ سے مربوط ہے۔ قدرت اور استطاعت رکھتے ہوئے اس فریضہ کو انجام نہ دینے والوں کیلئے وعید دی گئی ہے کہ قیامت کے دن اندھے اور یہود و نصاریٰ کی شکل میں محسوس ہوں گے۔ تمام اعمالِ ثواب کو تو لے کا پیمانہ حج و عمرے کو قرار دیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ اگر مسلمان حج پر جانے میں معذوری یا سستی کا مظاہرہ کریں تو امام وقت پر واجب ہے کہ ان کو جبری حج پر بھیجے اور اگر زاد راہ اور نفقہ کی کمی ہو تو وہ بیت المال سے پورا کرے۔ حج کو عمدہ ترک کرنے والوں کیلئے آخرت کے عذاب سے پہلے دنیا میں بھی نزولِ عذاب کی وعید دی گئی ہے۔

یہ اہم ترین اور با فضیلت فریضہ درگاہِ خداوندی میں قبولیت کیلئے اس امر سے مربوط ہے کہ انسان پیغمبر ختمی مرتبت اور اپنے امام زمانہ سے تمسک اور توسل نہ رکھتا ہو تو اس کا حج خدا کی بارگاہ میں قبول نہیں ہوگا۔

ہر دور کا امام ہی لوگوں کو حج کی دعوت دیتا ہے اور وہی مدبر و سرپرستِ حجاج بھی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انتہائی ناسازگار حالات میں بھی آئمہؑ اپنے آپ کو سر زمینِ مکہ و عرفات پہنچاتے تھے اور اس سفر میں اٹھائی جانے والی زحمتوں اور تکلیفوں کو اپنے لئے باعثِ شرف و افتخار سمجھتے تھے۔ امام حسینؑ اور امام زین العابدینؑ کے بارے میں مشہور ہے کہ آپ دونوں نے ۲۵ سال پیدل اور پابرہنہ حج کیا۔ دورانِ حج اکثر و بیشتر ایک گمنام حیثیت سے حجاج کے کاروانوں میں شامل ہوتے اور ارکانِ کاروان کی خدمت کرتے تھے۔ اگر کسی وقت لوگوں کو ان ذواتِ مقدسہ کے بارے میں پتہ چل جاتا تو وہ کاروان بدل دیتے اور کسی دوسرے کاروان میں

اس کی خدمت کیلئے شامل ہو جاتے۔

حسینؑ جو اس با فضیلت اور با عظمت فریضہ کو بجالانے کے ہمیشہ شیفتہ و فریفتہ رہے ہوں۔ عین حج کے موقع پر جب ایک دنیا عرفات و منیٰ کی جانب رواں دواں ہے یکا یک ایک مرتبہ اس عظیم فریضہ کو چھوڑ کر ایک دوسری جانب نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ دنیا حیران ہے کہ ”حسینؑ“ کیا چاہتے ہیں؟ اس وقت سے لے کر آج تک ہر انسان کے ذہن میں اس حسینی اقدام کے متعلق طرح طرح کے سوالات پیدا ہوتے رہے ہیں۔ ہر شخص اپنی ذہنی سطح کے مطابق ان سوالات کا جواب دیتا رہا ہے۔ اربابِ سیاست سیاسی پہلو سے اہل عرفان عرفانی زاویے سے، فقہاء فقہی نقطہ نظر سے امامؑ کے اس اقدام کی توجیہ کرتے رہے ہیں۔ امامؑ کے عین ایام حج میں مکہ چھوڑنے کے سیاسی اسباب پر ہم گزشتہ سطور میں روشنی ڈال چکے ہیں۔ ذیل میں ہم اس بات پر روشنی ڈالیں گے کہ آخر امامؑ نے ان ایام میں کس طرح مکہ چھوڑا کیونکہ احرام باندھنے کے بعد حج کو ادھورا چھوڑنا جائز نہیں، حج کا احرام باندھنے والے پر لازم ہے کہ وہ بہر طور حج کو مکمل کرے۔ تاریخ و مقاتل میں اس بارے میں متعدد اقوال ملتے ہیں۔

### پہلا قول

چونکہ امام حسینؑ حج کو پورا کر سکتے تھے اس لئے آپؑ نے احرام حج کو عمرہ مفردہ کے احرام سے بدلا عمرہ کیا اور مکہ سے نکل گئے۔ جیسا کہ بعض مقاتل یہاں تک کہ شیخ مفید علیہ الرحمہ اور طبری وغیرہ نے بھی نقل فرمایا ہے۔

### دوسرا قول

امام حسینؑ کو حج کرنا تھا لیکن معذوری کو مد نظر رکھتے ہوئے عمرہ کیا، طواف کیا، صفا و مردہ کے درمیان سعی کر کے احرام سے محل ہوئے اور مکہ سے نکل گئے۔

### تیسرا قول

امامؑ نے کعبہ کا طواف کیا، صفا و مروہ کے درمیان سعی کی اور مکہ سے نکل گئے۔ جیسا کہ بعض مقاتل میں بھی لکھا ہے۔

### چوتھا قول

صرف بیت اللہ کا طواف کیا، مقام ابراہیم پر نماز پڑھی، حجاج سے خطاب کیا اور مکہ سے نکل گئے۔

اب دیکھتے ہیں کہ ان مفروضوں میں سے کون سا مفروضہ قرین صحت ہے اور شواہد و دلائل پر پورا اترتا ہے۔

### پہلے قول پر بحث

جہاں تک پہلے مفروضے کا تعلق ہے کہ امامؑ نے حج کو عمرہ میں تبدیل کیا اس کی کوئی صورت نظر نہیں آتی بلکہ اس پر کئی اشکالات وارد ہوتے ہیں:

### اشکال نمبر ۱

اگر کسی نے حج کے مہینوں (شوال، ذی قعدہ، ذی الحجہ) میں عمرہ مفردہ کا احرام باندھا ہو اور عمرہ بجالایا ہو تو اس کو حج میں تبدیل کرنے کا جواز اور صورت تو فقہ میں موجود ہے لیکن حج کو عمرے میں تبدیل کرنے کی کوئی صورت فقہ میں نظر نہیں آتی۔

### اشکال نمبر ۲

حج کی مہینوں سے پہلے امامؑ مکہ میں موجود تھے اس لئے وہ اہل مکہ میں شمار نہیں ہوتے تھے اس صورت میں اگر وہ حج کا احرام باندھتے تو اس کے لئے ضروری تھا کہ وہ احرام حج کیلئے میقات تک جاتے، لیکن کسی بھی تاریخ اور مقاتل میں نہیں ہے کہ مکہ پہنچنے کے بعد امامؑ میقات کیلئے نکلے اور وہاں سے احرام باندھ کر آئے۔

### اشکال نمبر ۳

جیسا کہ مقاتل میں لکھا ہے کہ جب امامؑ مکہ سے نکلے تو ان کے ہمراہ تقریباً سو (۱۰۰) انصار و اعدوان تھے۔ لیکن تاریخ میں کسی کے بارے میں نہیں ہے کہ امامؑ نے ان سے فرمایا ہو کہ اب تم حج کو عمرہ سے بدل لو اور نہ ہی تاریخ میں کہیں یہ ملتا ہے کہ کسی نے امامؑ سے پوچھا ہو کہ اب ہمارے حج کا کیا ہوگا۔

### اشکال نمبر ۴

حج کا احرام باندھنے کے بعد حج کو پاپیہ تکمیل تک پہنچانا واجب ہے۔ دو صورتوں کے علاوہ کسی صورت میں اس کو ترک کرنے کی کوئی گنجائش نہیں:

(۱) ایک تو مصدود ہونے کی صورت میں جہاں کسی مخالف گروہ یا حکومت کی طرف سے حج کی انجام دہی سے کسی کو روکا جائے جیسا کہ سورہ مائدہ کی آیت ۱۲ اور سورہ فتح کی آیت ۲۵ میں اس کا ذکر آیا ہے۔ چنانچہ عمرے کے موقع پر مشرکین نے پیغمبر اسلامؐ کو حدیبیہ کے مقام پر مکہ میں داخل ہونے سے روک دیا تو آپؐ نے وہیں سے ہدیہ کو ذبح کیا، تقصیر کی اور احرام سے محل ہو کر مدینہ واپس چلے گئے۔

(۲) دوسرے محصور ہونے کی صورت میں..... یعنی کسی کو اثناء راہ میں کوئی ایسا مرض لاحق ہو جائے کہ وہ سفر حج جاری نہ رکھ سکے تو وہ وہیں احرام سے محل ہو جاتا ہے۔

البتہ محصور ہونے اور مصدود میں فرق یہ ہے کہ محصور ہونے کی صورت میں محل ہونے کے بعد اور حالات میسر ہونے کے بعد طواف النساء بجالانا ضروری ہے۔ چنانچہ یہ صورت حال امام حسینؑ کو اپنے پدربزرگوار کے زمانہ میں پیش آئی۔ محرم ہونے کے بعد مکہ اور مدینہ کے درمیان کسی منزل پر آپؑ بیمار ہو گئے، جب امام علیؑ کو یہ خبر ملی تو وہ تشریف لائے اور انہوں نے قربانی کے بعد امام حسینؑ کو احرام سے محل کیا اور انہیں واپس اپنے ساتھ مدینہ لے گئے۔

چنانچہ حج کے بدلے میں عمرہ بجالانے کا کوئی تصور نہیں ہے۔

## اشکال نمبر ۵

جن لوگوں نے یہ کہا ہے کہ امام حج کے بدلے میں عمرہ بجالائے وہ کہتے ہیں کہ آپ نے طواف کیا، سعی کی اور محل ہو کر مکہ سے نکل گئے لیکن کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ آپ نے طواف النساء بھی بجالائے جب کہ عمرہ مفردہ میں محل ہونے کے بعد طواف النساء بجالانا ضروری ہے۔

## اشکال نمبر ۶

امام حسین - کا شمار معاذ اللہ ہم جیسے افراد یا عام قائدوں بہر کے زمرے میں نہیں ہوتا کہ جو عواقب و نتائج کو سر سے پائی گزر جانے کے بعد درک کرتے ہوں اور دشمن کے سر پر آ جانے کے بعد خطرے کا احساس کرتے ہوں بلکہ امام کا ہر اقدام مدبرانہ ہوتا ہے۔ بنی امیہ کی طرف سے اپنے لئے لاحق ہونے والے ہر خطرے کے خلاف آپ ہر ممکنہ تدبیر کو نظر میں رکھے ہوئے تھے۔ مدینہ سے نکلنے وقت ہی آپ نے اچھی طرح اپنی جان کو لاحق خطرے کا احساس کر لیا تھا لہذا حج نہ کر سکتا آپ کے نزدیک یقینی امر تھا تو پھر آپ حج کا احرام کیوں کر باندھ سکتے تھے جب کہ آپ کو یقین تھا کہ آپ حج کو پایہ تکمیل تک نہیں پہنچا سکتے۔

لہذا یہ مفروضہ کہ امام نے حج کو عمرہ میں تبدیل کیا بالکل بے بنیاد ہے۔

## دوسرے قول پر بحث

یہ مفروضہ بھی کہ ”امام کو حج کرنا تھا لیکن معذوری کی وجہ سے نہیں کر سکے اور عمرہ مفردہ بجائے“ درست نہیں ہے الا تو یہ کہ عمرہ مفردہ بجالانے والے مقیم اور غیر مقیم دونوں کیلئے ضروری ہے کہ وہ قریب ترین میقات (مثلاً مسجد تعیم یا بھرانہ) سے احرام باندھیں۔ یہ میقات اس وقت مکہ کی حدود سے باہر تھے اور امام کو مکہ سے باہر نکلنے میں خطرہ تھا اور وہ یہ خطرہ مول نہیں سکتے تھے۔ اسکے علاوہ کسی نے کہیں بھی یہ ذکر نہیں کیا کہ امام عمرہ مفردہ کیلئے احرام باندھنے مسجد تعیم یا بھرانہ تشریف لے گئے۔

بالفرض محال اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ امام عمرہ مفردہ بجالائے تو جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا..... کسی نے کہیں بھی یہ ذکر نہیں کیا کہ امام نے عمرہ مفردہ بجالانے اور احرام سے محل ہونے کے بعد طواف النساء کیا جب کہ عمرہ مفردہ میں طواف النساء بجالانا ضروری ہے۔

## تیسرے قول پر بحث

بعض مقال میں جو یہ کہا گیا ہے کہ ”امام حسین نے صرف کعبہ کا طواف کیا، صفا و مردہ کی سعی کی اور مکہ سے نکل گئے“۔ یہ اس لئے صحیح نہیں ہے کہ ظاہر ہے کہ امام کا یہ طواف کرنا اور سعی کرنا مستحبی امر تھا۔ لیکن شریعت میں مستحبی طواف بجالانے کا تو ذکر ہے لیکن صفا و مردہ کے درمیان مستحبی سعی بجالانے کا کہیں ذکر نہیں ہے۔

## چوتھے قول پر بحث

اب رہا یہ مفروضہ کہ امام حسین - نے عین موقع پر ۸/ذی الحجہ کو طواف کیا اور مکہ سے نکل گئے۔ یہ مفروضہ قرین صحت ہے جیسا کہ بحار الانوار کی جلد ۹۹ میں ذکر ہوا ہے۔

## کعبہ اور حج سے حسین کا گہرا رشتہ

انبیاء اور آئمہ اطہار کا کعبہ مقامات مقدسہ حج اور اعمال حج سے وہی رشتہ رہا ہے جو روح کا بدن سے ہے۔ کعبہ اور حج سے انبیاء کرام اور آئمہ اطہار کے رشتے کے بارے میں قرآنی آیات، کثیر روایات اور کتب تاریخ میں کثرت سے نمایاں طور پر ذکر موجود ہے۔ قرآنی آیات اور روایات کی زد سے کعبہ کی تعمیر، تولد بیت اللہ، ندا اور دعوت حج اور تعظیم حج کی ذمہ داری محبت خدا اور ہادیان برحق کے کندھوں پر عائد کی گئی ہے۔ سورہ حج کی آیت ۲۷ میں بندگان خدا کو اس گھر کی طرف بلانے کا جو حکم دیا گیا ہے اس میں اگرچہ اس حکم کے مخاطب کا ذکر نہیں ہے (یعنی یہ ذکر قرآن میں واضح نہیں ہے کہ حج کی طرف بلانے والا کون ہو) لیکن یہ اشارہ واضح طور پر موجود ہے کہ حج کی دعوت پر لبیک کہنے والے حجاج کرام کی ندا دینے والے کی طرف آئیں

گے..... چنانچہ اس آیت میں جہاں حج کی ندا دینے کا حکم ہوا ہے: ﴿اذن فی الناس بالحد﴾ ”یعنی لوگوں کو حج کی طرف بلاؤ“ اس کے فوراً بعد ذکر ہوا ہے: ﴿یاتوکل رجلاً.....﴾ ”یعنی لوگ آپ کے پاس آئیں گے“۔

اگرچہ عام طور پر یہ معروف ہے کہ حج کی ندا دینے کا حکم حضرت ابراہیمؑ دیا گیا لیکن یہ آیت وجوب حج کی دلالت کرتی ہے اور حج کے لئے ندا دینے کے دائمی حکم کی حیثیت رکھتی ہے کہ ہر دور کے حج خدا اور ہادی برحق کی ذمہ داری اور مسئولیت ہے کہ وہ بندگانِ خدا کو اس گھر کی طرف بلائے چنانچہ حضرت ابراہیمؑ اپنے دور کے منادی حج تھے یعنی غیر ختمی مرتبت اپنے دور کے اور اسی طرح ہر امام اپنے دور کا منادی حج ہے لہذا جب بھی اور جہاں بھی اس ندا اور دعوت میں سستی اور کمزوری ہوگی تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ حاجیوں کی تعداد کم ہوگی اور جب اس ندا میں وسعت، اہمیت اور تاکید ہوگی حجاج کی تعداد میں اضافہ ہوگا۔ اس دعوت اور ندا دینے کو ایک ”ندائے تلوینی“ قرار دینا صحیح نہیں ہے بلکہ منادی حج ہر دور کا امام ہوتا ہے اور یہ اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ لوگوں کو اس گھر کی طرف بلائے۔

کعبہ حج اور امام وقت کے درمیان رشتے کے سلسلے میں ہم یہاں چند دلائل پیش کرتے ہیں:

(۱) سورہ بلد کی پہلی آیت: ﴿لا اقسام بھذا البلد﴾ میں کعبہ اور مکہ کی عظمت کو پیغمبر اسلامؐ کی ذات سے مربوط قرار دیا گیا ہے۔ مفسرین اس سورہ میں ”لا اقسام.....“ کے ”لا“ کے بارے میں اختلاف نظر رکھتے ہیں۔ بعض اس کو ”لئے نافیہ“ کہتے ہیں۔ اس صورت میں اس آیت کے معنی یہ ہونگے کہ ”ہم اس شہر کی قسم نہیں کھاتے“ اس کے برخلاف بعض مفسرین اس ”لا“ کو ”لئے زائدہ“ کہتے ہیں اگر اس کو ”لئے زائدہ“ کہا جائے تو اس آیت کے معنی ہوں گے کہ ”ہم اس شہر کی قسم کھا کر کہتے ہیں“۔

بہر حال دونوں صورتوں میں خدا وید عالم نے اپنے ”قسم نہ کھانے“ یا ”اپنے قسم کھانے“ کو پیغمبر اسلامؐ کے مبارک وجود سے مربوط کیا ہے یعنی پہلی صورت میں یہ معنی ہوں گے کہ ”ہم اس شہر کی قسم نہیں کھاتے“

کیونکہ اس شہر کے رہنے والوں میں آپؐ کی جان اور آپؐ کے خون کو حلال سمجھا ہے جبکہ دوسری صورت میں یہ معنی ہونگے کہ ”ہم اس شہر کی قسم کھاتے ہیں“ کیونکہ آپؐ اس شہر میں رہتے ہیں۔

(۲) سورہ مبارکہ ابراہیم کی آیت ۳۷ میں حضرت ابراہیمؑ کی اس دعا کا ذکر ہے کہ جس میں وہ فرماتے ہیں:

”خداوند! لوگوں کے دلوں کو اس گھر کی طرف متقلب کر دے“

اس آیت کی تفسیر میں معصومؑ نے امام وقت کو اس آیت کا مصداق قرار دیا ہے یعنی حضرت ابراہیمؑ نے دعا کی:

”خداوند! لوگوں کے دلوں کو اہل بیت اطہار کی طرف مائل کر دے“۔

(۳) کتاب ثواب الاعمال کے صفحہ ۲۳۳ میں ابو حمزہ ثمالی نے امام سجادؑ سے نقل کیا ہے کہ امام سجادؑ نے ان سے پوچھا:

”روئے زمین پر کون سا قطعہ افضل ترین بقعہ ہے؟“

ابو حمزہ ثمالی نے جواب دیا کہ خدا اور اس کے رسولؐ بہتر جانتے ہیں۔

امامؑ نے فرمایا:

رکن اور مقام (یعنی حجر اسود اور مقام ابراہیمؑ) کی جگہ۔

اس کے بعد امامؑ نے فرمایا:

اگر کوئی شخص اپنی قوم میں نوع کی عمر پائے اور تمام عمر دن کو روزہ رکھے اور رات

کو نماز میں مصروف رہے، حجر اسود اور مقامِ ابراہیمؑ کے درمیان جہاد کرتے ہوئے شہید ہو جائے لیکن اگر وہ ہم اہل بیتؑ کی ولایت نہ رکھتا ہو تو اس کا روزہ، نماز اور جہاد سے کوئی فائدہ نہیں پہنچائے گا۔“

(۴) حج..... طوافِ کعبہ، صفا و مروہ کے درمیان سعی اور عرفات، مشعر اور منیٰ میں وقوف کا نام ہے۔ لیکن کتبِ احادیث (مثلاً وسائل الشیعہ) میں ایک باب ہے کہ جس میں بحث کی گئی ہے کہ آیا مکہ سے ابتداء کر کے حج کا اختتام مدینہ پر کیا جائے یا مدینہ سے ابتداء کر کے مکہ پر اختتام کیا جائے۔ اس سلسلے میں معصومؑ فرماتے ہیں:

”ابتداء مکہ سے کریں اور اختتام مدینہ پر۔“

معصومؑ کا یہ فرمان ”حج اور پیغمبر اسلامؐ کے درمیان رشتہ“ کی واضح اور روشن دلیل ہے کہ پیغمبرؐ کی رحلت کے بعد بھی حج کی قبولیت کو آپؐ کی قبر مطہرہ پر حاضری سے مربوط کیا گیا ہے۔

حج کی ابتداء مکہ سے اور اختتام مدینہ پر کرنے کے فلسفہ کے بارے میں سورہ حج کی آیت ۲۹ کی تفسیر میں جمع کی تکمیل کو امامؑ کی ملاقات سے مربوط اور مشروط قرار دیا گیا ہے یعنی مدینہ جانے کا مقصد صرف روضہ رسولؐ کی زیارت ہی نہیں بلکہ امامؑ وقت سے ملاقات بھی ہے۔ بعض احادیث کی رُو سے بھی تکمیل حج کو لقاء امامؑ سے مربوط اور مشروط قرار دیا گیا ہے۔

سورہ اعراف کی آیت ۳۳ میں شریعت میں موجود تمام واجبات اور محرمات کے دو پہلو بیان کئے گئے ہیں۔ ایک اس کا ظاہری پہلو اور دوسرا باطنی۔ ہر عمل کے دو پہلو ہیں ظاہری پہلو اس کا بدن ہے اور باطنی پہلو اس کی روح ہے اور وہ روح امامؑ وقت اس سے وابستگی اور اس کے راستے پر گامزن ہونا ہے۔ اسی طرح محرمات کا ظاہری پہلو اس کا بدن ہے اور باطنی پہلو اس حرام فعل کی روح ہے اور وہ روح وقت کا باطل امامؑ اس سے وابستگی اور اس کی راہ کو اپنانا ہے۔ اپنے وقت کا باطل امامؑ ہی ان محرمات کو فروغ دینے کا سبب بنتا ہے چنانچہ اس آیت ہی سے

استدلال اور نتیجہ اخذ کرتے ہوئے امام حسنؑ اور امام سجادؑ دونوں نے کعبہ، رکن و مقام، صفا و مروہ، عرفات، منیٰ اور سعی و طواف کی روح و جان اہل بیت اطہارؑ کو قرار دیا ہے۔

چنانچہ کعبہ اور امام وقت کے درمیان یہ رشتہ اور ربط ہی اس امر کا سبب تھا کہ آئمہ اطہارؑ تمام تر ناگوار اور نا سازگار حالات کے باوجود ایام حج میں خود کو کسی نہ کسی طرح حرم اور جواری کعبہ میں پہنچاتے تھے۔ اس کعبہ سے ان کے گہرے رشتہ کا گویا یہ اعلان ہے۔ لیکن ۶۰ ہجری میں جب امام حسینؑ نے یہ دیکھا کہ غاصب متولیان بیت الحرامؑ اس بیت اللہ اور حج کے ظاہری چہرے کو بھی مسخ کرنے کا عزم و ارادہ کئے ہوئے ہیں تو آپؑ ان کے ناپاک اور منحوس عزائم سے حجاج کرام اور عالم اسلام کو آگاہ کرنے کے لئے عین ایام حج میں حج اور کعبہ کو چھوڑ کر نکلے تاکہ لوگوں کے ذہنوں میں یہ سوال چھوڑ جائیں:

حجاج اور حرم کا عاشق یہ حسینؑ کیوں اس حج و حرم کو چھوڑ کر نکلنے پر مجبور ہوا؟

### امام حسینؑ عراق سے باز رکھنے کی کوشش

امام حسینؑ نے جب حج کو ترک کر کے عراق کی طرف روانگی کا عزم کیا تو اس وقت کی اجتماعی، سیاسی اور مذہبی شخصیات اور ان کے علاوہ آپؑ کے دوست و احباب حتیٰ مخالفین نے بھی آپؑ کو اس سفر سے باز رکھنے کی کوشش کی اور مشورہ دیا کہ آپؑ اس سفر کا اردہ ترک کر دیں اور عراق کی طرف نہ جائیں۔ جن لوگوں نے آپؑ کو اس سفر سے باز رکھنے کی کوشش کی ان میں سرفہرست یہ افراد ہیں:

(۱) عبداللہ بن جعفر: یہ آپؑ کے ابن عم اور حضرت زینت = کے شوہر تھے۔

انہوں نے آپؑ کو مشورہ دیا کہ آپؑ اس سفر سے اجتناب فرمائیں کیونکہ اس سفر میں آپؑ اور آپؑ کے اہل و عیال کی جان کو خطرہ ہے۔ اگر آپؑ کو کوئی حادثہ پیش آیا تو روئے زمین تاریک ہو جائے گی۔

(۲) عبداللہ ابن عباس: انہوں نے کہا کہ آپؑ ایسی قوم کی طرف سفر کر رہے ہیں جس نے اپنے امامؑ کو شہید کیا۔ مجھے ڈر ہے کہ یہ لوگ آپؑ کو تنہا چھوڑ دیں گے اور آپؑ کو دھوکہ دیں گے۔ اگر یہ لوگ واقعی مخلص ہیں تو پہلے اپنے امیر کو بر طرف کر دیں۔

(۳) محمد ابن حنفیہ: انہوں نے آپؑ سے فرمایا کہ آپؑ اہل عراق کو بہتر جانتے ہیں۔ ان لوگوں نے آپؑ کے پد ریز رگوار اور آپؑ کے برادر عزیز کے ساتھ خدا اور بے وفائی کی۔ آپؑ کے ساتھ بھی یہ ویسا ہی سلوک کریں گے۔

(۴) عبداللہ ابن زبیر: عبداللہ ابن زبیر نے کہا آپؑ ایسے لوگوں کی طرف جا رہے ہیں جنہوں نے آپؑ کے والد اور آپؑ کے بھائی کو قتل کیا۔

(۵) ابو بکر خزومی: انہوں نے کہا آپؑ ایسی قوم کی طرف جا رہے ہیں جنہوں نے آپؑ کے والد کو اور اس کے بعد آپؑ کے بھائی کو قتل کیا۔ میں ان سب کو جانتا ہوں یہ اہل دنیا ہیں جو آپؑ کو دعوت دے رہے ہیں یہی لوگ آپؑ سے جنگ کریں گے اور آپؑ کو تنہا چھوڑیں گے۔

(۶) جابر بن عبداللہ انصاری: آپؑ نے امامؑ سے استدعا کی کہ آپؑ مکہ کو نہ چھوڑیں

(۷) عبداللہ مطیع: انہوں نے کہا کہ جو بنی امیہ کی اس قوم کے ہاتھ میں ہے اگر آپؑ وہ طلب کریں گے تو وہ آپؑ کو کچھ نہ دیں گے بلکہ آپؑ کو قتل کریں گے خدا کے لئے آپؑ کو فہ کی طرف نہ جائیں۔

(۸) مسور بن مخرمہ نوفل زہری: اس نے کہا کہ آپؑ کو فہ والوں کے خطوط کے دھوکے میں نہ آئیں۔ اگر یہ لوگ سچے ہیں اور سچ کہتے ہیں تو ان سب کو یہاں آنا چاہیے اور آپؑ کو ایک شان و شوکت کے ساتھ لے جانا چاہیے۔

(۹) عبداللہ بن عمر: اس نے مشورہ دیا کہ آپؑ یہاں سے حرکت نہ کریں اور جس

دروازے سے قوم داخل ہوئی ہے آپؑ بھی اسی دروازے سے داخل ہوں تو بہتر ہے۔

(۱۰) سعید بن مسیب: انہوں نے کا حسینؑ اگر مکہ سے نہ کلتے تو بہتر تھا۔ (کتاب

حیات امام حسینؑ ج سوم، ص ۲۳ تا ۲۵)

ان سب نے اپنی اپنی سوچ اور فکر کے مطابق امامؑ کو مشورہ دیا کہ آپؑ اس سفر سے باز رہیں۔ ان مشورہ دینے والوں کی منطق یہ تھی۔

☆۔ اس سفر میں امامؑ کی جان کیلئے خطرہ ہے۔

☆۔ یہ لوگ اہل غدر ہیں بے وفائیں آپؑ کو دھوکہ دیں گے۔

☆۔ آپؑ کے دشمن قوی اور طاقتور ہیں۔

☆۔ یہ لوگ جنہوں نے آپؑ کو دعوت دی ہے سب اہل دنیا ہیں جب ان کی دنیا خطرے میں پڑے گی تو یہ آپؑ کا ساتھ نہیں دیں گے۔

### مشورے کی حیثیت آیات قرآنی اور سیرتِ آنحضرتؐ کی روشنی میں

آیا نبی اور امام کو اپنے کاموں میں کسی سے مشورہ لینا چاہیے یا نہیں اور اگر کوئی مشورہ دے تو اس پر عمل کرنا چاہیے یا نہیں۔ اس کے علاوہ پیغمبر مرسل اور امیر المؤمنینؑ کا اپنے دور میں کیا طریقہ کار رہا یہ جاننے کے لئے ہمیں اس کا سرسری جائزہ لینا ہوگا۔

☆ قرآن کریم کی سورہ آل عمران کی آیت ۱۵۹ کے مطابق پیغمبرؐ امور ہیں کہ

لوگوں کے ان امور میں کہ جو خود ان سے مربوط ہیں ان سے مشورہ کریں۔

☆ سورہ مبارکہ شوریٰ کی آیت ۳۶ میں مؤمنین کی صفت بیان کی گئی ہے کہ وہ اپنے

امور آپس کے مشورے سے طے کرتے ہیں۔ (کتاب نظام الحکم فی الشریعت والتاریخ ص ۲۷)

جبکہ احد کے موقع پر جب پیغمبرؐ کو خبر ملی کہ کفار قریش اچانک حملہ کرنے والے

ہیں تو آپؑ نے اپنے اصحاب سے مشورہ لیا کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ آیا ہم شہر مدینہ میں رہ کر دفاع

کریں یا شہر سے باہر نکل کر ان کا مقابلہ کریں۔ یہاں تک کہ آپؑ نے عبداللہ بن ابی سلول (منافق) کو بھی ملا کر اس سے مشورہ لیا۔

جنگ بدر کے موقع پر بدر سے نزدیک ایک چشمہ تھا۔ پیغمبرؐ وہاں پہنچے تاکہ وہاں سے اپنا دفاع کریں تو حباب بن منذر نے پیغمبرؐ سے پوچھا کہ آیا یہاں آپؑ کا آنا وحی اور خدا کے حکم کے تحت ہے۔ اگر ایسا ہے تو ہمیں اس کی مخالفت کا کوئی حق نہیں پہنچتا اور اگر یہ آپؑ کی ذاتی رائے ہے یا جنگی ٹیکنیک ہے تو ہمیں مشورہ دینے کا حق ہے۔ پیغمبرؐ نے فرمایا کہ یہ میری ذاتی رائے ہے تو انہوں نے مشورہ دیا کہ ہمیں یہاں نہیں رکنا چاہیے بلکہ آگے بڑھ کر دفاع کرنا چاہیے چنانچہ اس مقام کو چھوڑ کر وہ آگے چلے گئے۔

سچ البلاغہ کلام ۶۸ میں امیر المؤمنین حضرت علیؑ فرماتے ہیں کہ جب میں نے مصر میں ہاشم بن عقبہ کو والی بنانے کیلئے کہا تو تم لوگوں نے اصرار کیا کہ محمد بن ابی بکر کو مصر کا والی بنا کر بھیجیں۔ اگر میری بات مانی جاتی تو وہ قتل نہ ہوتے اور یہ دن نہ دیکھنے پڑتے۔

سچ البلاغہ کلام ۲۰۵ کے مطابق جب طلحہ وزبیر نے حضرت علیؑ پر اعتراض کیا کہ آپؑ نے امور مملکت میں ہم سے مشورہ نہیں لیا تو حضرتؑ نے فرمایا کہ مجھے ابھی تک کوئی مسئلہ پیش نہیں آیا جب ضرورت پڑی تو تم لوگوں نے اور دوسرے مسلمان بھائیوں سے مشورہ لوں گا۔

چنانچہ مشورہ ایک شرعی حکم ہے البتہ کس سے مشورہ لینا چاہیے اور کس امر میں مشورہ لینا ہے اس سلسلے میں قرآن میں احکام موجود ہیں کہ مشورہ ان ہی لوگوں سے لینا چاہیے جن کا متعلقہ امور میں کوئی کردار ہو۔ چنانچہ سورہ احزاب کی آیت ۱۳۶ اور سورہ انعام کی آیت ۱۲۲ میں بیان کیا گیا ہے کہ امت کو ان امور میں مشورہ دینے کا کوئی حق نہیں ہے جو امور ان سے مربوط نہیں ہیں۔



### کوفہ

امام حسینؑ کے مقدس قیام کے سلسلے میں جس تیسری منزل کا نام آتا ہے وہ کوفہ ہے جسے آپؑ نے اپنے قیام ذہنت کے لئے انتخاب فرمایا۔ بلدا میں مکہ مکرمہ جیسے شہر کو ایک حساس موقع پر چھوڑا آپؑ کا کوفہ کا رخ کرنا ایک ایسا مسئلہ ہے جو قارئین کے ذہنوں میں بہت سے سوالات پیدا کرتا ہے کیونکہ عوام کوفہ اور اہل کوفہ کے بارے میں عام طور پر اچھے تاثرات نہیں رکھتے۔

آپؑ کے مکہ چھوڑنے کے بارے میں ہم ایک تفصیلی اور سیر حاصل بحث پہلے کر چکے ہیں۔ یہاں ہم کوفہ کے بارے میں عام تاثرات، وہاں کے لوگوں کے معائب و محاسن، کوفہ کی خصوصیات اس شہر کی سیاسی اور اجتماعی تاریخ پر ایک مفصل بحث کریں گے تاکہ اس کی روشنی میں امامؑ کے اپنے قیام ذہنت کے لئے اس شہر کو انتخاب کرنے کے اسباب و عوامل کو سمجھنے میں مدد مل سکے۔

### کوفہ کی تسمیہ

جغرافیائی معاجم کے مطابق اس کو ’کوفہ‘ اس لئے کہتے ہیں کہ اس علاقے کے درمیان ایک چھوٹا سا پہاڑ ہے جسے ’کوفان‘ کہتے ہیں۔ اسی مناسبت سے اس شہر کا نام ’کوفہ‘ پڑ گیا۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ اس سرزمین میں ایک سنگریزہ پایا جاتا ہے جسے اہل عرب ’کوفہ‘ کہتے ہیں لہذا اس سنگریزے کے نام پر اس کا نام ’کوفہ‘ ہو گیا۔

### کوفہ عوام کی سطحی نظر میں

عموماً لوگ اہل کوفہ کے بے وفا اور وعدہ خلاف کہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کوفہ بے وفا، وعدہ خلافی اور عہد شکنی کا شکوہ کرنا ہو تو ضرب المثل کے طور پر اسے ’کوفی‘ کے نام سے یاد کرتے

کوفہ کے بارے میں بدبین اور منفی تاثرات رکھنے والے لوگ اپنے جواز میں نہج البلاغہ سے حضرت امیر المومنینؑ کے بعض خطبات اور مکتوبات کا حوالہ بھی دیتے ہیں۔ (خطبہ، ۲۵، ۲۰، ۵۷، اکتوبر ۱)

اس کے علاوہ یہ لوگ عقیلہ قریش جناب زہد کبریٰ اور جناب فاطمہ صغریٰ = کے ان خطبات کے ابتدائی کلمات کا بھی حوالہ دیتے ہیں جو انہوں نے کوفہ کے بازار میں ارشاد فرمائے۔ حضرت علیؑ کے دورِ خلافت کے آخری ایام میں آپؑ کی پریشانیوں اور امام حسنؑ کی ”کویش آنے والی صورتِ حال کو بھی کوفہ کی مذمت میں اپنی دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ظلم و جور اور فتنہ و فساد کی تمام جڑیں یہیں سے پھوٹیں۔

لیکن حقائق کو سمجھنے کیلئے کسی مسئلہ کو سطحی نقطہ نظر سے دیکھنا نکتہ کافی ہے اور نہ صحیح بلکہ اس کیلئے تحقیقی نظر سے جائزہ لیا ضروری ہے۔

### کوفہ تحقیقی نقطہ نظر سے

کوفہ ایک ظرفِ اقلیم ہے، منبعِ علماء ہے، خلفاء کا پسندیدہ اور اصحابِ کامر کرہ ہجرت ہے۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہؑ کی جائے پیدائش ہے۔ یہ فقہاء، قراء، اہلِ طب، حکماء، زہاد اور نجیب لوگوں کا ٹھکانہ جائے درس و تدریس، بحث و مباحثہ اور زہد و عبادت ہے۔

آب و ہوا کے لحاظ سے یہ صحابی جلیل القدر حضرت سلمان فارسی اور حذیفہ یمانی کا مورچہ پسند اور منتخب کردہ شہر ہے۔ نہر فرات یہاں سے گزرتی ہے جس کا پانی خوشگوار ہے۔ قدیم شہر بابل جس کا ذکر سورہ بقرہ کی آیت ۱۰۲ میں آیا ہے اسی کوفہ کے بارے میں ہے۔ امیر المومنین حضرت علیؑ کو ان کوفہ والوں کی ہی وجہ سے تین جنگوں میں فتح نصیب ہوئی۔

### کوفہ کی فضیلت

کوفہ کی فضیلت میں بہت زیادہ روایات وارد ہوئی ہیں۔

روایت میں ہے کہ ”کوفہ طور سینا کی تاویل ہے“۔

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا:

”کوفہ میں ایک درہم صدقہ دینے کا ثواب دوسری جگہوں پر سو درہم صدقہ دینے کے

برابر ہے“۔

”مکہ خدا کا حرم ہے، مدینہ پیغمبر اسلامؐ کا اور کوفہ امیر المومنین امام علیؑ کا حرم ہے“۔

امام حسنؑ فرماتے ہیں:

”کوفہ میں اتنی جگہ کہ جہاں ایک آدمی بیٹھ سکے مجھے مدینہ کے پورے گھر کے مقابلے

میں زیادہ پسند ہے“۔

ایک شخص نے امام جعفر صادقؑ سے عرض کیا: ”میں نے اپنی ساری املاک

فروخت کر دی ہے اب آپؑ مجھے مشورہ دیں کہ کیا میں مکہ میں سکونت اختیار کروں؟“

آپؑ نے فرمایا: نہیں، کیونکہ اہل مکہ کھلم کھلا کفر کے مرتکب ہوتے ہیں۔

اس نے پوچھا: کیا مدینہ میں رہائش اختیار کروں؟

آپؑ نے جواب دیا: نہیں، یہ اس سے بھی بدتر ہے۔

اس نے پوچھا: پھر میں کہاں سکونت اختیار کروں؟

آپؑ نے فرمایا: عراق جاؤ کہ وہاں سے کوفہ کی برکت بارہ میل کے فاصلے پر ہے۔

وہاں حضرت نوحؑ اور حضرت ابراہیمؑ کی قبور کے علاوہ تین سو ستتر انبیاء اور چھ سو اوصیاء کی قبور ہیں۔

اس کے علاوہ اسی کوفہ میں امیر المومنین امام علیؑ کی قبر مطہر ہے۔

امام جعفر صادقؑ ہی سے مروی ہے:

”کوئی نبی اور کوئی مقرب فرشتہ ایسا نہیں کہ جو کوفہ میں داخل ہوا ہو اور اس نے مسجد کوفہ

میں نماز نہ پڑھی ہو“

امام جعفر صادقؑ نے ایک گروہ سے پوچھا: تم لوگ کہاں سے رہنے والے ہو؟ انہوں نے جواب دیا: ہم کوفہ کے رہنے والے ہیں۔

آپؑ نے فرمایا: دوسرے شہروں کے رہنے والوں کے مقابلے میں اہل کوفہ ہم سے کہیں زیادہ محبت کرتے ہیں جب دوسرے لوگوں نے ہم سے دشمنی کی تو تم اہل کوفہ نے ہماری پیروی کی جب دوسرے لوگوں نے ہماری محافظت کی تو تم اہل کوفہ نے ہمارے حقانیت کی تصدیق کی۔ اس کے بعد آپؑ نے ان کے حق میں دعا فرمائی:

”خداوند عالم تمہیں ہماری ہی جیسی حیات عطا فرمائے اور ہماری ہی جیسی موت نصیب فرمائے۔“

حضرت علیؑ بصرہ جاتے وقت جب میقات پر پہنچے تو اہل کوفہ نے ان کا استقبال کیا اور کہا: تمام حمد اس خدا کے لئے جس نے آپؑ کی قربت سے ہمیں نوازا اور آپؑ کی نصرت کرنے کی ہمیں توفیق عطا فرمائی۔

حضرتؑ نے جواب میں فرمایا:

”اے اہل کوفہ! تم تمام مسلمانوں میں سب سے زیادہ محترم ہو سب سے زیادہ راہ ہدایت اور صراطِ مستقیم پر قائم رہنے والے ہو دوسروں کے مقابلے میں اسلام تمہارے حصے میں زیادہ نصیب ہوا ہے اہل عرب میں سب سے زیادہ جو دو کرم رکھتے ہو پیغمبر اسلامؐ اور ان کی آل سے زیادہ محبت رکھنے والے ہو ہم تمہارے وعدے پر بھروسہ کر کے آئے ہیں۔“

زین العابدین حضرت امام سید سجادؑ نے اہل کوفہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

”اہل کوفہ! مرحبا! تمہاری نسبت ہمارے ساتھ ایسی ہی ہے جیسی نسبت جسم کو لباس کے ساتھ ہے۔“

امام سجادؑ ہی سے منقول ہے:

”حضرت جبرئیلؑ نے پیغمبر اسلامؐ سے فرمایا کہ علیؑ ایک ایسے شہر میں شہید ہوں گے جہاں وہ ہجرت کریں گے وہی شہر ان کا اور ان کی اولاد کا مرکز ہوگا وہاں ان کی آزمائشیں بھی ہوں گی اور ان پر مصیبتیں بھی نازل ہوں گی۔“

حضرت سلمان فارسی نے اہل کوفہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

”اے اہل کوفہ! تم قبۃ اسلام ہو“

کوفہ اور دمشق کے درمیان دو سو پچاس فرسخ کا فاصلہ ہے خداوند عالم نے تمام زمینوں میں سے مکہ کو منتخب فرمایا اور اسے کعبہ سے زینت دی مدینہ کو پیغمبر اسلامؐ سے مزین کیا اور کوفہ کو امیر المؤمنین امام علیؑ کے ذریعے زینت بخشی۔“

امام علیؑ نے فرمایا:

”کوفہ کی مٹی ہم سے ہے ہم اس سے محبت کرتے ہیں خداوند! تو اسے دور رکھ جو کوفہ سے دوری اختیار کرے اور اس سے دشمنی رکھ جو کوفہ سے دشمنی کرے“ [مستدرک سفیہ البحار ج ۹]

لہذا کسی چیز کی تعریف و تہنیت، عیب و حسن اور اچھائی و برائی کے بارے میں صرف ایک زاویہ نگاہ سے دیکھنا جالی صفت ہے جو ایک آنکھ رکھتا ہے اور اسی سے دیکھا ہے۔ تصور کے صرف ایک رخ کو دیکھنے والا کبھی حقائق سے ہمکنار نہیں ہوتا۔ دنیا کی بہت سی چیزیں بیک وقت عیب و حسن، اچھائی اور برائی، ضرر و نفع دونوں صفتوں کی حامل ہوتی ہیں اس لئے باریک بینی اور دقیق نظروں سے ان کا جائزہ لینا چاہیے اور ان کی برائیوں سے بچنا اور خوبیوں سے استفادہ کرنا چاہیے۔ اسی لئے معصوم کا فرمان ہے:

”عقل انسان وہ ہے جو دو برائیوں کے درمیان کم تر برائی اور بدتر برائی کے درمیان فرق کر سکے اور دو خوبیوں کے درمیان خوب اور خوب تر میں تمیز کر سکے۔“

چنانچہ یہ شہر کوفہ بھی جہاں اپنے دامن میں ظلم و جور کی داستانیں سمیٹے ہوئے ہے وہیں

اس کا دامن جانثاری اور فداکاری کی داستانوں سے بھی مالا مال ہے۔

لہذا تصویر کے دونوں رخ سامنے رکھتے ہوئے کوفہ کی خوبیوں اور برائیوں کے اسباب و علل کو تلاش کرنا چاہیے۔ اس لئے ضروری ہے کہ کوفہ کی معاشرتی ترکیب اور اس کی سیاسی تاریخ کے پس منظر کو سامنے رکھا جائے تاکہ ہم کسی صحیح نتیجے تک پہنچ سکیں۔

### کوفہ کی سیاسی تاریخ

۱۵ ہجری میں خلیفہ دوم حضرت عمر ابن خطاب نے قادیسیہ کو فتح کرنے کے لئے خود لشکر کی قیادت کرنے کا ارادہ کیا۔ لیکن حضرت علیؑ نے ان کو جانے سے روکا۔ چنانچہ خلیفہ نے صلاح مشورے کے بعد سعد بن ابی وقاص کو لشکر کا سپہ سالار بنا کر قادیسیہ روانہ کیا جسے باب عراق کہا جاتا ہے۔ سعد بن ابی وقاص کے لشکر میں تقریباً سات یا آٹھ ہزار فوجی تھے جن میں ستر اصحاب بدر اور ایک سو بیس فتح مکہ میں شرکت کرنے والے مجاہدین تھے۔ اس پورے لشکر میں ایک ہزار اصحاب پیغمبر بھی شامل تھے۔ اُدھر ایرانی لشکر کی قیادت رستم کر رہا تھا جس کے لشکر میں تیس ہزار سے زائد فوجی تھے۔ قادیسیہ کے مقام پر دونوں لشکروں کا مقابلہ ہوا، مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی ایران کے بہت سے فوجی مارے گئے، کچھ گرفتار ہوئے اور باقی لوگوں نے راہ فرار اختیار کی۔

قادیسیہ کی فتح کی خبر جب حضرت عمر کو ملی تو انہوں نے سعد بن ابی وقاص کو وہیں قیام کرنے اور قادیسیہ ہی کو مستقر بنانے کی ہدایت کی لیکن وہاں کی ماسازگار آب و ہوا کی وجہ سے اسلامی لشکر کے فوجیوں کی صحت خراب ہونے لگی تو حضرت عمر نے کسی موافق اور سازگار آب و ہوا کے حامل ایسے خوشگوار اور شاداب علاقے کو تلاش کرنے کا حکم دیا جس کے درمیان کوئی دریا حائل نہ ہو۔ چنانچہ حضرت سلمان فارسی اور حذیفہ یمانی نے سرزمین کوفہ کو تلاش کیا۔

محرم ۱۷ ہجری کو لشکر اسلام جس کی تعداد اب چالیس ہزار ہو چکی تھی

یہاں پہنچا اور رہائش اختیار کی۔ انہوں نے یہاں دارالامارہ تعمیر کیا اور ایک مسجد بنائی۔ رفتہ رفتہ بصرہ اور کوفہ اسلام کے بڑے فوجی مراکز میں شمار ہونے لگے اور کوفہ اسلام کے فوجی کیمپ کا بہت بڑا مرکز بن گیا۔ اسی وجہ سے اس کو کوفہ الجند بھی کہتے ہیں۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا کہ کوفہ اسلام کے بڑے مراکز میں شمار ہوتا تھا۔ کوفہ کا گورنر ہی آذربائیجان، ہمدان، ابوزار، اصفہان، موصل اور قر قیسا کو کنٹرول کرتا تھا۔

۱۷ ہجری کہ جب یہ سرزمین اسلامی جغرافیہ کے حدود میں شامل ہوئی، سے لے کر ۶۱ ہجری تک ہم ان والیان کی ترتیب وار ایک فہرست پیش کریں گے جو کوفہ کے حکمران رہے۔ ان میں سے ان گورنروں کا مختصر حال بھی بیان کریں گے جن کا سیاسی، اقتصادی اور اجتماعی حیثیت سے اس سرزمین سے متعلق کوئی نمایاں کردار رہا ہے۔ کوفہ کے عوام کے مقدرات پر ان گورنروں کا جو اثر مرتب ہوا اس پر بھی کسی حد تک بحث کریں گے۔ ان میں وہ دو گورنر بھی ہیں جو صرف چند دنوں یا چند مہینوں کے لئے عارضی طور پر اس منصب پر رہے۔

اسلامی قلمرو میں شامل ہونے کے بعد حضرت علیؑ کے سنبھالنے تک کوفہ ایک صوبہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ حضرت علیؑ اور حضرت امام حسنؑ کے دور خلافت میں کوفہ اسلامی حکومت کا دارالخلافہ رہا، یہ دور کوفہ کا وہ تابناک اور درخشان دور ہے جس میں کوفہ کے لوگ اہل بیت پیغمبرؑ اور ائمہ اطہارؑ کے عاشق و شیدا بنے اور بعد کے دور میں کوفہ والیان اور دوستداران اہل بیت کی توجہ کا مرکز رہا۔

امیر معاویہ کے دور خلافت میں شام دارالخلافہ اور کوفہ پھر صوبہ یا دارالامارہ بنا۔

۱۷ ہجری سے لے کر ۶۱ ہجری تک کوفہ کے گورنروں کی فہرست کچھ اس طرح ہے:

(۱) سعد بن ابی وقاص: ۱۷ ہجری میں کوفہ کے گورنر بنے، معاویہ کے دور خلافت میں

انہوں نے اپنے قصر عتیق میں وفات پائی اور جنت البقیع میں دفن ہوئے۔ اہل کوفہ کی شکایت پر کہ

یہ صحیح نماز نہیں پڑھاتے حضرت عمر نے ان کو معزول کر کے عمار یا سر کوفہ کا گورنر مقرر کیا۔

(۲) عمار یا سر: ۲۷ ہجری میں ۹۳ سال کی عمر میں وفات پائی اور رقبہ میں دفن ہوئے۔

اہل کوفہ نے جب ان کی شکایت کی کہ وہ ضعیف و کمزور ہیں تو حضرت عمر نے ان کو ہٹا کر جبیر ابن مطعم کو کوفہ کا گورنر بنایا۔

(۳) جبیر ابن مطعم: مغیرہ ابن شعبہ نے خلیفہ سے اس کی شکایت کی اور خود اپنی

گورنری کی خواہش کی تو حضرت عمر نے اس کی جگہ مغیرہ بن شعبہ کو کوفہ کا گورنر بنایا۔

(۴) مغیرہ بن شعبہ:

(۵) سعد بن ابی وقاص: ۲۴ ہجری میں مغیرہ بن شعبہ کو معزول کر کے دوبارہ

سعد بن ابی وقاص کو کوفہ کا گورنر بنایا گیا۔

(۶) ابو موسیٰ اشعری: ۲۴ ہجری میں کوفہ میں وفات پائی۔

(۷) ولید بن عقبہ بن ابی معیط: ۲۶، ۲۵ ہجری میں گورنر بنا کر ۶۱ ہجری میں وفات

پائی۔

(۸) سعید بن العاص بن سعید بن العاص: ۳۴ ہجری میں اہل کوفہ نے اس کو نکال

دیا۔

(۹) قرطہ بن کعب الانصاری: ۵۳ ہجری میں کوفہ کے گورنر بنے۔

نوٹ:

۳۵ ہجری میں حضرت علی خلیفہ بنے اور کوفہ دار الحکومت بنا۔

(۱۰) عقبہ بن عمرو بن ثعلبہ انصاری بدری: صفین جاتے ہوئے حضرت علی نے انہیں

والی بنایا۔

(۱۱) مغیرہ بن شعبہ: ۴۱ ہجری میں دوبارہ کوفہ کا گورنر بنا اور ۴۹ ہجری تک گورنر رہا۔

(۱۲) زیاد بن ابیہ: ۴۹ ہجری میں کوفہ کا گورنر بنا اور ۵۳ ہجری میں وفات پائی۔

(۱۳) عبداللہ بن خالد بن اسیر بن ابی الغیس مخزومی۔

(۱۴) ضحاک بن قیس بن خالد فہری قریشی: امیر معاویہ کی پولیس کا سربراہ تھا

۵۳ ہجری میں کوفہ کا گورنر بنا "واہ" کے مقام پر قتل ہوا۔

(۱۵) عبدالرحمن بن عبداللہ بن عثمان بن ربیعہ ثقفی بن ام حکم (معاویہ کی بہن):

۵۶ ہجری میں کوفہ کا گورنر بنا ۵۹ ہجری میں معزول ہوا اور ۶۶ ہجری میں وفات پائی۔

(۱۶) نعمان بن بشیر بن سعد بن طالبہ انصاری خزرجی: ۵۹ ہجری میں کوفہ

کا گورنر بنا اور ۶۵ ہجری میں قتل ہوا۔

(۱۷) عبید اللہ بن زیاد بن ابیہ: ۶۱ ہجری میں کوفہ کا گورنر بنا۔

### سعد بن ابی وقاص

سعد بن ابی وقاص بن مالک بن احیب (یا وحیب) بن عبد مناف قریشی تھے۔ سترہ

سال کی عمر میں اسلام لائے۔ پیغمبر اسلام سے پہلے انہوں نے ہجرت کی۔ بعض اہل سنت کے

نزدیک عشرہ مبشرہ کا جو تصور ہے اس میں شامل ہیں۔

حضرت عمر کے دور خلافت میں اہل فارس سے جنگ کیلئے جانے والے لشکر کی قیادت

کا شرف ان کو حاصل ہوا اور قادیسیہ کی ایرانی امپریلزم (Imperialism) کی نخوت و تکبر کو شکست دینے

میں کامیاب ہوئے۔ لہذا انہیں فاتح قادیسیہ کا لقب ملا۔ حضرت عمر کی وفات کے موقع پر انہیں بھی

چھ رکنی امیدواران خلیفہ میں قرار دیا گیا۔ لیکن یہ اپنی امیدداری اور رائے حق سے عبدالرحمن بن

عوف کے حق میں دستبردار ہو گئے کیونکہ یہ دونوں آپس میں رشتہ دار اور ایک ہی قبیلہ (بنی زہرہ)

سے تعلق رکھتے تھے۔ حضرت عمر سے لے کر حضرت عثمان کے دور خلافت تک کئی بار کوفہ کے

گورنر بنے اور معزول ہوئے۔ چنانچہ ۲۴ ہجری میں حضرت عثمان نے مغیرہ بن شعبہ کو معزول

کر کے سعد بن ابی وقاص کو کوفہ کا گورنر بنایا، ۲۵ ہجری میں سعد بن ابی وقاص کو معزول کر کے ولید بن عقبہ کو کوفہ کا گورنر بنایا۔ ۳۰ ہجری ولید بن عقبہ کو معزول کر کے پھر سعد بن ابی وقاص کو کوفہ کا گورنر بنایا۔

اپنے دورِ خلافت میں معاویہ انہیں اپنے ساتھ حج پر لے گیا۔ اعمالِ حج کے بعد دارالندو میں معاویہ نے حضرت علی ابن ابی طالب کی شان میں گستاخی کرتے ہوئے ان پر سب و شتم کا سلسلہ کیا تو سعد بن ابی وقاص فی کہا:

”کیا ہمیں تم نے اس لئے بلایا ہے کہ ہم علی پر سب و شتم سنیں؟ ہم علی بن ابی طالب کی شان میں کسی قسم کی سب و شتم سننے کے لئے تیار نہیں۔ کیونکہ خدا اور اس کے رسول نے انہیں ایسے فضائل اور شرف سے نوازا ہے کہ ان میں سے ایک بھی ہمیں نصیب ہو جائے تو وہ پوری دنیا و ما فیہا کے برابر ہے۔“

حضرت عثمان کے قتل کے بعد سعد بن ابی وقاص نے حضرت علی کی بیعت کرنے سے انکار کیا تو حضرت نے ان سے فرمایا:

”کیا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر تم پر واجب نہیں؟ ہم اگر غلطی پر ہیں تو ہمیں غلطی سے روکا اور اگر ہم حق پر ہیں تو ہمارا ساتھ دو۔ اس پر سعد بن ابی وقاص نے علی سے کہا: آپ مجھے کوئی ایسی تلوار دے دیں جو مومن اور فاسق میں تمیز کر سکے۔“

حضرت علی نے جواب دیا: عثمان اگر غلطی پر تھے تو وہ اپنی غلطی کی وجہ سے قتل ہوئے۔ اس لئے ان کے حامی غلطی پر ہیں اور اگر وہ صحیح اور حق پر تھے تو تم نے ان کا ساتھ کیوں نہیں دیا؟“

۵۱ ہجری میں معاویہ نے سعد بن ابی وقاص کو زہر دے کر قتل کیا۔

### عمار یاسر

آپ کا نام عمار بن یاسر بن عامر بن مالک بن کنانہ بن قیس بن الحصین بن اودیم بن

ثعلبہ بن عوف بن حارثہ بن عامر بن عامر بن عامر بن عامر اور کنیت ابو الیقطان ہے۔ آپ کی والد یاسر یمن سے مکہ آئے اور ابو حذیفہ بن مغیرہ سے ان کی ملاقات ہوئی اس نے اپنی کنیز سمیہ کو ان کے عقد میں دیا جن کے لطن سے عمار پیدا ہوئے۔

ابو حذیفہ نے عمار کو آزاد کر دیا۔ عمار ان کے والد اور والدہ تینوں مسلمان ہو گئے جس کی پاداش میں انہیں سخت اذیتیں برداشت کرنا پڑیں۔ جب انہیں بہت زیادہ زود و کوب کیا گیا اور اذیتیں دی گئیں تو مجبور ہو کر زبانی طور پر انہوں نے پیغمبر اسلام سے بے زاری کا اظہار کیا اس پر خداوند عالم نے یہ آیت نازل فرمائی:

﴿مَنْ كَفَرَ بِاللَّهِ مِنْ بَعْدِ إِيمَانِهِ لَا يَسْمَعُ الْكَلِمَةَ الْكافِرِ وَاللَّهُ يَسْمَعُ الْكَلِمَةَ الْكافِرِ﴾ (نمل، ۱۰۶)

ایمان لاکر اللہ کا منکر ہو سوا اس کے کہ جسے مجبور کیا جائے اور اس کا دل ایمان پر جما ہوا ہو، (نمل، ۱۰۶)

ان کی والدہ کو ابو جہل نے قتل کیا چنانچہ اسلام کی راہ میں وہ پہلی شہید خاتون ہیں۔

بعض مورخین نے لکھا ہے کہ عمار یاسر نے حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ مدینہ میں مہاجرین اولین میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ انہوں نے دونوں قبیلوں کی طرف نماز پڑھی۔ مدینہ میں پیغمبر اسلام نے جب مسلمانوں کے درمیان آپس میں رشتہ اخوت کا قائم کیا تو انہوں نے عمار اور حذیفہ کے درمیان اخوت قرار دی اور عمار اور حذیفہ کو ایک دوسرے کا بھائی بنایا۔ اسلام لانے والوں میں ان کا شمار ساتویں نمبر پر ہوتا ہے۔ سب سے پہلے جس نے مسجد تعمیر کی وہ عمار تھے۔

پیغمبر اسلام اور امیر المومنین حضرت علی دونوں نے عمار کو طیب ابن طیب کا لقب دیا۔ پیغمبر اسلام نے فرمایا:

”ایمان، عمار کی ہڈیوں کی جڑوں تک پیوست ہو چکا ہے۔“

”عمار حق کے اور حق عمار کے ساتھ ہے۔“

”جس نے عمار سے دشمنی کی اس نے خدا سے دشمنی کی، جس نے عمار کو ناراض کیا اس

نے خدا کو ناراض کیا۔“

پیغمبر اسلامؐ نے ایسی حالت میں دنیا سے رحلت فرمائی کہ وہ عمار اور ابن مسعود سے خوش تھے۔ عمار یا سر جبکہ بدر سے لے کر تمام جنگوں میں شریک رہے۔ جبکہ پیامہ میں ان کا ایک کان ضائع ہوا۔ ناکشیں اور قاسطین کے خلاف جنگ میں وہ حضرت علیؑ کے ساتھ ساتھ رہے۔ پیغمبر اسلامؐ کے اس قول کے مطابق کہ ”عمار حق کے اور حق عمار کے ساتھ ہے“۔ صفین کی جنگ میں وہ حق کی علامت کے طور پر پہچانے جاتے تھے لوگ عمار کے گرد تھے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ حق اسی طرف ہے جس طرف عمار ہیں۔ جب عمار شہید ہوئے تو دو شامی یہ دعویٰ کرتے ہوئے آپس میں جھگڑ رہے تھے کہ عمار کو میں نے قتل کیا ہے۔ اس پر عمر بن عاص نے کہا:

”حیف ہے تم پر کہ تم جہنمی ہونے پر ایک دوسرے سے سبقت کرنے پر فخر کر رہے ہو۔“

حضرت عثمان نے اپنے دور خلافت میں جب حضرت ابوذر غفاری کو جلا وطن کیا تو ان کی جلا وطنی اور عالم غربت میں ان کی موت پر عمار یا سر نے سخت احتجاج کیا۔ اس کے علاوہ ولید ابن عقبہ اور حضرت عثمان کے خلاف اسلام اعمال اور اقدامات پر انہوں نے جب احتجاج کیا تو انہیں زود و کوب کیا گیا یہاں تک ان کی شکم میں زخم ہو گیا۔

اہل کوفہ نے جب کوفہ کے گورنر سعد ابن ابی وقاص کی شکایت کی تو حضرت عمر نے سعد بن ابی وقاص کی جگہ عمار یا سر کو کوفہ کا گورنر اور عبداللہ بن مسعود کو وزیر بنا کر بھیجا اور اہل کوفہ کے نام خط لکھا کہ یہ دونوں نبجائے اصحاب محمدؐ ہیں ان کی اقتدا کی جائے۔

پیغمبر اسلامؐ نے عمار سے فرمایا: ”تمہیں ایک باغی قوم قتل کرے گی“

چنانچہ ۳۷ ہجری میں صفین میں معاویہ کے خلاف جنگ میں ۹۳ سال کی عمر میں یہ صحابی رسولؐ معاویہ کے لشکر کے ہاتھوں مقام رقا میں شہید ہوئے۔ آج بھی ان کا مزار مولیان اور دوستان اہل بیت کیلئے زیارت گاہ بنا ہوا ہے۔ (از کتاب تہذیب الہندیہ)

### جبیر بن مسلم

اس کا نام جبیر ابن مسلم تھا اور کنیت ابو محمد یا ابو عدی تھی۔ یہ شخص حضرت ابو بکر کا خاص شاگردوں میں سے تھا۔ پیغمبر اسلامؐ کے نکاح میں آنے سے قبل حضرت عائشہ کا رشتہ ان سے طے ہوا تھا۔ دور جاہلیت میں بنی امیہ کے حلیفوں میں سے تھا اور اس زمانہ میں بہت بڑا نسب شناس مانا جاتا تھا اور اپنی قوم میں محترم شخص سمجھا جاتا تھا۔ حضرت امیر حمزہ کو اسی شخص کے حبشی غلام نے شہید کیا تھا۔ اس نے اپنے اس حبشی غلام سے وعدہ کیا تھا کہ تو اگر محمدؐ کو قتل کر دے تو میں تجھے آزاد کر دوں گا اگر علیؑ کو قتل کر دے تو بھی تو آزاد ہے اور اگر حضرت حمزہ کو قتل کر دے تب بھی میں تجھے آزاد کر دوں گا۔ جبیر ابن مسلم جبکہ بدر میں اسیر ہوا یہ طلقاء میں سے تھا اور فتح مکہ کے موقع پر آزاد ہوا۔

یہ پیغمبر بن شعبہ سے پہلے کوفہ کا گورنر رہا اور ۵۸ یا ۵۹ ہجری میں اس نے وفات پائی۔

### ابوموسیٰ اشعری

اس کا نام ابوموسیٰ بن عبداللہ بن قیس بن سلیم بن ہزار بن حرب بن عامر بن عنبر بن بکر بن عامر بن عذر بن وائل بن ماجیہ بن جماہیر بن اشعر تھا، کنیت ابوموسیٰ اور تخلص اشعری تھا۔ پیغمبر اسلامؐ کی ہجرت سے پہلے مکہ آیا، اسلام لایا۔ اس کے بعد حبش ہجرت کی۔ فتح مکہ یا فتح خیبر کے بعد مدینہ آیا۔ پیغمبر اسلامؐ نے زبیر یاعدن میں اس کو والی بنا کر بھیجا۔ حضرت عمر نے اس کو پہلے بصرہ اور پھر کوفہ کا گورنر بنایا، جس پر حضرت عثمان بھی رضامند ہو گئے۔

حضرت علیؑ کی خلافت کے ابتدائی دور میں یہ کوفہ کا گورنر رہا۔ جبکہ جمل کے موقع پر یہ لوگوں کو حضرت علیؑ کے لشکر میں شریک ہونے سے روکتا تھا اور جنگ میں شریک ہونے کو حرام قرار دیتا تھا۔ بعد میں عمار یا سر مالک اشتر اور امام حسنؑ نے اس کو ہٹایا۔

جبکہ صفین میں اس نے شرکت نہیں کی لیکن حکیم کے موقع پر لوگوں نے اس

کو اپنا نمائندہ بنانے پر حضرت علیؑ کو مجبور کیا۔ حکیم کے موقع پر حضرت علیؑ کا نمائندہ بن کر ان سے اپنی دیرینہ دشمنی کی بناء پر اس نے عمر بن عاص سے کہا کہ نہ علیؑ کو خلیفہ بننے دیا جائے اور نہ معاویہ کو بلکہ کسی اور کو خلیفہ بنا دیا جائے۔ عمر بن عاص اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا اور خوش ہو گیا کہ خود علیؑ کا نمائندہ ہی علیؑ کو معزول کر رہا ہے۔ اس طرح اس احمق نمائندے نے علیؑ کو خلافت سے معزول کیا۔

۲۲ یا ۲۳ یا ۵۰ ہجری میں ابو موسیٰ اشعری نے مکہ یا کوفہ میں وفات پائی۔ (تہذیب ج ۵، ص ۳۱۷)

### ولید بن عقبہ بن ابی معط

۲۶ھ میں حضرت عثمان نے کوفہ سے سعد بن ابی وقاص کو ہٹا کر اپنے مادری بھائی ولید بن عقبہ بن ابی معط کو کوفہ کا گورنر بنایا۔ یہ ۲۶ھ سے ۲۹ھ تک کوفہ کا گورنر رہا۔

ولید بن عقبہ نے کوفہ پہنچنے کے بعد عبداللہ بن مسعود سے بیت المال میں سے کچھ رقم قرض کے نام سے لی۔ مقررہ مدت کے بعد جب عبداللہ بن مسعود نے قرض کی واپسی کا مطالبہ کیا تو اس نے عبداللہ کے اس مطالبے کو اپنی شان میں جسارت اور گستاخی سمجھا اور حضرت عثمان سے اس کی شکایت کی۔

اس کا باپ عقبہ بن ابی معط مکہ کے ان لوگوں میں سے تھا جو پیغمبر گواذیت پہنچایا کرتے تھے۔ پیغمبر اسلام مقرر کیا کرتے تھے کہ خدا ہدایت عالم نے مجھے دو بدترین اور شریر ترین ہمسایوں یعنی ابولہب اور عقبہ بن ابی معط کے درمیان امتحان میں ڈالا ہے۔ عقبہ بن ابی معط ابولہب اور حکم بن عاص وہ افراد تھے جو جانوروں کا فضلہ اور غلاظت اکٹھا کر کے پیغمبر اسلام کے دروازے پر پھینکا کرتے تھے۔ سورہ فرقان کی آیات ۲۸ اور ۲۹ انہیں تینوں کی مذمت میں مازل ہوئیں۔

ولید بن عقبہ نے اپنی گورزی کے دور میں ایک مرتبہ اپنے مغنی اور ساتھیوں کے ساتھ شراب پی کر پوری رات نشہ میں گزارا اور صبح کی اذان ہوئی تو یہ مسجد میں گیا اور مہراب

میں آ کر نشہ کے عالم میں نماز فجر دو رکعت کی بجائے چار رکعت پڑھائی۔ لوگوں نے مسجد میں اسے جب یہ کہتے ہوئے سنا:

[اشرب واسقنی] تو اس پر پچھلی صف والوں نے کہا:

”خدا تجھے خیر دیکھنا نصیب نہ کرے۔ ہماری شکایت تجھ سے نہیں بلکہ اس سے ہے جس نے تجھ جیسے شخص کو ہمارا والی اور امیر بنا کر بھیجا ہے۔“

ایک دن وہ شراب پی کر اتنا بدست ہو گیا کہ اپنے صحن میں قے کی لوگ اسے اٹھاتے تھے تو وہ نہیں پاتا تھا۔ لوگوں نے اس کے دو مضمیادوں کے سامنے اس کے ہاتھ سے سرکاری مہر والی انگٹھی اتاری اور اسے اتار کر مدینہ روانہ ہو گئے وہاں حضرت عثمان کے سامنے اس کی اس غیر شرعی حرکت اور شراب پینے کی گواہی دی۔ خلیفہ نے اس کو بلا کر اس پر حد جاری کی اور اس کی جگہ سعید بن عاص کو کوفہ کا گورنر مقرر کیا۔ (تہذیب الکبریٰ علیٰ دینہ از طہ حسین ص ۱۹۸، مردج الذہب ج ۲، ص ۳۲۲)

### سعید بن عاص

اس کا نام سعید بن عاص اور کنیت ابو عثمان یا عبدالرحمن ہے۔ اس کا باپ عاص بن سعید حرک بدر میں حضرت علیؑ کے ہاتھوں قتل ہوا۔ پیغمبر اسلام کی وفات کے وقت اس کی عمر نو سال تھی۔ یہ حضرت عثمان کا قریبی رشتہ دار تھا اور انہیں کے ساتھ رہتا تھا۔ حضرت عثمان نے جب ولید بن عقبہ کو کوفہ کی گورزی سے معزول کیا تو سعید بن عاص کو اس کی جگہ گورنر مقرر کیا۔ اس وقت اس کی عمر بیس یا پچیس سال تھی۔ جب یہ کوفہ پہنچا تو اس نے اس منبر پر بیٹھنے سے انکار کیا جس پر ولید بن عقبہ بیٹھتا تھا اور کہا کہ یہ جگہ نجس ہو چکی ہے جب تک اس کو پاک نہیں کیا جائے گا میں اس پر نہیں بیٹھوں گا۔ منبر پر بیٹھنے کے بعد اس نے اپنے خطبہ میں اہل کوفہ کی مذمت کی اور انہیں اہل شقاق اور اہل نفاق کہہ کر مخاطب کیا۔

عبداللہ بن مسعود جو حضرت علیؑ کے صحابی تھے انہوں نے جب اس کی خوردبرد پر

اعتراض کیا تو اس نے کہا کہ ”عراق قریش کے جوانوں کے باغات میں سے ہے اس کی خوردبرد پر ہم کوردکنے والے تم کون ہوتے ہو؟“ اہل کوفہ نے اس کی زیادتیوں اور بد اعمالیوں کی شکایت جب حضرت عثمان سے کی تو انہوں نے جواب دیا کہ ”کیا تمہاری شکایتوں پر میں ہر گورز کو ہٹاتا رہوں؟“ ادھر سعید بن عاص نے بھی رشوت میں مہاجرین و انصار مدینہ کو کچھ تحائف پیش کئے اور کوفہ واپس آ کر کوفہ والوں کو پہلے سے بھی زیادہ نقصان پہنچایا۔

ایک مرتبہ ماہ رمضان کے آخر میں اس نے لوگوں سے چاند کے ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں پوچھا تو ہاشم بن عتبہ نے گواہی دی کہ میں نے چاند دیکھا ہے۔ ہاشم بن عتبہ بن سعد بن ابی وقاص کے بھتیجے اور حضرت علیؑ کے صحابی تھے ان کی ایک آنکھ کسی غزوہ میں شہید ہو چکی تھی۔ چاند دیکھنے کی گواہی دینے پر سعید بن عاص نے ان سے مضحکہ خیز انداز میں کہا کہ ”کیا تم نے اپنی اس نابینا آنکھ سے چاند دیکھا ہے؟“ ہاشم بن عتبہ نے جواب دیا کہ ”کیا تم میری اس آنکھ کا مذاق اڑاتے ہو جو میں نے خدا کی راہ میں دی ہے؟“ چونکہ انہوں نے خود اپنی آنکھ سے چاند دیکھا تھا اس لئے انہوں نے گھر آ کر اپنے اہل خانہ کے ہمراہ روزہ افطار کیا۔ اس پر سعید بن عاص نے ان کو زود کو بکھا اور ان کے گھر کو جلایا۔ اس پر ان کے بہن اور ان کا بھائی نافع بن عتبہ مالک اشتر کی قیادت میں کوفہ سے مدینہ گئے اور خلیفہ سے شکایت کی کہ اس کو گورزی سے ہٹایا جائے۔ سعید خود بھی مدینہ پہنچا۔ خلیفہ نے اس شکایت پر تمام گورزوں کو طلب کیا اور ان سے مشورہ طلب کیا۔ کسی نے مشورہ دیا کہ کوئی جنگ چھیڑ دی جائے اور اس میں سب کو مصروف کر دیا جائے، کسی نے رائے دی کہ لوگوں کو مال دے کر ان کی زبانیں بند کر دی جائیں۔ جب کہ سعید بن عاص نے کہا کہ ان تمام شکایتوں کے پیچھے علیؑ کا ہاتھ ہے اور وہی ان کی قیادت کر رہے ہیں لہذا انہیں قتل کر دیا جائے تو معاملہ خود بخود دھنڈا ہو جائے گا۔ حضرت عثمان ان تمام شکایتوں پر کوئی توجہ نہیں دی اور گورزوں کو واپس جا کر اپنا اپنا عہدہ سنبھالنے کی ہدایت کی۔ سعید بن

عاص کے واپس کوفہ پہنچنے سے پہلے ہی عمر بن عاص نے مالک اشتر کو اطلاع دی کہ سعید بن عاص اپنے عہدہ پر واپس آ رہا ہے۔ یہ خبر سن کر مالک اشتر اپنے ہمواؤں کے ساتھ راتوں رات کوفہ پہنچے دارالامارہ پر قبضہ کر لیا اور منبر پر جا کر یہ خطبہ دیا:

”سعید بن عاص پھر تمہارا والی بن کر واپس آ رہا ہے وہ یہ گمان کرتا ہے کہ جس سر زمین کو تم نے اپنی جانیں دے کر اور سرکٹا کر حاصل کیا ہے وہ زمین اور عراق کے باغات اس کی جاگیر اور مالِ فنی ہے۔ اٹھو اور اٹھ کر کوفہ اور حیرہ کے درمیان جمع ہو جاؤ۔“

سعید بن عاص جب عذیب کے مقام پر پہنچا تو مالک اشتر نے یزید بن قیس ارجی اور عبداللہ بن کنانہ عبدی کو پانچ پانچ سو فوجیوں کے لشکر کے ساتھ روانہ کیا اور ہدایت کی کہ سعید کو واپس جانے پر مجبور کر دو اور اگر وہ نہ مانے تو وہیں اس کو قتل کر دو اور اس کا سر لے کر واپس آؤ۔ ان دونوں لشکروں نے سعید کو عذیب پر روک دیا۔ اس نے بہانہ بنا کر کہا کہ وہ کوفہ جا کر واپس وہاں سے واپس چلا جائے گا۔ لیکن انہوں نے اسے کوفہ جانے کی اجازت نہیں دی۔ سعید بن عاص مدینہ واپس پلٹ گیا اور لشکر مالک اشتر کے پاس واپس آ گیا۔ کوفہ آ کر مالک اشتر نے ایک خطبہ دیا اور خدا کی حمد و ثناء کے بعد فرمایا:

”ہم نے جو کچھ کیا وہ خدا کی خوشنودی اور آپ لوگوں کے لئے کیا اس میں ہمارا کوئی ذاتی مقصد نہیں۔ ہم نے سعید بن عاص کو اپنے شہر سے بھگا دیا ہے، ہم اب ابو موسیٰ اشعری کو فوجی معاملات کیلئے اور خذیفہ یمانی کو بیت المال کیلئے مقرر کرتے ہیں۔“

یہ کہہ کر مالک اشتر منبر سے اترے اور ابو موسیٰ اشعری کو منبر پر جانے کی دعوت دی۔ ابو موسیٰ نے کہا کہ ”پہلے تم لوگ حضرت عثمان کیلئے تجدید بیعت کر دو جب تک تم لوگ ان کی بیعت کی تجدید نہیں کرو گے میں اس عہدے کو قبول نہیں کروں گا۔“ لوگوں نے اس کی بات کو قبول کیا اور حضرت عثمان سے تجدید بیعت کی۔ حضرت عثمان اگرچہ اس عمل سے راضی ہو گئے لیکن اس سے ان

کی خلافت کو دوچھپکا لگا۔ حضرت عثمان کے قتل ہونے تک ابو موسیٰ کوفہ کا گورنر رہا اور سعید بن عاص حضرت عثمان کے ساتھ ان کے گھر میں رہا۔ (تاریخ تہذیب و مشق ج ۶، ص ۱۳۳)

### قرطہ بن کعب الانصاری

قرطہ بن کعب بن طالبہ بن عمرو بن کعب الانصاری خزرجی پیغمبر اسلام کے صحابیوں میں سے تھے۔ یہ جبکہ احد میں پیغمبر کے ساتھ تھے اور اس کے بعد بھی تمام جنگوں میں شریک رہے۔ پیغمبر اسلام کے علاوہ یہ امیر المؤمنین حضرت علی (علیہ السلام) کے اصحاب میں سے بھی تھے۔ جبکہ جمل، جنگ صفین اور جنگ نہروان میں حضرت علی کے ساتھ رہے۔ جنگ صفین میں انصاری فوج کا پرچم ان کے ہاتھ میں تھا۔

جنگ جمل کے موقع پر جب ابو موسیٰ اشعری نے لوگوں کو حضرت علی کے لشکر میں شامل ہونے سے روکا تو حضرت امام حسنؑ، مالک اشتر اور حجر بن عدی نے ابو موسیٰ اشعری کو کوفہ کی گورنری سے معزول کر کے قرطہ بن کعب الانصاری کو کوفہ کا گورنر مقرر کیا۔

ان کے دو بیٹے تھے ایک بیٹے کا نام عمرو بن قرطہ تھا جو ۶ محرم کو امام حسین (علیہ السلام) کے لشکر میں شامل ہوا اور امام کے رکاب میں شہید ہوا جب کہ ان کا دوسرا بیٹا علی بن قرطہ عمر سعد کے لشکر میں شریک رہا۔

### مغیرہ بن شعبہ

کوفہ کے گورنروں میں سے ایک گورنر مغیرہ بن شعبہ تھا۔ مغیرہ ابن شعبہ مکہ و مدینہ میں اپنی مثال آپ تھا اس نے خیر و شر دونوں کو مخلوط کیا۔ اپنی جوانی کے زمانہ میں طائف کے ایک گروہ کو جو بارہ یا تیرہ افراد پر مشتمل تھا اپنے یہاں دعوت پر بلایا ان کو خوب شراب پلائی، شراب کے نشہ میں مدہوش ہو کر جب یہ غافل ہو گئے تو ان سب کو قتل کیا، ان کے تجارتی مال پر جو وہ مصر سے لائے تھے اپنا قبضہ کیا اور فرار ہو کر مدینہ آیا۔ یہاں آ کر پیغمبر اسلام کے ہاتھوں ایمان

لایا اور وہ مال جو وہ لے کر آیا تھا اسے پیغمبر کی خدمت میں پیش کیا لیکن پیغمبر نے وہ مال قبول کرنے سے انکار کیا کیونکہ اس نے دھوکے سے اسے حاصل کیا تھا۔

اگرچہ اس نے اسلام قبول کر لیا تھا لیکن اس کے حلق سے نیچے نہیں اترتا تھا صرف زبانی حد تک تھا۔ حضرت عمر نے اس کو بصرہ کا گورنر بنایا۔ اپنی گورنری کے دور میں یہ زنا کا مرتکب ہوا، جس کی شکایت لوگوں نے خلیفہ سے کی۔ یہاں تک کہ اس کے اس فحش فعل کے چار چشم دید گواہ بھی خلیفہ کے سامنے پیش ہوئے۔ تین گواہوں نے مکمل گواہی دی لیکن چوتھے گواہ زیاد بن ابیہ نے گواہی دیتے وقت جان بوجھ کر اپنی زبان میں نکلت پیدا کی اور رد کی صورت اختیار کی جس کی وجہ سے وہ حد جاری ہونے سے بچ گیا۔

مغیرہ بن شعبہ نے گورنری کا امیدوار کی حیثیت سے جب حضرت عمر کے سامنے خود کو پیش کیا تو حضرت عمر نے کہا کہ تم ایک فاسق انسان ہو، لیکن اس کے باوجود انہوں نے اسے گورنری کے عہدہ پر فائز کیا۔ کوفہ سے آنے والے لوگوں سے جب خلیفہ نے پوچھا کہ تمہارے گورنر کا کیا حال ہے تو لوگوں نے کہا کہ اس کی فسق و فجور کے بارے میں آپ ہم سے زیادہ جانتے ہیں۔

حضرت عثمان کے قتل کے بعد حضرت علیؑ کو اس نے مشورہ دیا کہ آپ سابق گورنروں کو ان کے مقام سے نہ ہٹائیں، لیکن حضرت علیؑ نے اس کے مشورے کو مسترد کر دیا جس کے بعد اس نے حضرت علیؑ سے دوری اختیار کر لی۔ جنگ جمل میں اس نے دونوں فریقین (یعنی حضرت علیؑ اور حضرت عائشہ) سے دوری اختیار کی۔ حکیم کے موقع پر بھی اس نے ایک کھیل کھیلا اور وہیں سے اس کا رجحان معاویہ کی طرف بڑھ گیا اور خرمی معاویہ سی جا کر مل گیا۔

زیاد بن ابیہ آذربائیجان میں حضرت علیؑ کی طرف سے گورنر مقرر تھا۔ مغیرہ بن شعبہ نے پیغمبر کی روایت کی صریحاً خلاف ورزی کرتے ہوئے زیاد بن ابیہ کو ابوسفیان کی طرف منسوب کرتے ہوئے اسے معاویہ کا نسبی بھائی بنانے کا اعلان کرانے میں رابطے کا ہم کردار ادا کیا۔

مغیرہ بن شعبہ کو جب یہ خبر ملی کہ معاویہ اسے کوفہ کی گورنری سے ہٹانے والا ہے تو یہ فوراً معاویہ کے پاس گیا اور اپنی گورنری بچانے کی خاطر اس نے خوشامد اور چالپوسی میں معاویہ کو یہ مشورہ دیا کہ وہ اپنے فرزند یزید کی ولی عہدی کا اعلان کر دے۔ مغیرہ کا یزید کی ولی عہدی کے اعلان کا یہ خبیث مشورہ اس کا ایک ایسا ناپاک اور مکروہ عمل تھا جس نے تاریخ اسلام کو ہلا کر رکھ دیا۔ اس کا یہ نتیجہ عمل اسلام و مسلمین کے لئے ناقابل تلافی صدمہ اور نقصان کا سبب بنا۔ پھر مغیرہ کی بے حیائی کی انتہا یہ ہے کہ اس نے واپس آ کر کہا کہ میں نے معاویہ کو ایک ایسے گڑھے کے کنارے لاکر کھڑا کیا ہے جہاں سے بچ نکلنے کا کوئی امکان نہیں۔

معاویہ کے دور میں یہ شخص تقریباً سات سال تک کوفہ کا گورنر رہا۔ اس تمام دور میں لوگوں کو سزا دینے اور تادیب کرنے میں اس نے صرف اس وجہ سے گریز کیا کہ اس میں (جیسا کہ وہ خود کہتا تھا) معاویہ کی تو بہتری تھی لیکن خود اس کی اپنی بربادی تھی۔ لیکن اس نے اس تمام مدت میں حضرت عثمان اور بنی امیہ کی مدح سرائی میں کبھی کوتاہی اور حضرت علیؑ پر سب و شتم کرنے میں کبھی دریغ نہیں کیا۔ اس کے سختی سے گریز اور زمی کارویہ اختیار کرنے کی وجہ سے خوارج اور شیعوں کو کوفہ کے اندر منظم ہونے اور تحریک کا موقع ملا۔ چنانچہ سیاست دان اور تجربہ نگار کہتے ہیں کہ دوسرے گورنروں کے مقابلہ میں اس نے کہیں زیادہ بیک وقت اپنے خلیفہ اپنی رعیت اور خود اپنے آپ کو راضی رکھا۔

### زیاد بن ابیہ

زیاد بن ابیہ کی ماں سمیہ نامی عورت حاملہ ہوئی اور زیاد ہجرت والے سال یا اس کے بعد شہر طائف میں پیدا ہوا۔ اس کی ماں سمیہ ایرانی یا ہندی تھی۔ یہ حارث بن گلہ کی کنیز تھی اور اس کے باپ کا نام عبید تھا جو رومی تھا۔ حارث نے سمیہ کو ایک رومی غلام کے عقد میں دیا۔ سمیہ کا شمار طائف کی بدکار عورتوں میں ہوتا تھا۔ اس کی رہائش گاہ پر ایک جھنڈا نصب ہوتا تھا جو اس

بات کی علامت سمجھا جاتا تھا کہ یہ بدکاری کا اڈہ ہے۔ سمیہ بدکاری کے پیشہ سے جو رقم حاصل کرتی تھی اس میں سے کچھ رقم حارث کو بطور ٹیکس ادا کرتی تھی۔

اسلام قبول کر کے زیاد جب مدینہ آیا تو اس کو زیاد بن ابیہ کہتے تھے، لیکن اس کا یہ نام زیادہ معروف نہیں تھا بلکہ زیادہ تر یہ زیاد بن سمیہ کے نام سے مشہور تھا بعد میں رفتہ رفتہ اسے ابن ابیہ یا ابن سمیہ کی بجائے زیاد والا میر کہنے لگے۔ ۴۴ ہجری میں جب یہ شخص حضرت علیؑ سے کٹ کر معاویہ سے جا ملا تو حکومت کے لوگ اسے زیاد بن ابی سفیان کہنے لگے جب کہ عام لوگ اس کو زیاد بن ابیہ ہی کہتے تھے۔

حضرت علیؑ کے دور خلافت میں حضرت علیؑ نے یا حضرت علیؑ کی طرف سے منصوب گورنر نے اس کو فارس اور آذربائیجان کا گورنر مقرر کیا۔ معاویہ نے اس کو حضرت علیؑ سے منحرف کرنے اور اپنے ساتھ ملانے کیلئے کوشش کی اور اسے دھمکی بھی دی۔ مغیرہ بن شعبہ جو انتہائی سازشی آدمی تھا اور اپنے مکرو فریب میں اپنی مثال آپ تھا، زیاد کو حضرت علیؑ سے کاٹ کر معاویہ سے ملانے کی کوشش میں مسلسل لگا ہوا تھا۔ یہاں تک کہ وہ امام حسنؑ کے دور میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے معاویہ کو مشورہ دیا کہ زیاد کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ نامعلوم باپ کا بیٹا ہے اگر تم اسے اپنے باپ سے منسوب کر کے ابوسفیان کا بیٹا اور اپنا بھائی قرار دے دو تو وہ تم سے آکر مل جائے گا۔ ادھر مغیرہ نے زیاد کو مشورہ دیا کہ تم کچھ اپنے مستقبل کے بارے میں سوچو، تم جو حسنؑ کی طرف داری کرتے ہو یہ تو ایک روز معاویہ سے صلح کر لیں گے، اس کے بعد تم بے سہارا ہو جاؤ گے، اس لئے بہتر یہ ہے کہ خلافت معاویہ کی طرف منتقل ہونے سے پہلے ہی تم معاویہ سے مل جاؤ، اس میں تمہاری بہتری ہے۔ زیاد بن ابیہ نے مغیرہ بن شعبہ کی اس تجویز کو اس شرط پر قبول کیا کہ بیت المالِ مسلمین کو اس کی ملکیت قرار دیا جائے اور معاویہ اس کے ابوسفیان کا بیٹا اور اپنا بھائی ہونے کا رسمی طور پر اعلان کرے۔ معاویہ اور زیاد کے درمیان بالواسطہ مذاکرات

کی کامیابی کے بعد زیاد کو دمشق بلا لیا گیا اور وہاں ایک عام اجتماع میں ابو مریم سلولی نامی شخص سے جو طائف میں شراب فروخت کرتا تھا گواہی دلوائی گئی۔ ابو مریم سلولی نے عام مجمع میں بطور شہادت اپنا تفصیلی بیان قلمبند کرایا کہ ابوسفیان نے زیاد کی ماں سمیہ سے زنا کیا۔ چنانچہ اس کے بعد اس زیاد بن سمیہ کی بجائے زیاد بن ابی سفیان کہا جانے لگا اور وہ اسی نام سے معروف ہوا۔ اس سازش کو اگرچہ باطل حکمرانوں کے مشن کی بہ ظاہر بڑی کامیابی سمجھا گیا لیکن اس کے نتیجے میں زیاد اور معاویہ دونوں فریقوں کو بدترین صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا۔ زیاد کو بھری مجلس میں اپنی ماں کے بارے میں ابو مریم سلولی کے شرمناک بیان سے ہمیشہ ایک احساسِ حقارت کا سامنا کرنا پڑا جب کہ معاویہ کو اس غیر شرعی فیصلہ اور اعلان پر لوگوں کے مذمتی بیانات کا سامنا کرنا پڑا جو یہ کہہ کر احتجاج کر رہے تھے کہ پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا تھا:

”بچھا سکا کہلاتا ہے جس کے بستر پر اس کی ماں سوتی ہے..... زانی کا نہیں۔“

۲۵ ہجری میں زیاد بن ابیہ بصرہ کا گورنر بنا۔ ۵۰ ہجری میں مغیرہ بن شعبہ کے مرنے کے بعد کوفہ کا گورنر بھی زیاد بن ابیہ ہی مقرر ہوا۔ یہ چھ مہینے کوفہ میں رہتا تھا اور چھ مہینے بصرہ میں۔ جب کوفہ میں رہتا تھا تو شمرہ بن جندب یا عمرو بن حریث کو اپنی جگہ مقرر کرتا تھا۔

زیاد بن ابیہ جب پہلی بار کوفہ میں گورنر بن کر آیا تو اس نے اپنے خطبہ کا آغاز خدا کی حمد و ثناء اور پیغمبر پر درود اور سلام کی بجائے لوگوں کو دھونس دھمکی سے شروع کیا اور انہیں خوف و ہراس میں مبتلا کیا۔ چنانچہ لوگوں نے اس کے اس خطبہ کو خطبہ ہترہ (ہتر) کا نام دیا۔ اس کے اشارہ پر شمرہ ابن جندب نے کوفہ اور بصرہ میں آٹھ ہزار افراد کو قتل کیا اور جب اس سے پوچھا گیا کہ اتنے لوگوں کو قتل کرتے ہوئے کیا کبھی تم کو افسوس اور پشیمانی نہیں ہوئی تو اس نے ڈھٹائی سے جواب دیا اور کہا کہ اگر میں وہاں تمام لوگوں کو بھی قتل کر دیتا تب بھی مجھے کوئی پشیمانی اور افسوس نہیں ہوتا۔ زیاد بن ابیہ نے اپنے دور میں بیت المالِ مسلمین کو ہڑپ کیا، لوگوں میں خوف

دو ہشت پھیلائی، حضرت علیؑ پر سب و شتم کو رواج دینے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی اور اس کی مخالفت کرنے پر حجر بن عدی اور ان کے تیرہ ساتھی عمرو بن حنق جیسے صحابی رسولؐ زیاد بن ابیہ اور معاویہ کے غیظ و غضب کا نشانہ بن کر قلمہ اجل بنے۔ طحسین لکھتے ہیں:

”زیاد بن ابیہ مکر فریب، چالاکی اور فہم و فراست میں مغیرہ بن شعبہ سے کہیں آگے تھا۔ اس نے نرم مزاجی، مدارتی سیاست اور لوگوں سے اچھے سلوک کی سنت خلفاء راشدین سے لی جب کہ جباریت اور طغویت کی رسم معاویہ سے لی۔ یہ دونوں چیزیں اس میں مرکب تھیں۔“

زیاد بن ابیہ نے جو تشدد کی خصلت اپنائی اس کے بارے میں طحسین لکھتے ہیں:

”زیاد اور معاویہ کے درمیان عرب کی روایات کے خلاف طے پانے والے طریقہ کار اور غیر شرعی طور پر ابوسفیان سے منسوب ہونے اور معاویہ کا بھائی قرار پانے کی رسم نے زیاد میں احساسِ کمتری اور لوگوں کی طرف سے اپنے لئے حقارت شدت سے پیدا کر دیا۔ لوگوں کی اس حقارت کو کم کرنے اور ان سے اس بارے میں سوچنے اور سمجھنے کا موقع چھیننے کی غرض سے اس نے اہل عراق پر تشدد کا یہ طریقہ کار اپنایا۔ اس کا ظلم و ستم اور تشدد اس حد تک پہنچا کہ جب اس نے سنا کہ شیعین علیؑ کے ستر افراد حضرت علیؑ پر سب و شتم کئے جانے کے خلاف ہیں تو اس نے ان کو بلا کر دارالامارہ کے دروازے پر کھڑا کیا اور فیصلہ کیا کہ ان میں سے ہر شخص دارالامارہ میں داخل ہوتے وقت علیؑ پر سب کرے اور جو انکار کرے اسے وہیں قتل کر دیا جائے۔ ابھی وہ اپنے فیصلہ کو عملی جامہ پہنانے نہیں پایا تھا کہ وہ اپنے قصر میں ایک عجیب درد میں مبتلا ہوا اور اسی درد میں ۵۳ ہجری میں اپنے بُرے اعمال کا نتیجہ بھگتنے کیلئے واصلِ جہنم ہوا“ (مروج الذهب ج ۳، ص ۳۰، ۱۵، یعقوبی ج ۲، ص ۲۱۸، ۲۳، تجارب الامم ج ۲، ص ۲۶، تفسیر الکبریٰ ش ۲۸، ص ۲۰۲)

### ضحاک بن قیس

اس کا نام ضحاک بن قیس اور کنیت ابو عبد الرحمن ابو سعید اہمیری قریشی ہے۔ ۵۰ ہجری

میں پیدا ہوا۔ اصحاب صفہ میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ یہ فتح دمشق میں شامل تھا اور فتح دمشق کے بعد اس نے وہیں سکونت اختیار کی۔ جب صفین میں یہ معاویہ کے ساتھ تھا۔ یزید کی دلی عہدی کی تائید کرنے والوں میں یہ بھی شامل تھا۔

سج البلاغہ میں امیر المومنین علیؑ کے خطبہ ۲۹ کے مطابق جب صفین کے بعد یہ شخص معاویہ کی طرف سے چار ہزار کا لشکر لے کر عراق کی سر زمین میں قتل و غارت گری اور خوف و ہشت پھیلانے پر مامور ہوا۔ معاویہ کی موت کے موقع پر اس کی نماز جنازہ میں شریک ہوا اور یزید کے خلافت سنبھالنے تک چند دن کیلئے اس نے خلافت بھی سنبھالی۔ یزید کے مرنے کے بعد اس نے زبیر کے لئے لوگوں سے بیعت لی اور اس کے بعد دوبارہ اپنے لئے لوگوں سے بیعت لی۔

۵۵ ہجری میں زیاد بن ابیہ کے مرنے کے بعد وقتی طور پر کچھ عرصے کی لئے عبداللہ بن خالد بن اسید کو کوفہ کا گورنر بنایا گیا، اس کے بعد ضحاک بن قیس کوفہ کا گورنر بنا اور ۵۸ ہجری میں اس کو معزول کیا گیا۔

یہ شخص اپنی قسوت اور شقاوت کیلئے مشہور تھا۔ بنی امیہ کی کاسہ لیس اور خصوصاً اہل بیتؑ کی دشمنی میں ہمیشہ پیش پیش رہا۔

### نعمان بن بشیر

نعمان بن بشیر بن سعد بن ثعلبہ بن خلاص ابو عبداللہ انصاری خزرجی کی پیدائش پیغمبرؐ کی مدینہ ہجرت کے ایک سال دو ماہ بعد ہوئی۔

نعمان انصاری اور عبداللہ بن زبیر مہاجرین میں پیغمبرؐ کی ہجرت کے بعد پیدا ہونے والے لڑکوں میں سے تھے۔ نعمان اور اس کے باپ نے سقیفہ میں انصاری کی مخالفت کرتے ہوئے سب سے پہلے حضرت ابو بکر کی بیعت کی۔ جب حضرت علیؑ خلیفہ بنے تو اس شخص نے امیر المومنین

کی بیعت نہیں کی بلکہ عثمان کی قمیص اور ان کی بیوی مانکہ کی کٹی ہوئی انگلی لے کر معاویہ کی طرف فرار ہو گیا۔ معاویہ نے ابو ہریرہ اور نعمان کو اس مطالبے کے ساتھ حضرت علیؑ کے پاس بھیجا کہ قاتلان عثمان کو ان کے سپرد کر دیں تاکہ ان سے قصاص لیا جائے۔

معاویہ جانتا تھا کہ علیؑ ایسا نہیں کریں گے، لیکن اس کا مقصد یہ تھا کہ جب یہ دونوں واپس آئیں گے تو اپنی زمان سے علیؑ کی مذمت کریں گے تو اہل شام کو متنفر کرنا آسان ہو جائے گا اور یہ دونوں بھی علیؑ سے دور ہو جائیں گے۔

جب یہ دونوں حضرت علیؑ کے پاس پہنچے تو آپؑ نے فرمایا:

”تم (نعمان) اپنی قوم میں ہدایت یافتہ انسان ہو تمہاری قوم (انصار) کے چار پانچ کے سوا تمام افراد میری پیروی کرتے ہیں۔ کیا تم ان چند افراد کے ساتھ رہو گے؟ تو اس نے کہا: خدا آپ کے امور کی اصلاح کرے۔ میں آپ کے ساتھ رہنے کے لئے آیا ہوں۔ میں معاویہ کا پیغام اس لئے لایا تاکہ آپ کے پاس آنے کا بہانہ مل جائے۔ اس کے بعد نعمان حضرت علیؑ کے پاس رہا جب کہ ابو ہریرہ دمشق واپس چلا گیا۔“

چند ماہ بعد نعمان پھر فرار ہو گیا۔ معاویہ کے پاس جاتے ہوئے عین التمر نامی جگہ پر حضرت علیؑ کے گورنر نے اس کو گرفتار کر کے زندان میں ڈال دیا، وہاں قطعہ بن کعب نے جو انصار سے تھے سفارش کر کے اسے آزاد کرایا۔ یہ جلد ہی فرار ہو کر معاویہ کے پاس پہنچ گیا۔ نعمان بن بشیر عثمانی العقیدہ تھا۔ معاویہ سے ایک ہزار کا لشکر لے کر عین التمر پر حملہ آور ہوا لیکن شکست کھا کر واپس چلا گیا۔

نعمان بن بشیر ان اشخاص میں سے تھا جو معاویہ کے فائدے کیلئے حدیث جعل کیا کرتے تھے۔ جنگ صفین میں معاویہ کے ساتھ انصار میں سے نعمان بن بشیر اور مسلمہ بن خویلد کے علاوہ کوئی اور نہیں تھا۔

معاویہ کے مرنے سے پہلے یہ شخص کوفہ میں معاویہ کی طرف سے گورنر تھا یہاں تک کہ معاویہ مر گیا۔ کوفہ کے شیعوں نے حضرت امام حسین کو کوفہ آنے کی دعوت دی۔ انہوں نے خط میں لکھا کہ ہم نعمان بن بشیر کے ساتھ جمعہ و جمعاعت نیز عیدین میں شرکت نہیں کرتے۔ جب حضرت مسلم بن عقیل کوفہ میں وارد ہوئے تو آپ نے مختار بن ابی عبیدہ ثقفی کے گھر میں قیام فرمایا اور کوفہ والوں سے امام حسین کے لئے بیعت لی۔

کوفہ والوں کی مسلم بن عقیل کے ساتھ اجتماعات اور سرگرمی دن بہ دن بڑھنے کے باوجود نعمان بن بشیر لائق اور تجاہل سے کام لیتا رہا اور کوفہ والوں کے امام حسین کے نمائندے کے ساتھ اظہار عقیدت کے اعلان اور ان کے گرد جمع ہونے کے خلاف کوئی اقدام نہیں کیا۔ چنانچہ کوفہ میں موجود بنی امیہ نواز شخصیات جن میں عمر بن سعد، عبداللہ بن مسلم بن ربیعہ خزرمی، امارہ بن عقبہ وغیرہ تھے سب نے مل کر نعمان سے مطالبہ کیا کہ وہ کوفہ میں بنی امیہ کے خلاف ہونے والی ان حرکات کے بارے میں اپنا موقف واضح کرے تاکہ اس تحریک کا سدباب کیا جاسکے۔ اس وقت نعمان بن بشیر منبر پر گیا اور حمد و ثنائے الہی کے بعد اس نے کہا:

”اے لوگو! میں کسی سے جنگ نہیں کروں گا جب تک کوئی مجھ سے نہ لڑے، میں کسی پر حملہ نہیں کروں گا سوا اس کے کہ جو مجھ پر حملہ آور ہو، میں کسی پر تہمت نہیں لگاؤں گا خدا کے بند و خدا سے ڈرؤ، فتنہ و فساد کی طرف جلدی نہ کرو جس میں خونریزی اور انسان کی ہلاکت اور تباہی اور اموال کا زیاں ہے۔ اگر تم نے مجھ سے منہ موڑ لیا اور بیعت کو توڑ لیا اور اپنے امام یزید کے خلاف اقدام کیا تو میں تمہیں تلوار سے قتل کروں گا جب تک یہ تلوار میرے ہاتھ میں رہے گی میں اس سے تہاڑوں گا چاہے میرا کوئی مددگار ہو یا نہ ہو اور چاہے میرا کوئی ساتھ دے یا نہ دے۔ میں جانتا ہوں کہ تم میں حق کو چاہنے والے باطل کے چاہنے والوں سے زیادہ ہوں گے“

یہ خطبہ سننے کے بعد عبداللہ بن مسلم بن سعید خزرمی نے کہا:

تمہاری یہ گفتگو غلط ہے۔ یہ بات جو تم نے کہی ہے اس میں دشمن کے خلاف رعب و دہرہ نہیں، تمہاری گفتگو سے کمزوری جھلکتی ہے۔ نعمان نے جواب دیا کہ خدا کی اطاعت کرتے ہوئے کمزوروں میں سے ہونا میرے لئے بہتر ہے بجائے اس کے کہ معصیت میں رہ کر طاقتور ہو جاؤں۔

عبداللہ بن مسلم اور عمر بن سعد نے فوراً ریزید کو خط لکھا کہ اگر کوفہ کو اپنے قبضے میں رکھنا ہے تو نعمان بن بشیر سے قوی تر شخص کو گورنر بنائے جو یہاں تحریک کو پکچل سکے۔

نعمان بن بشیر کے اس تجاہل اور زرم رویئے کی وجوہ پر غور کرنے سے پہلے حسب ذیل نکات قابل توجہ ہیں۔

دنیا میں قدیم زمانے سے لے کر دورِ حاضر تک حکومتوں کے ذیلی اداروں کے مسؤلین کا رویہ اور سلوک اپنی ماتحت رعیت کے ساتھ مختلف ہوتا ہے اور اپنے رئیس اور حاکم کے بارے میں نظریہ بھی مختلف ہوتا ہے۔

### (۱) مرکزی سیاست کی پاسداری

یعنی مرکزی سیاست کے کیا مقاصد ہیں؟ مرکز کو کس طریقے سے بچایا جائے؟ مرکزی

سیاست کا اجراء اور نفاذ کیسے کیا جائے؟

### (۲) ذاتی اور شخصی سیاست

ایک شخص خود لوگوں میں کس طرح محبوب القلوب رہے۔ کس طرح لوگوں پر اس

کا تسلط رہے۔ لوگ اسے کیسے اور کیونکر پسند کریں؟

### (۳) مرکز سے اختلاف نظر

مرکزی سیاست کے نفاذ کو مرکز کے مفاد میں نہیں پانا بلکہ اس وقت کا یہ اقدام مرکز کے

خلاف سمجھتا ہے۔ وہ وقتی طور پر مرکز کی ناراضگی کو مول لے لیتا ہے۔ مرکز کی طرف سے ہونے

والے عتاب کو برداشت کرنے کے لئے آمادہ رہتا ہے۔

اگر مرکز کو یہ احساس ہو جائے کہ یہ شخص مرکز کا مخالف ہے، مرکز کے حق میں نہیں تو مرکز اس کو کچل دیتا ہے۔ یا ختم کر دیتا ہے۔ لیکن اگر مرکز نے درک کیا کہ وہ مرکز کے خلاف نہیں بلکہ وہ مرکز کے حق میں ہے لیکن مرکز کی پالیسی سے اختلاف نظر رکھتا ہے تو اس وقت اس کو وقتی طور پر اس کے منصب سے ہٹا دیتا ہے اور کسی اور کو اس کی جگہ تعینات کر دیتا ہے۔ اس کے حق میں اتار چڑھاؤ کر کے اس پر اور اس کے رد عمل پر کڑی نگاہ رکھتا ہے۔

بعد میں اس کو معزول و برطرف کر دیتا ہے یا ترقی دے دیتا ہے۔ لہذا کسی بھی سیاسی شخصیت کے بارے میں جلد ہی کوئی رائے قائم کرنا درست نہیں۔ کبھی کوئی انسان حقیقتاً دیا نندار اور باضمیر ہوتا ہے۔ وہ وقتی مصلحت کے تحت کسی حکومت میں آتا ہے اور جو نہی اس کا ایمان خطرے میں پڑتا ہے وہ اس عہدے کو خیر باد کہہ دیتا ہے۔ مثلاً حرب بن یزید ریاحی جو عمر بن سعد کا ساتھ دیتے رہے، حسینؑ کا راستہ روکا، کوفہ نہ جانے دیا، کربلا میں لشکر ابن سعد میں رہے لیکن جب انہیں یقین ہو گیا کہ حسینؑ قتل کر دیئے جائیں گے، خود کو جنت اور جہنم کے درمیان پایا ایمان کو خطرے میں دیکھا تو لشکر سعد سے نکلے اور امام حسینؑ کی خدمت میں آ کر راہِ خدا میں جان دے دی۔

لہذا جب تک کسی کی زندگی کے تمام پہلوؤں کا گہرا مطالعہ نہیں کیا جائے اچھائی یا بُرائی کے بارے میں کوئی فیصلہ نہ کریں۔

ان تمام نکات کو سامنے رکھ کر نعمان ابن بشیر کے تجاہل اور زمی کا تجزیہ و تحلیل کرنے کے بعد ہی ہم کسی نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں۔

نعمان کے تجاہل کے اسباب

(۱) بہت سے سیاستدان ضعیف ارادہ اور قوتِ فیصلہ نہ رکھنے کی وجہ سے ہنگامی حالات میں جلد فیصلہ کر پاتے۔

(۲) نعمان ابن بشیر حجازی تھا۔ حجازیوں کی طبیعت میں غفلت، جمود اور عدم تحرک ہے۔

(۳) وہ اپنی صحابی رسولؐ کی حیثیت کو محفوظ رکھنے کا خواہاں تھا کیونکہ صحابی رسولؐ ہوتے ہوئے عام مسلمانوں کا خون بہانا مناسب نہیں سمجھتا۔ چہ جائیکہ وہ امام حسینؑ نواسہ رسولؐ کا خون بہانے میں شریک ہو۔ وہ اس بات سے گریز کرتا تھا اگرچہ صحابی رسولؐ کا احترام اس کے اندر بہت ضعیف اور کمزور تھا۔ ممکن ہے اس نے اپنی صحابیت کو بچانے کے لئے کوئی ایسا اقدام کرنے سے گریز کیا ہو کیونکہ وہ دیکھ رہا ہے کہ کوفہ امام حسینؑ کے بارے میں بے تاب ہے اگر کوئی اقدام کرے گا تو خون خرابہ کے بغیر مسئلہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتا۔

(۴) مسلم بن عقیل کا قیام مختار کے گھر تھا اور مختار نعمان ابن بشیر کا داماد تھا۔ اگر وہ کوئی اقدام کرنا تو زد میں اس کی بیٹی اور داماد آجاتے۔ ممکن ہے مسلم بن عقیل کے مختار کے گھر کو اپنی قیام گاہ بنانے کی وجہ بھی یہی ہو۔

(۵) وہ یزید سے خاص خوش نہیں تھا کیونکہ بنی امیہ بالعموم اور یزید بالخصوص انصار کو حقیر اور ذلیل سمجھتے اور نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے جس کی وجہ ہیں۔

(الف) جب پیغمبرؐ نے دعوتِ اسلام دینا شروع کی تو ابوسفیان مشرکین کی قیادت کرتے ہوئے پیغمبرؐ کی مخالفت میں کھڑا ہو گیا۔ اہل مدینہ نے پیغمبرؐ کو اپنے یہاں پناہ دی اور جب ابوسفیان نے حضرت محمدؐ کے خلاف جنگ کی تو انصار نے حضورؐ کا ساتھ دے کر معاویہ کے آباد و اجداد کو بدد اور احد میں قتل کیا۔

(ب) جب صفین اور دیگر جنگوں میں انصار نے علیؑ کا ساتھ دیا جب کہ معاویہ کے ساتھ نعمان ابن بشیر اور مسلمہ بن خالد کے سوا کوئی نہیں تھا۔

(۶) بہت سے سیاستدان حلم، صبر و تحمل اور نرم مزاجی سے مشکل سے مشکل مسائل کو حل کرتے ہیں اور اسی میں مشکلات کا حل مضمحل سمجھتے ہیں۔ نعمان ابن بشیر کی سیاست کا رخ اور اس کا سیاسی مزاج

نرمی پر قائم تھا۔ معاویہ نے اس کو اس نرم مزاجی کے سبب کوفہ کی گورنری پر مقرر کیا تھا۔ کیونکہ سفاک اور قسی القلب زیادہ بن ابیہ کے دور کی سفاکی نے اہل کوفہ کے دلوں میں بنی امیہ کے خلاف نفرت پیدا کر دی تھی۔ وہ بنی امیہ کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے لہذا معاویہ نے نعمان ابن بشیر کی نرم مزاجی کی بناء پر اس کو کوفہ کا گورنر بنایا۔ نعمان اپنی نرم مزاجی سے حالات کو ڈھیل دیتا رہا۔ دہر کوفہ میں امام حسین کے حق میں آواز بلند ہو چکی تھی۔ اس نے سوچا کہ اگر ان حالات میں کوئی قدم اٹھایا گیا تو ممکن ہے بنی امیہ کی حکومت کے زوال کا سبب بنے۔ اگر ایسا ہوا تو خود یزید کی حکومت کی طرف سے موروثی اعتبار قرار دیا جاسکتا ہے اور دوسری طرف اہل کوفہ کی طرف سے بھی موروثی اعتبار قرار پائے۔ دوسری صورت میں چونکہ اپنے آقا کا نمک خوار تھا اس کے سامنے جوابدہ تھا۔ ان کے حالات کے پیش نظر یہ بڑی حرکت تھی، یہ بنی امیہ کے خلاف ایک چھوٹی سی جھڑپ نہ تھی۔ لہذا اس کے بارے میں مرکزی حکومت کو فیصلہ کرنا چاہئے۔ چنانچہ مرکز سے فیصلہ صادر ہونے تک نعمان مسئلہ کو ڈھیل دیتا رہا۔ اس کی پالیسی کے دلائل یہ ہیں۔

(الف) اس نے اپنے خطبہ میں کہا کہ اگر لوگ دارالامارہ کی طرف بڑھیں گے اور حکومت کے زوال کے لئے قدم اٹھائیں گے تو میں ان سے آخری دم تک تنہا لڑوں گا۔

(ب) جب عبید اللہ ابن زیاد دارالامارہ کے دروازہ پر پہنچا تو اس نے اسے امام حسین سمجھا اور امام حسین سمجھ کر کہا کہ دارالامارہ میرے پاس امانت ہے میں آپ کے سپرد نہیں کروں گا۔ ابرائے مہربانی یہاں سے چلے جائیں۔

(ج) اس نے اہل کوفہ سے کہا کہ ”اپنے امام وقت یزید کی اطاعت کریں اور بیعت نہ توڑیں۔“ اگر وہ شریف انسان ہوتا تو یزید کو کسی صورت اپنا امام قرار نہ دیتا۔ اگر وہ خود کو جمہوریت کا علمبردار سمجھتا تھا تو یزید کی حکومت کے جبر و تشدد اور رشوت ستانی پر قائم ہونے کے باوجود وہ یزید کی اطاعت کی دعوت کیوں دیتا ہے۔ اس عمل سے تو وہی خوش ہو سکتا ہے جو یزید کے ساتھی

کو اہل حق اور اس کے مخالف کو اہل باطل کہتا ہے۔

(د) وہ اگر امام حسین کے لئے دل میں نرم گوشہ رکھتا اور دل سے یزید کی حکومت کا مخالف ہوتا تو کوفہ کی گورنری چھوڑ کر امام حسین کے ساتھ مل جاتا یا کم از کم مستعفی ہو جاتا لیکن آخری دم تک اس نے دارالامارہ کو بقول اس کے بنی امیہ کی امانت سمجھا اور اس کی حفاظت کرتا رہا۔

(ہ) اگر اس کی یہ نرم مزاجی اور سستی یزید کی مخالفت پر مبنی ہوتی تو یزید اس کو اس سستی کے نتیجہ میں اس منصب سے ہٹا کر موروثی اعتبار قرار دیتا اور اس کو محض کا گورنر نہ بناتا۔ بلکہ نعمان تو یزید کے مرنے تک محض کا گورنر رہا۔ یزید کے مرنے کے بعد اس نے عبد اللہ ابن زبیر کی بیعت کی۔ جب اہل محض نے عبد اللہ ابن زبیر کے خلاف بغاوت کی تو نعمان وہاں سے فرار ہو گیا۔ جس پر خالد نے اس کا تعاقب کر کے محض ہی میں اسے قتل کر دیا۔

اس تمام تجزیہ و تحلیل کے بعد اس کا یہ جملہ کہ ”اطاعت خدا میں کمزور ہونا مجھ پسند ہے اور معصیت خدا میں مبتلا ہو کر صاحب عزت ہونے سے بہتر ہے۔“ محض منافقت پر مبنی ہے اور اس کے عقیدے کی ترجمانی نہیں کرتا۔ اگر وہ امام حسین کے قیام کے موقع پر امام کے خلاف اقدام کو معصیت سمجھتا تھا تو امام کو شہید کئے جانے کے بعد وہ کیوں یزید کے پرچم تلے رہا۔

عبید اللہ ابن زیاد بن ابیہ

عبید اللہ ابن زیاد وہ ظالم سفاک اور سستی ترین انسان تھا جس کے جرائم اور اس کی ماں کا نام مرجانہ تھا۔ یہ شہنشاہ ایران کے مجوسی خاندان سے تعلق رکھتی تھی ایک فاحشہ زانیہ اور فاجرہ عورت تھی۔ عبید اللہ کا باپ زیاد بھی مجرمانہ ذہنیت کا آدمی تھا جو کسی نامعلوم شخص کے نطفہ سے پیدا ہوا اسی وجہ سے وہ اپنی ماں کی نسبت سے زیادہ بن سمیہ کے نام سے مشہور ہوا بعد میں معاویہ نے اپنی سیاسی ضروریات کے تحت اس کو اپنے باپ ابوسفیان سے منسوب کر کے اسے اپنا بھائی بنایا۔ تاریخ میں یہ زیاد بن ابیہ کے نام سے مشہور ہے۔ عبید اللہ اسی زیاد بن ابیہ کے نطفہ سے

پیدا ہوا۔ اس طرح عبید اللہ کو ماں اور باپ دونوں کی طرف سے سفاکی اور شقاوت ورش میں ملی۔ عبید اللہ کے پیدا ہونے کے بعد اس کے باپ نے اس کی ماں مرجانہ کو طلاق دے دی اور اس طرح یہ شقی انسان اپنی زانیہ اور فاحشہ ماں مرجانہ کے زیر تربیت رہا۔ بعد میں اس کی ماں مرجانہ نے شیرہ نامی شخص سے عقد کر لیا۔ بڑا ہونے کے بعد عبید اللہ کو اس کے باپ ابن زیاد نے تعلیم و تربیت کے لئے پھر اپنے دامین شقاوت میں لے لیا۔ معروف زاہد حسن بصری اس شقی انسان کو غلام سفیہ قرار دیتے ہیں۔

اس کی ماں چونکہ ایرانی تھی اور اس کا بچپن اپنی ماں کی ہی تربیت میں گزرا اس لئے عبید اللہ عربی زبان روانی سے نہیں بول سکتا تھا۔ یہ مرض جوع البقر میں مبتلا تھا جس میں بسیار خوری کے باوجود پیٹ نہیں بھرتا۔

۵۳ ہجری میں جب اس کا باپ زیاد ابن ابیہ اپنی مجرمانہ زندگی کے انجام کو پہنچا تو اپنے باپ کے منصب پر مقرر کئے جانے کی خواہش لے کر یہ معاویہ کے پاس دمشق گیا۔ معاویہ نے اس کے باپ کی مجرمانہ خدمات کے صلہ میں اس کو خراسان کا گورنر مقرر کیا۔ اس کی ماہلیت نا تجربہ کاری اور بڑے کردار کی وجہ سے اہل خراسان نے جب اس کی شکایت کی تو معاویہ نے اسے معزول کر کے ۵۵ ہجری میں بصرہ کا گورنر بنایا۔

۶۰ ہجری میں معاویہ اپنے آخری ایام میں اپنے شاطرانہ ذہن اور سیاسی دوراندیشی کی بنیاد پر اس وقت کے حالات کا غور سے جائزہ لے رہا تھا۔ اسے اپنے خلاف اہل کوفہ کی نقل و حرکت ان کی مدینہ کی طرف آمد و رفت اور امام حسینؑ کی سرگرمیوں کی رپورٹیں مدینہ کے گورنر کی طرف سے مسلسل مل رہی تھی۔ معاویہ اپنی آخری عمر میں تشدد اور تصادم سے بچنے کی کوشش میں تھا تا کہ دنیا سے جاتے وقت لوگوں میں نیک نامی حاصل کر سکے۔ وہ حسینؑ ابن علیؑ سے ٹکر لینے کے نتائج سے بخوبی آگاہ تھا اور کوفہ کی بڑھتی ہوئی بے چینی کی وجہ سے بھی وہ بہت

پریشان تھا۔ وہ کوفہ کو کنٹرول کرنے اور شیعوں کو دبانے کے لئے کسی زیاد ابن ابیہ جیسے جنایت کار شخص کی سختی سے ضرورت محسوس کر رہا تھا۔ وہ اسی شش و پنج میں تھا کہ ایسا شخص کہاں سے لے کر آئے کہ یکا یک اس کے ذہن میں عبید اللہ ابن زیاد کا چہرہ ابھرا اور اس نے اسے کوفہ پر مسلط کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ حکم نامہ تحریر کرایا لیکن یہ حکم نامہ ابھی جاری نہیں ہو پایا تھا کہ معاویہ دنیا سے سدھار گیا۔

کوفہ میں ایک عرصے سے بنی امیہ کے ظلم و ستم کی چکی میں پسے والوں کو جب معاویہ کی موت کی خبر ملی تو انہوں نے سکون کا سانس لیا۔ اسی دوران اہل کوفہ کو دوسری بشارت یہ ملی کہ ان کے مولیٰ و آقا امام حسین علیہ السلام نے یزید کی بیعت سے انکار کر کے اپنے قیام و انقلاب کا آغاز مکہ سے کر دیا ہے۔

یہ اطلاع ملتے ہی امام کے حکم کے منتظر یہ جاٹا ران امام جلیل صحابی سلیمان ابن صرد و خزامی کے گھر میں جمع ہوئے، پیہم مذاکرات اور گفت و شنید کے بعد امام کو کوفہ آنے کی دعوت دینے کے لئے مسلسل خطوط اور نمائندے مکہ روانہ کئے۔ جب کثیر تعداد میں خطوط اور نمائندے آپ کے پاس پہنچے تو آپ نے اپنے خاندان کے عزیز ترین فرد مسلم ابن عقیل کو اپنا نمائندہ بنا کر کوفہ روانہ کیا۔ اہل بیت کے شیدائیوں نے جب اہل بیت کے نمائندہ مسلم ابن عقیل کو کوفہ روانہ کیا۔ اہل بیت کے شیدائیوں نے جب اہل بیت کے نمائندہ مسلم ابن عقیل کو دیکھا تو ایک مرتبہ ان میں خوشی کی لہر دوڑ گئی، آنکھوں میں خوشی اور محبت کے آنسوؤں کے ساتھ ان کا استقبال کیا، شاید علیؑ کی عادلانہ حکومت کا نقشہ ان کی آنکھوں کے سامنے پھر گیا ہو۔ عاشقان اہل بیت اپنے امام کے استقبال کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔

ادھر بنی امیہ کے دسترخوان کے پروردہ دین فروش لوگوں نے جب اہل کوفہ کی یہ مصروفیات اور اپنے امام کے استقبال کے لئے یہ انہماک دیکھا تو انہوں نے فوراً اس کی ایک رپوٹ اپنے

فاسق و فاجر حاکم کو دمشق روانہ کی جس میں والی کوفہ نعمان بن بشیر کی سستی اور کابلی کی شکایت کرتے ہوئے زیاد بن ابیہ جیسے سخت مزاج شخص کو اس کی جگہ مقرر کرنے کی تجویز پیش کی۔ یہ خط پڑھ کر یزید پریشان ہو گیا۔ اس کو اپنے باپ کی جگہ سنبھالنے ہی دو پریشانیوں کا سامنا تھا ایک طرف تو اسے اپنے خلاف حسینؑ ابن علیؑ کا قیام پریشان کئے ہوئے تھا دوسری طرف امام حسینؑ کے قیام و تحریک کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک ایسے گورنر کی ضرورت تھی جس کے رگ و پے میں اہل بیت دشمنی بھری ہوئی ہو۔ اس مسئلہ کے حل کے لئے اس نے سرجون غلام سے کہ جو معاویہ کا مشیر رہ چکا تھا اور مسیحی تھا مشورہ کیا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد سرجون کو معاویہ کا وہ حکم نامہ یاد آیا جس کے تحت عبید اللہ ابن زیاد کو کوفہ کا گورنر مقرر کیا جانا تھا اور جو معاویہ کی زندگی میں عملی جامہ نہیں پہن سکا تھا۔ وہ اس حکم نامہ کو یزید کے پاس لایا اور ابن زیاد کو کوفہ کا گورنر مقرر کرنے کا مشورہ دیا۔ اگرچہ یزید کو ابن زیاد پسند نہیں تھا کیونکہ اس نے یزید کی ولی عہدی کی مخالفت کی تھی لیکن اس کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں تھا کیونکہ حسینؑ ابن علیؑ کی تحریک کا مقابلہ کرنے کے لئے ابن زیاد جیسے سفاک اور شقی کا کوئی نعم البدل نہیں تھا۔ لہذا بادلِ نحواستہ اس نے فوراً اس حکم نامہ پر دستخط کر کے اسے ایک تیز رفتار قاصد کے ذریعہ ابن زیاد کے پاس بصرہ روانہ کیا۔

ادھر جیسے ہی یہ تقر نامہ عبید اللہ ابن زیاد کو بصرہ میں ملا یہ درندہ صفت انسان شیعیانِ اہل بیت سے انتقام لینے کے لئے بصرہ کی چیدہ چیدہ جلا و صفت شخصیات کو اپنے ہمراہ لے کر کوفہ کی طرف روانہ ہو گیا اور بصرہ میں اپنی جگہ اپنے بھائی عبداللہ الرحمن کو اپنا جانشین مقرر کر دیا۔ ابن زیاد نے اپنی درندگی کی ابتداء امام حسینؑ کے معصوم صفت سفیر سلیمان ابن زین کے قتل سے کی جنہیں اس نے اثناء راہ میں گرفتار کر کے شہید کیا۔

عبداللہ ابن زیاد اپنی فبیج سیرت میں اپنے باپ کا صحیح وارث اور دغا بازی اور مکر فریب کی سیاست میں اپنی مثال آپ تھا۔ وہ نہایت تیز رفتاری کے ساتھ اپنے ہمراہیوں کو بھی پیچھے

چھوڑتا ہوا کوفہ کی طرف روانہ ہوا تا کہ حسینؑ ابن علیؑ کے کوفہ پر قبضہ کرنے سے پہلے خود کوفہ پہنچ جائے اور کوفہ پر کنٹرول کر کے حالات کو یکسر بدل دے۔ ابن زیاد شیعیانِ علیؑ اور کوفہ کے متغیر حالات سے بہت ڈرا ہوا تھا اس لئے فریب کاری کے ساتھ کوفہ میں داخل ہونا چاہتا تھا۔ چنانچہ وہ باب بصرہ کی بجائے باب حجاز سے کوفہ میں داخل ہوا اور اپنے اصل علیہ میں نہیں بلکہ اپنا لبادہ اتار کر حسینؑ ابن علیؑ کے حلیہ میں اپنا چہرہ چھپاتا ہوا کوفہ میں داخل ہوا۔ یہ ۶۰ ہجری کے آخری ایام میں عالمِ انسانیت کو ہمیشہ کے لئے سوگوار بنانے کے لئے کوفہ میں وارد ہوا۔

کوفہ معاشرتی طور پر تین حصوں میں بنا ہوا تھا ان میں سے دو گروہ کوفہ کی قیادت اور رہبری کے دعویدار تھے، لیکن ان دونوں گروہوں سے تعلق نہ رکھنے والے بقیہ لوگ حالات اور اپنے مفادات و رجحانات کو سامنے رکھ کر کسی کی حمایت یا مخالفت کا فیصلہ کرتے تھے۔ جب کوفہ میں امام حسینؑ کے حق میں حالات سازگار ہوئے اور لوگوں نے ان کی رہبری و قیادت کی حمایت کا اعلان کیا تو اس گروہ کے بہت سے لوگ امام حسینؑ کی جانب مائل ہو گئے۔ لیکن عبید اللہ ابن زیاد کی آمد اور حضرت مسلم کی شہادت کے بعد جب ان لوگوں نے بنی امیہ کا پلہ بھاری دیکھا تو ان کی جانب مائل ہو گئے۔

کوفہ کی معاشرتی ترکیب

دنیا کے بہت سے خطے ایسے ہیں جہاں مذہبی اور قومی لحاظ سے غالب اکثریت ایک ہی طبقہ سے تعلق رکھتی ہے جب کہ بعض علاقوں میں مختلف طبقات اور قومیت کے لوگ رہتے ہیں۔ کوفہ وہ اسلامی شہر ہے جہاں مختلف قومیت اور مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگ رہتے تھے۔ یہاں کسی قوم اور قبیلہ کو دیگر تمام قبائل پر اکثریت حاصل نہیں تھی۔ ہم یہاں کوفہ کی اجتماعی ترکیب کا ایک مختصر جائزہ لیں گے۔

مذہبی ترکیب

یہودی

لفظ یہود سے لیا گیا ہے جس کے معنی ہیں آہستہ رجوع کرنا۔ عرف عام میں یہ تو بہ کے معنوں میں آتا ہے۔ یہودیوں نے یہ نام سورۃ اعراف کی آیت ۱۵۶ سے لیا ہے جس میں بیان ہوا ہے کہ۔

”وَقِيَ الْآخِرَةَ اَنَا هَدَانَا لِيَكْ“

”اور آخرت میں بے شک ہم تیری طرف رجوع ہوئے۔“

اس لحاظ سے یہ ایک اچھا لفظ ہے۔ لیکن شریعت تو ریت سے انحراف کے بعد وہ اس لفظ کے اہل نہیں رہے۔ لیکن آج کل جو بھی صحیح راستے سے ہٹ جاتا ہے اسے عام طور پر کہا جاتا ہے کہ وہ یہودی ہو گیا ہے۔

حضرت یعقوبؑ کے فرزند کا نام یہود تھا جو حضرت یوسفؑ کے پردی بھائی تھے۔

کوفہ میں وہ یہودی بھی رہتے تھے جنہیں مدینہ اور حجاز سے اس لئے نکالا گیا تھا تا کہ مدینہ میں اسلامی حکومت ان کی سازشوں سے محفوظ رہے۔ وہ یہودی یہاں آ کر آباد ہوئے لیکن اپنی فطری خباثت اور مجرمانہ ذہنیت یہاں بھی ساتھ لے کر آئے۔

نصاری

نصاری نصر اور نصرت سے مشتق ہے جو اعانت اور مدد کے معنوں میں آتا ہے۔ نصاریٰ کو نصاریٰ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ جب حضرت عیسیٰؑ نے حواریں سے کہا کہ۔۔۔۔۔ ”کون ہے جو خدا کی راہ میں میری مدد کرے۔“ تو حواریں نے کہا کہ ”ہم آپ کے مددگار ہیں۔“ بعض نے کہا ہے کہ ”نصرانہ“ ایک قریہ کا نام ہے جس کی وجہ سے ان کو نصاریٰ کہتے ہیں۔

نصاری۔ عقائد کے لحاظ سے تثلیث کے قائل ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ خدا ایک ہے لیکن وہ تین سے مرکب ہے۔ یعنی اب ابن روح القدس۔

نصاری حضرت موسیٰؑ کے بعد حضرت عیسیٰؑ کی نبوت کو تسلیم کرتے ہیں لیکن پیغمبر ختمی مرتبتؑ کی نبوت کے منکر ہیں۔

کوفہ میں نصاریٰ کے دو گروہ آباد تھے۔

(۱) نصارائے تغلب۔

(۲) نصارائے نجران۔

ان دونوں گروہوں نے ولید ابن عقبہ کے دور حکومت میں کوفہ میں آ کر سکونت اختیار کی۔ یہ لوگ یہاں اس قدر نفوذ حاصل کر چکے تھے کہ مسجد کوفہ کے انتظامی امور میں ایک نصرانی بھی عمل دخل رکھتا تھا۔ کوفہ کے زندان کا انچارج ایک نصرانی تھا۔ اس کے علاوہ ابو موسیٰ اشعری کا کاتب بھی ایک نصرانی تھا۔

صابیہ

لغت میں ”صابی“ یا ”صابیہ“ اسے کہتے ہیں جو اپنے دین کو چھوڑ کر دوسرے دین کو اپنائے۔ فرید وجدی اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ صابیہ فرقہ کے لوگ کائنات کا خالق خدا کو مانتے ہیں لیکن تو تسل اور واسطے کے لئے فرشتوں کی بھی پرستش کرتے ہیں۔ چونکہ خدا کی پرستش چھوڑ کر انہوں نے فرشتوں یا ستاروں کی پرستش شروع کی اس لئے ان کو ”صابی“ یا ”صابیہ“ کہا جاتا ہے یا اس فکر کی اختراع کرنے والوں کا نام ”صبا“ ہے۔

قرآن کریم میں تین جگہ۔۔۔۔۔ سورۃ بقرہ آیت نمبر ۶۲، سورۃ مائدہ آیت نمبر ۶۹ اور سورۃ حج آیت نمبر ۱۷ میں یہود و نصاریٰ کے ساتھ صابئین کا ذکر ہوا ہے۔ قرآن کریم میں بار بار اس فرقہ کا ذکر ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ اس وقت یہ لوگ کثرت سے پائے جاتے تھے۔ بہر حال کوفہ میں اس فرقہ کے لوگ بھی موجود تھے۔

مجوس

مجوس یونانی زبان کا لفظ ہے۔ پہلوی زبان میں اسے ”میغ“ کہتے ہیں۔ یہ زردشتی مذہب ہے جس کے ماننے والے زردشتی ہونے سے پہلے قدیم زمانے میں دو مبداء کے قائل تھے۔

(۱) نور و ظلمت۔

(۲) یزدان و اہرمن۔

لیکن شہرستانی نے زردشتی اور مجوس کو الگ الگ قرار دیا ہے۔ (نقل از فرہنگ معین)

قومیت کے لحاظ سے ترکیب

قومیت کے لحاظ سے یہاں مندرجہ ذیل قومیتوں کے لوگ آباد تھے۔

(۱) ترک۔۔۔۔۔ جوڑکی سے تعلق رکھتے تھے۔

(۲) کرو

(۳) فارس۔۔۔۔۔ ایران سے تعلق رکھنے والوں کی ایک اکثریت یہاں آباد تھی۔

(۴) رومی۔ روم سے تعلق رکھنے والے۔

(۵) سریانیون۔

(۶) سواہلی۔

۱۳ ہجری میں فتح قادسیہ کے موقع پر چار ہزار ایرانی زہرا بن جوکی بیعت میں اسلامی لشکر سے آ ملے تاکہ ان کے ہمراہ ہو کر ان کے مخالفین سے جنگ کریں۔ ان کو ہرا کہتے تھے۔ چنانچہ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا کہ اسود و حمراء پر مبعوث ہوا ہوں۔ یہاں حمر سے مراد سرخ نہیں بلکہ حمر سے مراد سفید ہے۔ ان لوگوں نے اسلامی فوجی قیادت کے ساتھ یہ معاہدہ طے کیا کہ جب تک جنگ جاری رہے گی یا آئندہ جب بھی کسی جنگ کے بعد وہ آزاد ہوں گے اور جس شخص یا جس قبیلہ کے ساتھ چاہیں وہ معاہدہ کرنے میں آزاد ہوں گے۔ نیز یہ کہ جنگ کے مالِ غنیمت میں سے انہیں بھی حصہ ملے گا۔ چنانچہ جبکہ قادسیہ کے بعد ان لوگوں نے کچھ قبائل کے ساتھ معاہدہ بھی

کیا۔ لہذا جس قبیلہ کے ساتھ دو معاہدہ کرتے تھے اسی قبیلہ کے وہ موالی کہلاتے تھے۔ اسی مناسبت سے اسلام قبول کرنے کے بعد ایران سے عرب میں آنے والے گروہ اور قبائل کو موالی کے لقب سے یاد کیا جانے لگا۔ یہ لوگ دوسرے درجے کے شہری سمجھے جاتے تھے۔ ان لوگوں کا کام تجارت، دوکانداری، لوگوں کو راستہ بتانا تھا۔ بنی امیہ کے دور میں اس گروہ کو بہت حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔

عقیدہ مذہب اور ایمان سے ہٹ کر بھی یہ اپنے ہم پیمانوں کے ساتھ جنگوں میں شرکت کرتے تھے۔ ۱۷ ہجری سے ۶۰ ہجری تک کوفہ میں بہت بڑی تعداد میں موالی موجود تھے۔ کربلا میں حضرت امام حسین علیہ السلام اور ان کے انصار و اعوان کے ذکر کے موقع پر جب موالیان کا نام لیا جاتا ہے تو اس سے مراد یہ موالیان ہی ہوتے ہیں۔

جن موالیان نے امام حسینؑ کے لشکر میں شمولیت اختیار کی اور ان کی نصرت میں شہادت کے

درجہ پر فائز ہوئے ان کے نام یہ ہیں۔

(۱)۔ سلیمان مولیٰ الحسین۔

(۲)۔ قارب الدلی مولیٰ الحسین۔

(۳)۔ الحارث بن نبھان مولیٰ الحمیرہ بن عبدالمطلب۔

(۴)۔ سخ مولیٰ الحسین۔

(۵)۔ عامر بن مسلم مولیٰ السام۔

(۶)۔ جابر بن الحجاج مولیٰ العامر بن نہشل۔

(۷)۔ سعد مولیٰ العمر بن خالد صیداوی۔

(۸)۔ رافع مولیٰ الاصل شنوہ۔

(۹)۔ شوذب مولیٰ الشاکر بن عبداللہ ہمدانی شاکری۔

(۱۰)۔ اسلمہ کی مولیٰ الحسین۔

(۱۱)۔ جون مولیٰ ابی ذر غفاری۔

(۱۲)۔ زاہر مولیٰ العمرہ بن خزاعی۔

سیاسی لحاظ سے ترکیب

کوفے کی آبادی سیاسی اعتبار سے مندرجہ ذیل فکراور سوچ رکھنے والوں سے تعلق رکھتی تھی۔

خوارج

خوارج مادہ خروج سے سے لیا گیا ہے۔ جو چیز اپنے دائرہ یا حد سے نکلے اسے خروج کہتے ہیں۔ اصطلاح مذہب میں خارجی یا خوارج اس فرقہ اور گروہ کو کہتے ہیں جو اپنے اس امام کے خلاف بغاوت کرے جس کی وہ بیعت کر چکا ہے اور جس کی اطاعت کا وہ معاہدہ اور اعلان کر چکا ہے۔

یہ گروہ امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام کے دور خلافت میں وجود میں آیا۔ آپ کے دور خلافت میں ایک ایسے ہی گروہ نے آپ کے خلاف بغاوت کی۔ جبکہ صفین میں معاویہ اور علی کے درمیان جنگ ہوئی۔ جب جنگ علی کے حق میں اپنے انجام کو پہنچنے والی تھی اور علی کے لشکر کو کامیابی ہونے ہی والی تھی کہ عمر و ابن عاص نے اپنے اہلیسی مکر و فریب سے کام لیتے ہوئے لوگوں کو قرآن ہی کے ذریعہ اسلام و قرآن کی راہ سے منحرف کرنے کے لئے قرآن کو نیزوں پر بلند کیا اور شاطرانہ چال چلتے ہوئے اعلان کیا کہ ہم اس جنگ کا فیصلہ قرآن کے ذریعہ کریں گے کہ خلافت اسلامی کا مستحق معاویہ ہے یا علی یہ معاویہ عمر و ابن عاص اور ابن ابی معط کی ملی جلی ایک شیطانی سازش تھی۔ حضرت علی نے ہر ممکن کوشش کی کہ لوگ اس سازش کے جال میں نہ آئیں اور اب ایسے موقع پر کہ جب فتح و نصرت علی کے لشکر کے قدم چومنے ہی والی تھی، لوگ معاویہ کے خلاف جنگ سے ہاتھ نہ روکیں۔ لیکن ایک بڑے گروہ نے علی کے اس فیصلے کو قبول نہ کیا اور اس کے

برخلاف اس سازشی ٹولے کے فیصلے کو قبول کرنے کے لئے علی کا گھیراؤ کر لیا۔ حضرت علی کو بادل نحواستہ ان سازشیوں کے اس فیصلے کو قبول کرنا پڑا کہ حکم تسلیم کر لیا جائے۔ ابو موسیٰ اشعری عمر و ابن عاص اور معاویہ کا لشکر شام اور علی کا لشکر کوفہ واپس چلا جائے۔ ابو موسیٰ اشعری اور عمر و ابن عاص کو حکم تسلیم کر لینے کے بعد بھی گروہ کہ جس نے حضرت علی کو حکم تسلیم کرنے پر مجبور کیا پشیمان ہو کر اپنے موقف سے پھر گیا اور حکمیں کو تسلیم کر لینے کا مجرم بھی علی ہی کو قرار دینے لگا اور کہنے لگے کہ ہم نے حکمیں کو تسلیم کر کے گناہ کیا لیکن علی نے بھی یہ گناہ کیا۔ اس کے ساتھ علی سے مطالبہ کیا کہ وہ پھر میدان جنگ میں واپس جائیں اور معاویہ سے دوبارہ جنگ شروع کریں۔ حضرت علی نے کہا کہ اب جب کہ ان کے منع کرنے کے باوجود حکمیں کو تسلیم کیا جا چکا ہے وہ اس وقت تک جنگ نہ کرنے کے پابند ہیں جب تک کہ حکمیں کا فیصلہ قرآن کے خلاف نہ ہو! اگر حکمیں کا فیصلہ قرآن کے خلاف ہو تو معاویہ کے خلاف جنگ کا جواز بنتا ہے۔ لیکن اس گروہ نے علی کی اس منطق کو قبول نہیں کیا بعض اپنے موقف سے ہٹ گئے اور بعض اصرار کرتے رہے۔ انکے اصرار کے نتیجے میں خوارج کے خلاف جبکہ نہروان وجود میں آئی۔ اس جنگ میں نو (۹) افراد کے سوا تمام خارجی گروہ قتل ہو گیا۔ خوارج کی فکر ان باقی ماندہ نو افراد کے ذریعہ پرورش پاتی رہی یہاں تک کہ ۴۱ ہجری سے ۶۱ ہجری تک بیس سال کے عرصے میں اس منحوس فکر کی حامل خوارج کی ایک اچھی خاصی نئی نسل ابھر کر سامنے آئی اور ۶۱ ہجری میں کربلا میں اس گروہ کی ایک خاص تعداد نے امام حسین کے خلاف جنگ کی۔

اموی

اموی، نسل امیہ بن عبدالمطلب بن عبدمناف سے تعلق رکھنے والوں کو کہا جاتا ہے۔ مردان بن حکم، ابوسفیان، عثمان بن عفان، تیوں امید بن عبدالمطلب سے تعلق رکھتے تھے، اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف مسلسل جنگ و جدال کے بعد فتح مکہ کے موقع پر ابوسفیان، مردان اور اس کا باپ اسلام

کے دائرے میں شامل ہو گئے۔ حضرت عثمان کی خلاف کے دوران اس حزب کو مراکب اسلامی میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہونے اور حزب اموی کو تقویت دینے کا موقع ملا۔ کوفہ میں بھی ولید ابن عقبہ، سعید بن عاص، مغیرہ ابن شعبہ اور زید ابن ابیہ کے توسط سے اس حزب کو خاصی تقویت ملی۔ اگرچہ افرادی طور پر یہ کم ہی کیوں نہ رہے ہوں لیکن اقتدار پر قابض ہونے کی وجہ سے یہ لوگ طاقت رکھتے تھے۔

کوفہ اور شیعہ

لوگوں میں ایک عام تاثر یہ پایا جاتا ہے کہ کوفہ کی تمام آبادی شیعہ تھی۔ اس سلسلے میں خاص طور پر شیعوں کے مخالفین کھل کر یہ پروپیگنڈہ کرتے نظر آتے ہیں کہ اہل کوفہ تمام کے تمام شیعہ تھے، انہوں نے ہی امام حسینؑ کو بلایا اور بلا کر قتل کر دیا۔ اپنے اس پروپیگنڈے کی دلیل میں وہ کہتے ہیں کہ جب اسیران آل محمد کا قافلہ کوفہ پہنچا تو کوفہ میں شیعوں نے گریہ و بکاء کر کے اپنے فعل پر ندامت و پشیمانی کا مظاہرہ کیا، اس کے علاوہ ہر سال ایام عزاء میں شیعہ ماتم و مجلد بر پا کر کے سینہ زنی کر کے اپنی پشیمانی کا اظہار کرتے ہیں۔ اس الزام کی رو میں بعض شیعہ حضرات نہایت کمزور اور بے بنیاد دلائل پیش کرتے ہیں اور ان اہل کوفہ کی شیعیت ہی سے سرے سے انکار کرتے ہیں جنہوں نے شہدائے کربلا کے سرہائے مقدس اور کربلا کے اسیروں کی کوفہ آمد کے موقع پر اپنے غم و اندوہ کا اظہار کیا۔ شیعوں کے مخالفین کی طرف سے یہ الزام اور اس الزام کی رو میں شیعوں کی طرف سے کمزور استدلال دونوں ہی اسلام اور تاریخ اسلام سے ناواقفیت کی دلیل ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس مسئلہ کو تاریخی حقائق کی روشنی میں حل کیا جائے۔

شیعہ اور شیعہ کی تعریف

لغت میں لفظ ”شیعہ“ متابعت اور موالات کے معنوں میں آیا ہے۔ اصطلاح دین و مذہب میں کسی کا صحابی و انصار یا کسی شخصیت کے حزب میں شامل ہونے والوں کو اس کا شیعہ

کہا جاتا ہے۔ یہ لفظ دیگر دوسرے لفظوں کی مانند اپنے مفہیم میں افراط و تفریط کا شکار ہوا۔ پیغمبر اکرمؐ کی رحلت سے لے کر آج تک اس لفظ کا اطلاق مختلف ادوار میں درج ذیل گروہوں پر ہوا۔

(۱) پیغمبرؐ کی رحلت کے بعد آپؐ کی جانشینی کے سلسلے میں فکریں ابھر کر سامنے آئیں۔ ان میں ایک فکر کے حامل وہ لوگ تھے جو پیغمبر اکرمؐ کی واضح ہدایت اور نص کی روشنی میں حضرت علیؑ کو آپؐ کا جانشین اور خلیفہ بلا فصل مانتے تھے۔ چنانچہ یہ لوگ شیعیان علیؑ کے نام سے مشہور ہوئے۔ اس کے مقابلے میں دوسری فکر کے حامل لوگ صرف پیغمبرؐ کی نص کو کافی نہیں سمجھتے تھے بلکہ اس سلسلے میں عوام کی رائے کو مقدم اور ضرور سمجھتے تھے۔ لہذا یہ لوگ ”عامۃ المسلمین“ کہلائے۔

(۲) حضرت عمرؓ کی خلافت کے بعد پیغمبرؐ کی جانشینی کے مسئلے کو شور مچا دیا گیا۔ ان میں سے ایک گروہ نے حضرت علیؑ کی حمایت کی اور دوسرے گروہ نے حضرت عثمانؓ کے حق میں اپنی رائے دی۔ چنانچہ جن لوگوں نے حضرت علیؑ کی حمایت کی وہ ”شیعیان علیؑ“ کہلائے۔ اگرچہ یہ لوگ حضرت علیؑ کو خلیفہ بلا فصل نہیں بلکہ تیسرے نمبر پر ان کو خلیفہ بنانا چاہتے تھے۔ اس کے برخلاف جن لوگوں نے حضرت عثمانؓ کی حمایت کی وہ ”شیعیان عثمانؓ“ کے نام سے موسوم ہوئے۔

(۳) حضرت عثمانؓ کے قتل کے بعد حضرت علیؑ متفقہ طور پر خلیفہ منتخب ہوئے، لیکن طلحہ اور زبیر نے حضرت کی بیعت کر کے اسے توڑ ڈالا جب کہ حضرت عائشہ اور معاویہ نے بیعت سے روگردانی کی اور آپؐ کے مقابلے پر نکل کر آئے۔ ان لوگوں کے مقابلے میں جن لوگوں نے حضرت علیؑ کو چوتھا خلیفہ مانتے تھے۔ جب امام حسینؑ نے قیام کیا یہ تینوں قسم کے شیعہ بنی امیہ کے خلاف امام حسینؑ کے حق میں تھے۔ لہذا اس وقت کے جن شیعوں پر بے وفائی کی تہمت لگائی جاتی ہے وہ وہ شیعہ نہ تھے جو حضرت علیؑ کو خلیفہ بلا فصل مانتے ہیں۔

(۴) بعد میں رفتہ رفتہ وہ تمام لوگ جو ائمہ اور اہل بیت علیہم السلام سے مودت اور محبت رکھتے تھے

اور رکھتے ہیں وہ سب شیعیان علیؑ کہلاتے ہیں حالانکہ وہ ائمہ سے چھینی گئی حکومت کو واپس دلانے کے لئے نہ صرف یہ کہ کوئی کوشش اور سعی نہیں کرتے بلکہ حکومت اور اقتدار کو ان کے لئے ”ہجر ممنوعہ“ سمجھتے ہیں۔

چنانچہ پیغمبر ختمی مرتبتؐ کی رحلت سے لے کر آج تک گروہ شیعہ کے یہ چار تصور پائے جاتے ہیں اور یہ چاروں گروہ شیعیان علیؑ کہلاتے ہیں۔

کوفہ میں اگرچہ شیعیت کی بنیاد سلمانؓ، عمارؓ یا سرحدیفہؓ یمانی اور عبداللہ مسعودؓ وغیرہ کے توسط سے پڑی لیکن امیر المؤمنین امام علیؑ اور امام حسنؑ کے دور خلافت میں شیعیت کے خدوخال ابھر کر سامنے آئے اور امت کو ان سے روشناس ہونے کا موقع ملا۔ بعد میں بنی امیہ اور بنی امیہ نواز افراد کی غیر اسلامی حرکتیں بھی لوگوں کے شیعیت کی طرف مائل ہونے کا سبب بنیں۔ لہذا کوفہ میں شیعوں کی ایک کثیر تعداد پائی جاتی تھی۔

چنانچہ شیعہ ایک سیاسی حزب اور پارٹی کا نام ہے اور ہر حزب اور پارٹی ہمیشہ متغیر رہتی ہے اور اس کے متغیر ہونے میں حکومت اور حکمرانوں کا ایک بڑا کردار ہوتا ہے۔ اس لئے یہ کہنا کہ کوفہ کی تمام آبادی شیعہ تھی صحیح نہیں ہے بلکہ اہل کوفہ کی فکر پر حکومت وقت کا ہمیشہ اثر رہا۔ اس کے علاوہ بھی کوفہ کی آبادی مختلف المذاہب اور مختلف الفکر لوگوں پر مشتمل تھی جیسا کہ ”کوفہ کی معاشرتی ترکیب“ کے عنوان سے متعلق موضوع میں بیان کیا گیا۔

### فوجی تقسیم بندی

جنگ کرنے والی فوج درج ذیل قبائل پر مشتمل تھی۔

(۱) قبیلہ کنانہ اور اس کے حلیف۔

(۲) قضاعہ اور غسان اور ان کے حلیف۔ مزج، حمیر، ہمدان، ان کے خلفاء، غطفان، ذبیان، طبعہ، تغلب، عبد شمس، بنی طی، قبائل یمانی۔

### اقتصادی تقسیم بندی

علم اقتصاد اور سیاست وہ تین اہم ستون ہیں جن پر کسی ملک و مملکت کی خوشحالی اور سعادت کی زندگی کا محل قائم ہے۔ ان تینوں عنصر کا ایک دوسرے سے کتنا ربط ہے اور ان میں سے کسی عنصر کا کردار کتنی اہمیت اور کتنی فوقیت کا حامل ہے یہ ایک علیحدہ بحث ہے۔ لیکن کسی معاشرے میں اقتصادی بد حالی اور فقر و محرومیت، مہلک جسمانی امراض، طبعی آفات و حوادث سے کسی طور پر کم نہیں۔ انسانی معاشرے میں فقر و فاقہ کی مصیبت کے عوامل میں طبعی اور قدرتی وسائل کی کمی سے زیادہ خود بینی نوع انسان کے ظلم و خیانت کا زیادہ ہاتھ ہوتا ہے۔ علماء اقتصاد معاشرے کی اقتصاد بد حالی کے اسباب و علل میں دو عوامل کو اہم سبب گردانتے ہیں۔

(۱) پیداواری قلت۔

(۲) غیر عادلانہ اور ظالمانہ تقسیم۔

فقر و محرومیت میں پیداواری قلت سے زیادہ غیر عادلانہ اور ظالمانہ تقسیم اہم کردار رکھتی ہے۔ جہاں تک پیداواری قلت کا تعلق ہے تو اس کی ایک وجہ جہل، نادانی اور زمینی ذخائر اور طبعی وسائل کی موجودگی سے نا آشنائی اور لاعلمی ہے۔ اور دوسری وجہ غیر عادلانہ تقسیم ثروت ہے جس کی وجہ سے دولت چند مخصوص ہاتھوں سمٹ کر رہ جاتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ سرمایہ دار طبقہ اپنی پسند اور مرضی کے حکمران کو وجود میں لانا ہے یا سیاست دان ہی اپنے بڑے عزائم، بد نیتی، ظلم و ستم کی بناء پر اکثریت سے ملکی ثروت کو چند سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں دے دیتے ہیں؟

پہلی صورت میں سیاست اقتصادی کی پیداوار کہلائے گی جب کہ دوسری صورت میں اقتصاد سیاست کی پیداوار کہی جائے گی۔ اس معاشرتی نا انصافی کے لئے سیاست دان کو قصور دار اور ذمہ دار قرار دیا جائے یا سرمایہ دار کو؟ دو اور دوچار کے اصولوں پر ان دونوں میں سے

کسی ایک کو یا ہر وقت اور ہر جگہ ان دونوں کو ذمہ دار قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اس سیاسی بازو گیری کی چند انواع ہیں۔

(۱) اس سیاسی بازی گری میں ملکی اقتصاد کی قسمت سیاستدانوں کے ہاتھوں میں ہوتی ہے۔ یہ لوگ حکومت کے کاسہ لیسوں کے لئے اقتصاد کے دروازے کھلے رکھتے ہیں اور دوسروں کے لئے اقتصاد کی خوشحالی کے دروازے بند کرتے ہیں۔ ظاہر ہے ایسی حکومت سرمایہ داروں کے ہاتھوں ہی میں ہوتی ہے۔

(۲) کبھی ظالم اور بد نیت حکمران ملکی معیشت تباہ کرنے کے لئے ظالمانہ بڑے بڑے ٹیکس عائد کرتے ہیں جس کی وجہ سے چھوٹے کاروباری لوگ معاشی طور پر مفلوج ہو کر رہ جاتے ہیں۔ لہذا قطعی طور پر سیاست دانوں اور سرمایہ داروں میں سے کسی ایک کو یا ہمیشہ اور ہر جگہ دونوں کو اقتصاد کی بد حالی کا ذمہ داروں میں سے کسی ایک کو یا ہمیشہ اور ہر جگہ دونوں کو اقتصاد کی بد حالی کا ذمہ دار ٹھہرانا غلط ہوگا۔

جہاں تک کوفہ کا تعلق ہے وہاں چونکہ شیعوں کی تعداد زیادہ تھی اور وہ بنی امیہ سے نفرت اور بیزاری رکھتے تھے اس لئے بنی امیہ کے حکمرانوں اور بنی امیہ نواز لوگوں نے اہل کوفہ کو اقتصاد کی بد حالی میں مبتلا رکھنے کی غرض سے کوفہ کی اقتصاد کو چند مخصوص افراد کے ہاتھوں میں دیا ہوا تھا تا کہ وہ افراد حکومت کے مفادات کا تحفظ کریں اور اس میں معاویہ کی حکومت نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ اقتصاد کی طبقہ بندی کے لحاظ سے اہل کوفہ کی تقسیم بندی کچھ اس طرح کی جاسکتی ہے۔

(۱) وہ طبقہ جو فقر و فاقہ اور محرومیت کا شکار تھا اور جن کا کوئی پرسان حال نہیں تھا۔ یہ لوگ شیعیان اہل بیت تھے جو بنی امیہ کی حکومت کی ظلم کی چکی میں مسلسل پس رہے تھے۔

(۲) ایک طبقہ ایسے لوگوں کا تھا کہ جو تھوڑی بہت ملکیت اور چھوٹی موٹی معمولی جائیداد بھی رکھتا تھا لیکن اپنے اصولوں اور اپنے دین کی خاطر امام حسینؑ کا ساتھ دے کر بنی امیہ کی حکومت

کے ہاتھوں اپنی تھوڑی بہت جائیداد اور ملکیت سے محروم ہونے کے لئے آمادہ نہیں تھا۔ چنانچہ کربلا کے واقعہ میں بیشتر ایسے افراد نظر آتے ہیں جنہوں نے امامؑ کا ساتھ نہ دینے کی یہ توجیہ کی کہ انہیں خوف ہے کہ قیام امام حسینؑ میں ان کا ساتھ دینے کی صورت میں وہ اپنے گھریلو اور جائیداد سے محروم ہو جائیں گے اور حکومت وقت ان کی جائیداد کو قومی ملکیت میں لے لی۔

(۳) کوفہ میں ایک بڑے طبقہ کی گزراوقات صرف جنگی غنائم پر ہوتی تھی۔ یہ لوگ پیشہ ورانہ جنگجو تھے اور اپنی روزی کمانے کے لئے ہمیشہ کسی جنگ کے اعلان کا انتظار کرتے رہتے تھے۔

(۴) اس کے علاوہ ایک بڑا طبقہ وہ تھا جن کو بنی امیہ کی حکومت نے بھاری بھاری مالی اور سیاسی رشوتیں دے کر خریدی ہوا تھا اور انہوں نے اپنا دین و ایمان سب کچھ حکومت وقت کے ہاتھوں فروخت کیا ہوا تھا۔

(۵) کوفہ میں گنتی کے چند افراد ایسے تھے جو کوفہ کی پوری اقتصاد پر حاوی تھے اور ملکی مقدرات اور شروت ان کے ہاتھوں میں تھی جیسے عمر و ابن حریث اور شبث ابن ربیع وغیرہ جن کا شمار کوفہ کے جاگیرداروں میں ہوتا تھا۔

جب اقتصاد کی صورت حال ایسی ہو تو فقر و فاقہ سے مجبور اور محرومیت کے شکار لوگوں سے کیسے یہ توقع کی جاسکتی تھی کہ وہ اپنے دین و ایمان کے لئے کسی استقامت کا مظاہرہ کر سکیں سوائے ان معدودے چند شخصیتوں کے جو اپنے عقیدے میں راسخ اور اپنے ایمان میں کامل تھیں جو اصول اور دین کی خاطر کسی محرومیت کو خاطر میں نہیں لاتی تھیں اور ہر فقر و فاقہ اور تنگ دستی کا خداں پیشانی سے مقابلہ کرنے کے لئے تیار تھیں۔

فکری اور نظریاتی لحاظ سے تقسیم بندی

فکری اور نظریاتی لحاظ سے درج ذیل فکر کے حامل افراد یہاں رہتے تھے۔

جبریہ

جبریہ مادہ جبر سے لیا گیا ہے۔ جبر لغت میں کسر کی ضد ہے۔ کسر کے معنی ٹوٹنا ہے۔

اصطلاح میں جبریہ ایک مذہب اور فکر کا نام ہے۔ اس مذہب اور فکر کے حامل افراد کے مطابق انسان جو کچھ کرتا ہے۔ یا اسے جو کچھ پیش آتا ہے اس میں انسان کا اپنا کوئی کردار نہیں ہوتا بلکہ ان کا کہنا ہے کہ یہ سب کچھ ازل سے اس کی قسمت میں لکھا ہوتا ہے جس کے خلاف وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ فرقہ جبریہ کا اعتقاد ہے کہ کسی بھی حادثہ کی تفسیر تو جبرہ اسباب و علل کے ساتھ نہیں کی جاسکتی۔ انسان جو کچھ کرتا ہے وہ اپنے ارادے اور اختیار سے نہیں کرتا بلکہ چونکہ ازل سے اس کی تقدیر میں لکھا ہوا ہوتا ہے اس لئے وہ جو کچھ کرتا ہے اسے کرنے پر مجبور ہے اور اپنا کوئی اختیار نہیں رکھتا۔

جبریہ اور قدریہ دونوں مذہب قریب المعنی ہیں۔ غرض اس مذہب کے تحت انسان اور جمادات میں کوئی فرق نہیں۔ اس مذہب اور فکر کی بنیاد معاویہ اور معاویہ کے دسترخوان پر بیٹھنے والے درباری علماء نے رکھی۔ اگرچہ اس مذہب و فکر کو فروغ بعد میں ملا۔ چنانچہ شہدائے کربلا کے سرہائے مقدس اور اسیران اہل بیت اطہار کو کوفہ میں دارالامارہ میں ابن زیاد کے اور دمشق میں یزید کے سامنے پیش کیا گیا تو ان دونوں ملعونوں نے قاتلان حسینؑ اور شہدائے کربلا کے قاتلوں کو خدا کی طرف نسبت دی۔ یعنی معاذ اللہ چونکہ خدا نے ازل سے ان کی تقدیر میں یہ لکھ دیا تھا اس لئے وہ مجبور تھے کہ ان کو قتل کر دیں۔ یعنی وہ اپنے فعل اور ارادے میں مختار نہیں تھے۔

معاویہ کے دور خلافت میں اس فرقہ کی بڑی تعداد کوفہ میں پائی جاتی تھی۔ آج بھی اس فکر کے حامل لوگ پائے جاتے ہیں۔

مرجیہ

مذہب ”مرجیہ“ معاویہ کی خلافت کے دوران وجود میں آیا۔ ”مرجیہ“ لفظ ”ارجاء“ سے

لیا گیا ہے جس کے معنی ہیں فیصلے اور حکم میں تاخیر کرنا۔ چنانچہ سورہ توبہ کی آیت ۱۰۶ میں ہے کہ۔  
”واخرون مرجون لامر اللہ المیعذ ہم واما توب علیہم“ اور جو کچھ (لوگ) موقوف رکھے گئے ہیں اللہ کے حکم پر کہ اللہ ان پر عذاب کرے یا ان کی توبہ قبول کرے۔“

معاویہ کی خلافت کے دوران اس آیت سے استدلال کرتے ہوئے ایک مذہب وجود میں لایا گیا جس کی رو سے خلیفہ وقت اور خلیفہ سے مربوط وہ حکمران جو دین و شریعت کی پابندی نہیں کرتے تھے یا دین و شریعت کے خلاف جو کچھ بھی عمل کرتے تھے اس پر ان کے خلاف کوئی تنقید و اعتراض نہیں کیا جاسکتا تھا اور نہ ہی عوام ایسے بد کردار خلیفہ اور حکمران کو برطرف کرنے کا مطالبہ کر سکتے تھے۔ اس طرح یہ مذہب سیاسی ”نظریہ نضرورت“ کے تحت معاویہ کی خلافت کے دور میں وجود میں لایا گیا تا کہ اس کی حکومت کو دوام اور استحکام بخشا جاسکے۔ اس مذہب کے ذریعہ عوام کی سوچ اور فکر پر یہ کہہ کرنا لے ڈالنے کی کوشش کی گئی کہ امت کی قیادت و رہبری کے لئے جو شخص کسی بھی طرح منتخب ہو کر امت کی قسمت پر ایک مرتبہ مسلط ہو جائے اس کے گفتار و کردار پر کسی قسم کی تنقید اور تنقیص نہ کی جائے اور اس کی باز پرس کا مسئلہ خدا پر چھوڑ دیا جائے وہ خود ہی قیامت کے دن ان سے حساب لے گا۔

اگرچہ ابتدا میں بنی امیہ اس مذہب کو اپنے تحفظات کے لئے وجود میں لائے تھے لیکن رفتہ رفتہ اس فکر نے اتنی وسعت پائی اور یہاں تک پہنچی کہ انسان کتنا ہی بڑا جرم و گناہ کرے وہ جرم و گناہ انسان کے ایمان کو کوئی نقصان و ضرر نہیں پہنچا سکتا، کوئی شخص کتنا ہی بڑا گناہ گار اور مجرم کیوں نہ ہو اسے جہنمی نہیں کہا جاسکتا۔ یہاں تک کہ بعض شیعوں میں بھی یہ فکر راسخ ہو چکی ہے کہ اہل بیت کی محبت اور ولایت کے ساتھ کوئی بھی گناہ نقصان دہ نہیں ہے۔ یہ فکر اتنی خطرناک ہے کہ اگر اس کو تسلیم کر لیا جائے تو دین و شریعت کی ساری اساس متزلزل ہو کر رہ جائے اور دین و شریعت ایک ڈھونگ اور کہانی بن کر رہ جائے۔

اس گروہ کے حامی افراد بھی کوفہ میں پائے جاتے تھے۔

جیسا کہ کوفہ کی معاشرتی ترکیب کے سلسلے میں واضح کیا گیا کوفہ خطہ اسلامی میں ایک منفرد جگہ تھی۔ یہاں ایک فکر کے افراد نہیں بستے تھے بلکہ مختلف افکار، سوچ اور خیالات رکھنے والے لوگ یہاں پائے جاتے تھے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہاں فکری رشد کی زیادہ گنجائش تھی اور زیادہ مواقع تھے۔ مذہبی لحاظ سے یہاں مختلف مذاہب اور مختلف فرقوں کے لوگ پائے جاتے تھے۔ یہاں کے لوگ کسی ایک دین کے ماننے والے نہیں تھے اگرچہ اکثریتی اور حکومتی مذہب مسلمانوں ہی کا تھا۔ دیگر مذاہب و ملل کے افراد حکومتی مذہب کے پابند و تابع تھے۔ جیسا کہ اس وقت ایران میں یہود، نصاریٰ، زردشتی، حنفی اور شافعی تمام مذاہب کے لوگ موجود ہیں اور ان سب کے لئے ایران کے دلی امر کو اپنا رہبر تصور کرنا ضروری ہے۔ ملک کے لئے درپیش مسائل، حوادث اور واقعات میں وہ سب کے سب مرکزی سیاست کے تابع ہیں حالانکہ جب بھی انہیں موقع ملے اور ان کے لئے حالات سازگار ہوں تو ممکن ہے کہ یہ لوگ اپنا اندرونی خواہشات اور امنگوں کو سامنے لائیں۔

اسی طرح کوفہ کے لوگ بھی مرکزی حکومت کے تابع تھے اور اکثریتی فیصلے کے پابند تھے۔ اگر اکثریت حسینؑ کو چاہتی تو وہ بھی چاروں چار حسینؑ کو چاہنے پر مجبور ہوتے حالانکہ موقع ملنے پر وہ اپنی ہی امنگوں کو ترجیح دیتے۔

انتخاب کوفہ

بلد امین مکہ مکرمہ جب رسول امینؐ کے نواسہ کے لئے جائے امن نہ رہا جیسا کہ خود فرزند رسولؐ نے فرمایا کہ میں اگر مکہ سے نہ نکلتا تو بنی امیہ کے لوگ مجھے قتل کے دیتے تو اب یہ سوال ہی اپنی جگہ غلط ہے کہ امام حسینؑ نے بلد امین کو کیوں چھوڑا۔ مکہ اب حسینؑ کے لئے بلد امین کو کیوں چھوڑا۔ مکہ اب حسینؑ کے لئے بلد امین رہا کہاں؟ اس لئے عقل و شریعت دونوں کا بھی

تقاضا تھا کہ حسینؑ اب کوئی ایسی جگہ تلاش کریں جو ان کے لئے نسبتاً محفوظ ہو۔

اس سلسلے میں قدیم زمانے سے لے کر جدید دور تک کے علماء، مفکرین اور محققین امام حسینؑ کے کوفہ کو منتخب کرنے کی وجہہ میں درج ذیل چند دلائل پیش کرتے ہیں۔

(۱)۔ اہل کوفہ کی دعوت اور ان کے خطوط

مکہ میں قیام کے دوران اہل کوفہ کے بارہ ہزار سے زیادہ خطوط امام کو مل چکے تھے اس کے علاوہ بہت سے نمائندے امام سے آ کر ملے۔ ان سب کا تقاضا یہی تھا کہ۔۔۔

”ہمارے لئے کوئی امام نہیں ہے، آپ کوفہ آئیں اور قیادت سنبھالیں۔“

اگرچہ ایک بڑا گروہ یہ کہتا دکھائی دیتا ہے کہ ”حسینؑ“ کو اہل کوفہ پر بھروسہ نہیں کرنا چاہئے تھا کیونکہ ان کے عہد و بیان کا کوئی اعتبار نہیں، وہ اس بوڑھی عورت کے مانند ہیں جو صبح سے شام تک بڑی محنت سے دھاگہ کا تتی ہے اور شام کو اسی دھاگہ کو کٹڑے کٹڑے کر دیتی ہے۔

لیکن۔۔۔

جب کوئی اور جائے امن نہ ہو، حتیٰ مکہ کی سر زمین بھی آپ پر تنگ ہو چکی ہو، ایسے میں امید کی کوئی کرن نظر آئے امام کو محبت بھرے دعوت نامے ملیں، اہل کوفہ کے نمائندے خود آ کر اپنے رخ! و صدمت کا یقین دلائیں، جب کہ ان میں مخلص افراد بھی ہوں کہ جن پر آپ کے پدر بزرگوار اور آپ کے برادر عزیز بھی اعتماد بھروسہ کرتے رہے ہوں تو امام کس منطق کے تحت مخلص لوگوں کو بھی نظر انداز کریں؟

پھر۔۔۔۔

امام کے کسی اقدام کا تجزیہ سطحی نقطہ نظر سے نہیں بلکہ معصوم کے نقطہ نظر سے کرنا چاہئے اور یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ آپ اپنے خالق و مالک کی طرف سے ایک مسؤلیت رکھتے تھے، آپ کے پیش نظر آپ کے جد آپ کے پدر بزرگوار اور آپ کے برادر عزیز امام حسن مجتبیٰ کا مشن بھی

ہے جسے بہر حال آپ کو پورا کرنا تھا۔

اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ آپ کو فہ کارخ نہ کرتے تو شاید آپ کی جان بچ جاتی تب بھی یہ کیونکر ممکن ہے کہ ”حسینؑ“ اپنی ذمہ داری اور مسئولیت پوری نہ کرے جب کہ اہل کوفہ یہ کہہ کر آپ کو بلا رہے ہو کہ۔۔۔۔۔

”ہمارے لئے کوئی پیشوا اور امام نہیں ہے۔“

(۲)۔ معاہدہ بیثاق

امام حسین علیہ السلام کے کوفہ کو اپنا مرکز قیام و انقلاب بنانے کی ایک وجہ وہ معاہدہ ہے جو آپ کے برادر عزیز امام حسن علیہ السلام کی شہادت کے بعد شیعہ اہل کوفہ اور امام حسینؑ کے درمیان خطوط و دُؤوں کے ذریعہ وقتاً فوقتاً طے پایا تھا۔

کوفہ کی مذہبی اور اجتماعی شخصیات امام حسن مجتبیٰؑ کی شہادت پر امام حسینؑ کی خدمت میں تعزیت پیش کرنے کے ساتھ ساتھ آپ سے معاویہ کے خلاف قیام کرنے کی درخواست بھی کرتی تھیں۔ چنانچہ امام حسینؑ کے نام ان کے ایک خط کا مضمون یوں ہے۔

”امام حسن علیہ السلام کی شہادت پر ہم آپ کے شیعہ بھی آپ کی مصیبت میں آپ کے ساتھ غم زدہ ہیں“ آپ کے حزن میں ہم بھی محزون ہیں۔ امام حسن علیہ السلام کے بعد خداوند عالم نے آپ کے مبارک وجود کی صورت میں بہترین خلف عطا فرمایا ہے، آپ کا غم ہمارا غم اور آپ کی خوشی ہماری خوشی ہے ہم آپ کے حکم کے منتظر ہیں۔“

امام حسینؑ نے ان کے خط کے جواب میں لکھا کہ۔

”میرے بھائی امام حسنؑ کی معاویہ سے صلح اور معاویہ کے خلاف میرے قیام کرنے کے جواز کے بارے میں تمہاری رائے دُؤوں اپنی جگہ صحیح ہیں، لیکن فی الحال جب تک پسر ہندہ (معاویہ) زندہ ہے اس وقت تک خاموش بیٹھو، زمین پر خود کو چھپا کر رکھو اور خدا سے ہدایت کے

لئے دعا کرتے رہو۔ اگر کوئی حادثہ پیش آیا (یعنی معاویہ مر گیا) اور ہم اور تم اس وقت زندہ رہے تو میں تمہیں اپنی رائے سے آگاہ کروں گا۔“

غرض اہل کوفہ اپنی نجات کی راہ امام حسین علیہ السلام کے سائے میں دیکھتے تھے اور ان سے اپنی امیدیں باندھے ہوئے تھے۔ جب بھی وہ ریاستی ظلم و ستم کا نشانہ بنتے، بے تابی سے یکے بعد دیگرے امام کو خطوط لکھتے اور ان سے قیام کرنے مطالبہ کرتے اور امام ان کو صبر کی تلقین کرتے۔ چنانچہ معاویہ کے دور حیات میں اہل کوفہ کی طرف سے آخری خط جو امام کو پہنچا وہ محمد ابن بشیر ہمدانی اور صفین ابن لیلیٰ ہمدانی کی قیادت میں ایک وفد لے کر پہنچا تھا۔ ان لوگوں نے امام سے ملاقات کی، امام نے فرمایا کہ۔

”جب تک معاویہ زندہ ہے اس وقت تک تم میں سے ہر شخص اپنے گھر میں چھپ کر بیٹھے۔ جب یہ ہلاک ہو جائے اور اس وقت تک اگر ہم اور تم زندہ رہے تو خدا کی ذات سے ہمیں امید ہے کہ خدا ہمارے لئے خیر کی کوئی راہ پیدا کر دے گا، خدا ہم کو ہمارے حال پر نہیں چھوڑے گا وہ مومنین اور متقین کے ساتھ ہے۔ اس وقت ہماری ہدایت تم کو ملے گی۔“ (مع الحسینؑ فی نہنتی)

اہل کوفہ اور امام حسینؑ کے درمیان خطوط اور دُؤوں کا سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ امام کے پاس لوگوں کی آمد و رفت کی خبر حکومت کو بھی لگ گئی اور مدینہ اور دمشق میں حکام پریشانی میں مبتلا ہو گئے۔ چنانچہ معاویہ نے امام حسینؑ کو ایک تہدید آمیز خط تحریر کیا جس میں لکھا کہ۔

”مجھے خبر ملی ہے کہ کوفہ والوں کا ایک گروہ آپ کو اختلاف کرنے اور جنگ کرنے کی دعوت دے رہا ہے یہ اہل عراق وہی ہیں جنہیں آپ آزماتے ہیں، آپ کے والد اور آپ کے بھائی کے ساتھ انہوں نے جو سلوک کیا وہ آپ کے سامنے ہے، آپ خدا سے ڈریں اور ہمارے درمیان طے ہونے والے صلح نامہ کا پاس کریں ورنہ نتیجہ بہت بُرا ہوگا۔“

معاویہ یزید کے بارے میں اہل کوفہ سے بہت پریشان تھا اور ڈر رہا تھا۔ چنانچہ اس نے

یزید کو ہدایت کی کہ اگر اہل کوفہ تم سے ہر روز ایک گورز بدلنے کی درخواست کریں تو تم بدل دینا کیونکہ ایک لاکھ تلواریں کا مقابلہ کرنے کی بجائے ایک آدمی کی ناراضگی مول لینا زیادہ بہتر ہے۔ (کتاب مع الحسینؑ فی ہفتی - ص ۳۸ - نقل از انسب الاشراف)

بنی امیہ اہل کوفہ سے اس لئے پریشان تھے کہ اہل کوفہ معاویہ اور بنی امیہ کے مقابلہ میں اہل بیت کے زیادہ حامی اور طرفدار تھے۔ اہل کوفہ اور امام حسینؑ کے درمیان ضمنی طور پر ایک معاہدہ پہلے سے موجود تھا۔ یہی وجہ ہے کہ امام حسینؑ نے مکہ سے اہل کوفہ کے نام کوئی خط نہیں لکھا بلکہ آپ منتظر تھے کہ اہل کوفہ اپنے سابقہ وعدہ اور معاہدہ کی بناء پر خود اٹھیں تب آپ ان کی دعوت پر جائیں۔

(۳)۔ اہل کوفہ بنی امیہ سے مالاں اور ناراض تھے

کوفہ والے بنی امیہ سے نفرت کرتے تھے اور ان کے ظلم و تشدد سے پریشان اور مالاں تھے۔ ان کی بنی امیہ سے نفرت کی وجوہات میں سے چند وجوہات یہ ہیں۔

(۱)۔ معاویہ نے اپنے دور حکومت میں اپنے کارندوں اور گورزوں کے توسط سے عراق میں ڈکٹیٹر شپ اور لا قانونیت کی فضا طاری کی ہوئی تھی۔ بنی امیہ کے حکمرانوں کی منطق یہ تھی کہ وہ اہل عراق سے کہتے تھے کہ اگر تمہارے یہاں کے مجرم ہمارے ہاتھ نہیں آئے تو ان کے بدلے میں ہم تمہارے بے گناہ افراد کو پکڑ لیں گے اور جو حکومت سے روگردانی کریں گے ان کے بدلے تم پر تہمت لگا کر تمہیں قتل کریں گے۔ چنانچہ عبید اللہ بن زیادہ نے کوفہ پر مسلط ہوتے ہی ایک ایسا خطبہ دیا۔

(۲)۔ امیر المومنین امام علیؑ علیہ السلام کے دور حکومت میں اسلامی حکومت کا دار الحکومت کوفہ تھا لیکن معاویہ کے دور حکومت میں یہی کوفہ حکومت کا سب سے زیادہ معتوب صوبہ قرار پایا۔ چنانچہ جب بھی علیؑ کا ذکر آتا تو اہل کوفہ کو اپنی کھوئی ہوئی عظمت و شرافت یاد آتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اہل کوفہ کا اولاد علیؑ سے ایک قلبی رابطہ تھا۔

(۳)۔ کوفہ میں کوئی شخص بھی ایسا نہ تھا جو بنی امیہ کے ظلم و ستم کا نشانہ نہ بنا ہو جس کے اسلاف و اشراف بنی امیہ کے ہاتھوں قتل اور مبتلائے مصیبت نہ ہوئے ہوں۔

(۴)۔ معاویہ کے دور حکومت میں حضرت علیؑ علیہ السلام پر ہر عام منبر سے سب و شتم کیا جاتا تھا۔

(۵)۔ بنی امیہ اہل کوفہ کو دشمنی، ذلت اور حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے ان کا یہ عمل اہل کوفہ کے دلوں میں ان کے خلاف نفرت اور کراہت پیدا کرتا تھا۔

(۶)۔ ابو عثمان حاجز اہل کوفہ کی اپنے والیان سے سرکشی کے اسباب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ۔

”کوفہ والے اہل نظر صاحب عقل و شعور اور بحث و تحقیق کرنے والے لوگ تھے وہ شریعت و سنت میں کسی تغیر و تبدل کا فوری نوٹس لیتے تھے اچھا اور بُرا کر دار رکھنے والوں اور اس کا مظاہرہ کرنے والوں پر نظر رکھتے تھے۔ صحیح اور غلط میں تمیز کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے اپنے امراء پر کڑی نظر رکھتے تھے۔ اور ان کی غلطیوں کو برداشت نہیں کرتے تھے بلکہ ان کو برملا ظاہر کرتے تھے۔ اس کے برخلاف اہل شام کند ذہن، بحث و تحقیق سے عاری اور علم و فکر میں جمود رکھنے والے لوگ تھے اور اہل تہلید تھے۔ جو چیز ان کی نظروں سے اوجھل ہو اسے کبھی معلوم کرنے کی کوشش نہیں کرتے تھے اور آنکھ بند کر کے اپنے امراء کی اطاعت کرتے تھے جو کچھ وہ کہہ دیتے اسی کو حقیقت سمجھتے تھے۔“ (شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید - ج ۱ - ص ۳۲۳)

(۴)۔ اہل کوفہ کے دلوں میں امام حسینؑ کی محبوبیت

اہل کوفہ کے دلوں میں امام حسینؑ علیہ السلام کے لئے ایک مقام و منزلت اور محبت و مودت تھی۔ رہا یہ کہ ان کی یہ محبت اور اخلاص امامؑ کے نواسہ رسول اور ولید فاطمہ زہراء سلام اللہ علیہا ہونے کے ماتے تھا یا ان کے ذاتی فضائل، کمالات اور صفات و اخلاق کی وجہ سے۔ اس کی

رضاحت اور تفصیلی ذکر کا یہاں موقع نہیں۔ لیکن یہ بات اپنی جگہ حقیقت ہے کہ اگر اہل کوفہ کو آزادی رائے کا موقع ملتا اور انہیں خود مختار آزادانہ اور اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق اپنا قائد و رہبر انتخاب کرنے کا موقع دیا جاتا تو وہ حسین ابن علیؑ کے علاوہ کسی اور کو منتخب کرنے۔ اس حقیقت کے بہت سے شواہد ہیں کہ امام حسینؑ اہل کوفہ میں ہر دل عزیز تھے ان میں سے چند شواہد ہم یہاں پیش کرتے ہیں۔

(۱) منزل صفاح پر جب آپؑ کی ملاقات فرزدق سے ہوئی اور آپؑ نے اس سے اہل کوفہ کے بارے میں پوچھا تو اس نے جواب دیا کہ۔

”لوگوں کے دل آپؑ کے ساتھ ہیں، لیکن ان کی تلواریں آپؑ کے خلاف ہیں۔“

(۲) منزل ذات عرق پر جب آپؑ کی ملاقات بنی اسد کے ایک شخص بشر بن غالب سے ہوئی تو آپؑ نے اسے پوچھا کہ ”تم کہاں سے آرہے ہو؟“ اس نے جواب دیا کہ ”عراق سے۔“ امام نے اس سے پوچھا کہ ”تم نے اہل عراق کو کس حال میں چھوڑا؟“ تو اس نے جواب دیا کہ۔۔۔

”لوگوں کے دلوں میں آپؑ ہیں لیکن ان کی تلواریں آپؑ کے خلاف ہیں۔“

(۳) منزل عذیب الجھنات پر امامؑ کی ملاقات ہلال بن مافع سے ہوئی جو کوفہ سے آئے تھے۔ آپؑ نے ان سے جب کوفہ کے لوگوں کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ۔

”وہاں کے امراء اور رؤسا کو بڑی بڑی رشوتیں ملی ہیں لیکن عوام کے دلوں میں آپؑ ہیں۔“

(۴) منزل حاجر سے امامؑ نے قیس بن مسهر صیداوی کے ہاتھ کوفہ والوں کے نام ایک خط روانہ کیا اور اس میں لکھا کہ ”مسلم نے مجھے لکھا ہے کہ تم سب ہمارا حق ہمیں دلانے کے لئے متحد اور متفق ہو چکے ہو۔“

(۵) حضرت مسلم بن عقیل نے اپنے خط میں امامؑ کو لکھا کہ۔

”اہل کوفہ آپؑ کے سوا کسی کے حق میں نہیں۔“

(۶) عبید اللہ ابن زیاد جب کوفہ میں داخل ہوا تو وہ امام حسینؑ کا روپ دھار کر اپنا چہرہ چھپاتے ہوئے کوفہ میں داخل ہوا تا کہ لوگ اسے ”حسینؑ“ سمجھ کر اس کا استقبال کریں، کیونکہ وہ جانتا تھا کہ کوفہ والوں کے دلوں میں حسینؑ کا مقام ہے۔

(۷) حرا بن یزید ریاحی جب راہ میں امامؑ کے مزاحم ہوا تو اس نے امامؑ کو ناراض کرنے سے حتی الامکان گریز کیا اور گفت و شنید کے دوران جب نماز کا وقت ہو گیا تو نماز کے لئے اس نے اپنی علیحدہ جماعت قائم کرنے سے بھی احتراز کیا یہاں تک کہ روز عاشور اپنی حرکتوں اور اپنے اقدام پر مادم ہو کر شدید کرب و پریشانی کے بعد پشیمانی کے عالم میں امامؑ سے جا ملا۔

یہ تمام شواہد اس بات کی دلیل ہیں کہ اہل کوفہ کے دلوں میں امام حسینؑ کا ایک مقام و منزلت تھی۔

(۵) اہل عراق حسینؑ سے جنگ کرنا پسند نہیں کرتے تھے بنی امیہ کی حمایت اور ان کی حکومت کی تمام تر کاسہ لیسوں کے باوجود اہل عراق نہیں چاہتے تھے کہ امام حسینؑ کے خلاف مخالفت اس حد تک بڑھے اور نوبت یہاں تک پہنچے کہ انہیں امامؑ کے خلاف خود کو جنگ میں شریک کرنا پڑے۔ چنانچہ حرا بن یزید ریاحی نے جب امام حسینؑ کا راستہ روکا اور ان کو کوفہ لے جانا چاہا تو امام حسینؑ اور حرا کے درمیان تلخ کلامی ہوئی۔ آخر حرا نے یہ تجویز پیش کی کہ آپؑ ایسا راستہ اختیار کریں کہ جو نہ کوفہ جانا ہو اور نہ ہی مدینہ۔ اس کے ساتھ ہی اس نے کہا کہ: شاید خدا ایسے حالات پیدا کر دے کہ میں آپؑ کا خون بہانے اور آپؑ کے قتل میں ملوث ہونے سے بچ جاؤں۔“

مندرجہ ذیل شواہد اس بات کی تصدیق کرتے ہیں۔

(۱) شبث ابن ربیع خوارج سے تعلق رکھتا تھا۔ عبید اللہ ابن زیاد نے جب اس کو امام حسینؑ کے خلاف جنگ کرنے کے لئے بھیجنا چاہا تو اس نے بیماری کا بہانہ کیا۔ عبید اللہ کو جب یہ خبر ملی کہ وہ بیمار نہیں ہے بلکہ بیماری کا بہانہ کر رہا ہے تو اس نے دوبارہ اس کو پیغام بھیجا اور کہا کہ میرے منبر نے

مجھے خبر دی ہے کہ تم بیمار نہیں ہو بلکہ تم نے بیماری کا بہانہ کر کے خود کو قرآن کی اس آیت کا مصداق بنایا ہے جس میں کہا گیا ہے۔

”یہ لوگ جب مومنین سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں اور جب مشرکین سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تو تمہارے ساتھ ہیں۔

یہ شخص کر بلا کے میدان میں یہ کہتے ہوئے سنا گیا کہ۔

”خدا اس شہر کے رہنے والوں کو خیر نصیب نہ کرے خدا کرے یہ کبھی اچھائی تک نہ پہنچیں۔ یہ کتنی ضلالت اور گمراہی کی بات ہے کہ ہم نے زمین میں بسنے والے بہترین خلائق کے خلاف جنگ کی اور آل معاویہ اور آل زواذانیہ کی حمایت کی۔“ (حیات امام حسینؑ از باقر قرشی ج ۳- ص ۲۱۵)

(۲)۔ عمر سعد کے لشکر میں بہت سے افراد امام حسینؑ کے خلاف جنگ کرنے سے ہنچکا رہے تھے اور تر دو کا شکار تھے۔ انہیں میں سے ایک گروہ ایک گوشہ میں رہی کر خدا سے ان الفاظ میں دعا گو تھا:

”خدا اے اپنے پیغمبر کے نواسہ کی مدد فرما۔“

یہاں تک کہ عمر سعد کے لشکر کے قائد عمر ابن حجاج نے اپنے لشکر کو مخاطب کر کے کہا کہ:

”(حسینؑ) دین سے نکل چکے ہیں اس لئے ان سے جنگ کرنے میں تم شک و شبہ نہ

کرو۔“ (معاذ اللہ)

عبید اللہ ابن زیاد نے ایک عام حکم جاری کیا کہ تمام لوگ حسینؑ کے خلاف جنگ کے لئے نکلیں۔ یہ حکم جاری کر کے وہ ٹخیلہ گیا اور وہاں کھپ لگایا۔ شہر میں صرف کثیر ابن شہاب رہ گیا۔ وہ امام حسینؑ کے خلاف جنگ کے لئے نہ نکلنے والوں کو ڈرانا دھمکانا اور خوف و ہراس پھیلاتا تھا۔

انتہائی ہے کہ ایک سپاہی نے ایک شامی کو پکڑ لیا جو کوفہ میں اپنا قرض وصول کرنے آیا تھا۔ سپاہی نے اس کو پکڑ کر ابن زیاد کے سامنے پیش کیا۔ اس نے اس کو قتل کرنے کا حکم دیا اور کہا کہ ”گو یہ سچ

ہے کہ تم بے گناہ ہو اور ایک مسافر ہو لیکن پھر بھی تمہیں قتل کرنے سے لوگوں کو عبرت ہوگی۔“

(۳)۔ بلاذری نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ عبید اللہ ابن زیاد ایک ایک ہزار افراد پر مشتمل فوج بنا کر بلا بھیجتا تھا، لیکن کر بلا پہنچنے تک اس فوج میں تین یا چار سو افراد باقی رہ جاتے تھے۔ لوگ اس جنگ میں شامل ہونے سے کتراتے تھے اور سمجھتے تھے کہ یہ خدا اس کے رسول اور ان کے ذوی القربی کے خلاف جنگ ہے۔

(۴)۔ ابن زیاد کو خبر ملی کہ ایک ایک دو دو آدمی رات میں اس کے لشکر سے نکل کر حسینؑ کے لشکر سے جا ملتے ہیں تو اس نے حکم دیا کہ فرات کے پُل پر تعینات افراد کی تعداد بڑھائی جائے اور گمرانی کو سخت کیا جائے۔

(۵) عمر ابن سعد بنی امیہ نے قرہی کا رندوں میں سے تھا۔ حضرت مسلم ابن عقیل جب کوفہ پہنچے اور ان کے بارے میں کوفہ کے گورنر نعمان بن بشیر نے لاپرواہی سستی نرمی اور رعایت سے کام لیا تو یہ عمر ابن سعد ہی تھا جس نے اس کی رپوٹ بڑھ کر نعمان کی شکایت کی۔ حضرت مسلم جب گرفتار کر کے دارالامارہ میں لائے گئے تو انہوں نے عمر سعد کو قریشی ہونے کی بنا پر وصیت کے لئے بلایا تو اس نے وصیت سننے سے انکار کر دیا۔ یہ شخص خود کو بنی امیہ کا بڑا خیر خواہ ثابت کرنے کی کوشش میں لگا رہتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود جب عبید اللہ ابن زیاد نے امام حسینؑ کے خلاف جنگ کرنے کے لئے اس کو لشکر کا قائد بنا کر بھیجا تو اس نے معذرت چاہی۔ ابن زیاد نے جب اس سے حکومت رے کی سند واپس لینے کی دھمکی دی تو اس نے کہا کہ مجھے سوچنے کی مہلت دو، میں اس مسئلہ پر سوچوں گا۔ رے کی حکومت عمر سعد کی محبوب ترین اور دیرینہ خواہش تھی۔ جب وہ حکومت رے کے حصول اور امام حسینؑ کے خون میں ہاتھ رنگنے کے جرم کا موازنہ کرتا تو کہتا کہ۔

”حکومت رے کا حصول میرا مطلوب و مقصود ہے، لیکن حسینؑ کے خون میں ہاتھ رنگنے کی کم سے کم سزا جہنم ہے۔“

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عمر سعد جیسا شقی اور خبیث شخص بھی حسینؑ کے قتل میں ملوث ہونے کو برا سمجھتا تھا۔

یہ شخص جب کربلا پہنچا تو اس نے عبد اللہ شعی سے کہا کہ وہ امام حسینؑ سے جا کر پوچھے کہ وہ یہاں کیوں آئے ہیں؟ عبد اللہ شعی نے کہا کہ اگر تو چاہے تو میں حسینؑ کو قتل کر کے بھی آ سکتا ہوں تو عمر سعد اس پر ناراض ہو گیا۔

عمر سعد نے کربلا میں امام حسینؑ سے مذاکرات کرنے کے بعد ابن زیاد کو ایک خط لکھا کہ۔

”خداوند عالم نے فتنہ کی آگ کو ٹھنڈا کیا ہے اور امت کی اصلاح فرمائی ہے۔ حسینؑ یہاں سے واپس جانے کے لئے راضی ہیں۔“

اس کے علاوہ اس نے اس خط میں اپنی طرف سے اضافہ کرتے ہوئے لکھا کہ۔

”حسینؑ اپنا ہاتھ یزید کے ہاتھ میں دینے کو تیار ہیں۔“

یہ اضافہ اس نے صرف اس لئے کیا کہ وہ اپنے دامن کو قتل حسینؑ کے جرم سے بچانا چاہتا تھا۔ لیکن شمر ذی الجوشن نے عبید اللہ ابن زیاد کو عمر سعد کی تجویز پر عمل کرنے سے روکا اور ایک حتمی جنگ کے فیصلہ کا حکم نامہ لے کر عمر سعد کے پاس پہنچا۔ عمر سعد نے یہ حکم نامہ دیکھ کر شمر سے کہا کہ۔

”خدا تجھے گھر پہنچانا اور خیر نصیب نہ کرے تو جو چیز لے کر آیا ہے وہ بہت ہی بری ہے تو نے ہی ابن زیاد کو میرے مشورے پر عمل کرنے سے روکا ہے اور میری امیدوں اور خواہشات پر پانی پھیرا ہے، لیکن یاد رکھنا کہ حسینؑ کے جسم میں ان کے باپ کی روح ہے وہ کبھی سر نہیں جھکائیں گے۔“

(۶)۔ حر ابن یزید ریاحی نے جب عمر سعد سے پوچھا کہ۔

”تمہارے اور حسینؑ کے درمیان گفتگو اور مذاکرات کہاں تک پہنچے ہیں اور جو تجاویز حسینؑ

نے پیش کی ہیں کیا وہ قابل عمل قرار پائی ہیں یا نہیں؟“

تو عمر سعد نے کہا کہ۔

”اگر اختیار میرے ہاتھ میں ہوتا تو میں ان کی تجاویز ضرور تسلیم کر لیتا لیکن تمہارا امیر ان کو قبول نہیں کرتا۔“

(۷)۔ مدینہ میں ولید ابن عتبہ نے مردان کی تجویز کو مسترد کرتے ہوئے جب امام حسینؑ کو اپنی مجلس سے یزید کی بیعت کئے بغیر واپس جانے اور مسئلہ پر سوچ بچار کرنے کی اجازت دے دی تو مردان نے ولید سے کہا کہ ”تو نے میری رائے کے خلاف حسینؑ کو واپس جانے دیا اب وہ کبھی تیرے ہاتھ نہیں آئیں گے۔“ اس پر ولید نے کہا کہ۔

”وائے ہو تجھ پر تو نے مجھے ایک ایسا مشورہ دیا تھا کہ جس سے میرا دین اور دنیا دونوں برباد ہو جاتے، خدا کی قسم مجھے اگر پوری دنیا کا مالک بنا دیا جائے اور کہا جائے کہ میں حسینؑ کو قتل کر دوں تو بھی میں ایسا نہیں کروں گا، کیا میں حسینؑ کو صرف اس بات پر قتل کر دیتا کہ انہوں نے بیعت سے انکار کیا، خدا کی قسم جو بھی حسینؑ کے خون سے ہاتھ رنگے کا قیامت کے دن اسے اس خون کا حساب دینا پڑے گا، اس کا میزان عمل خفیف ہوگا اور خداوند عالم اس پر اپنی رحمت کی نظر نہیں کرے گا۔“ (حیات امام حسینؑ۔ ج ۲۔ ص ۲۵۶)

غرض یہ تمام شواہد اس بات کی دلیل ہیں کہ اہل عراق امام حسینؑ کے خلاف جنگ کرنے سے ناخوش تھے اور اسے سخت ناپسند کرتے تھے۔ عمر سعد جیسا شقی اور فاسق و فاجر انسان جو ہوس اقتدار میں سر سے پر تک ڈوبا ہوا تھا اور کرسی اقتدار کی خاطر اپنی دنیا و آخرت کی سعادت تک بیچنے پر آمادہ تھا وہ بھی امام حسینؑ سے جنگ کرنے اور ان کے خون میں ہاتھ رنگنے سے اپنا دامن بچانے کی کوشش کرتا رہا تو پھر عوام الناس کیوں کہ اس جنگ اور خونِ ناحق سے راضی ہو سکتے تھے۔

معمیم

”معمیم“ اس وادی کا نام ہے جو مکہ اور سرف کے درمیان واقع ہے۔ یہ مکہ سے تین یا چار فرسخ کے فاصلہ پر ہے۔ اس کے دائیں جانب ایک پہاڑ ہے جسے ”نعم“ کہتے ہیں اور ایک پہاڑ جو اس کے بائیں جانب ہے اسے ”ناعم“ کہتے ہیں۔ ان دونوں پہاڑوں کے درمیان واقع وادی کو ”نعمان“ کہتے ہیں۔ اسی مناسبت سے اس کا نام ”معمیم“ ہے۔ ”معمیم“ مدینہ سے آنے والوں کے لئے مکہ کی سرحد ہے۔ باب عمرہ سے اس کا فاصلہ ۶۱۴۸ میٹر ہے۔ یہاں دو نشانیاں ہیں جسے عرب انصاب کہتے ہیں۔ یہ دو نشانیاں بنی عباس کے خلیفہ مقتدر عباسی نے ۳۱۵ھ میں نصب کروائی تھیں۔ یہاں ایک مسجد ہے جسے اس وادی کے نام کی مناسبت سے ”مسجد معمیم“ کہتے ہیں۔ اس مسجد کو مسجد ”عائشہ“ بھی کہتے ہیں۔ اسے مسجد عائشہ اس لئے کہتے ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ نے عبدالرحمان بن ابوبکر سے کہا کہ حضرت عائشہ کو یہاں سے احرام بندھوائیں۔ اس مسجد کو مسجد عمرہ بھی کہتے ہیں کیونکہ یہ مکہ سے قریب ترین میقات ہے، یہاں سے عمرہ مفردہ کے لئے احرام باندھتے ہیں۔

امام حسین علیہ السلام ۸ ذی الحجہ کو جب مکہ سے عراق کے لئے نکلے تو آپ کی پہلی منزل بھی وادی تھی جہاں آپ نے قیام کیا۔ یہاں پر چند واقعات پیش آئے۔

(۱) مکہ کے نئے گورنر عمر ابن سعید اشدق کو جب یہ خبر ہوئی کہ حسینؑ مکہ سے عراق کے لئے نکلے ہیں تو اس نے اپنے بھائی یحییٰ ابن سعید اشدق کی کمان میں ایک مختصر سا لشکر امامؑ کے تعاقب میں روانہ کیا اور یحییٰ کے ہاتھ امامؑ کے نام ایک خط بھی بھیجا۔ یہ خط کتاب ”موسوعہ کلمات امام حسینؑ“ میں اس طرح نقل ہوا ہے۔

”میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ وہ آپ کو عقل و رشد عطا فرمائے اور اس عمل سے آپ کو باز رکھے جس میں آپ کی ہلاکت ہے۔ میں نے سنا ہے کہ آپ نے عراق کے سفر کا ارادہ کیا ہے۔ میں آپ کو خدا کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کہ آپ اختلاف، فتنہ اور فساد سے

باز رہیں۔ اگر آپ کو کوئی خوف ہے تو آپ میرے پاس آجائیں، میرے پاس آپ کے لئے امان ہے اور میرے دل میں آپ کے لئے نیکی اور صلہ رحمی ہے۔“

یہ خط مکہ کے گورنر کی ڈپلومیٹک پالیسی (Diplomatic policy) کا عکاس ہے۔ ایک طرف تو اس نے امامؑ سے ہمدردی اور خیر خواہی کے جذبات اور پند و نصیحت کا اظہار کیا ہے اور طبع دلاج بھی دیا ہے جب کہ دوسری طرف اس نے امامؑ پر نادان، جاہل اور فتنہ انگیز ہونے کی تہمت لگا کر آپ کی اہانت کرنے کی جسارت کی ہے۔ اس خط کے چند محرکات اور وجوہات ہیں جس کی وجہ سے اسے یہ خط لکھنے کی ضرورت پیش آئی۔

☆ عمر ابن سعید اشدق مطمئن تھا کہ امام حسینؑ اس کے پنچے میں ہیں اور اب اس سے بچ کر نہیں نکل سکتے۔ اس کا منصوبہ تھا کہ مکہ سے حجاج کی واپس کے بعد خالی ہونے کے بعد ان کا کوئی حامی اور ناصر بھی نہیں ہوگا اور یزید کی حکومت کے خلاف سازش کا ذمہ دار بھی حسینؑ کو ہی سمجھا جائے گا لیکن جب اسے یہ اطلاع ملی کہ حسینؑ مکہ سے نکل چکے ہیں اور ان کا رخ عراق کی طرف ہے تو اسے پریشانی ہوئی کہ دشمن ہاتھ سے نکل گیا۔ چنانچہ یہ پریشانی اس خط لکھنے کا محرک بنی۔

☆ خط لکھنے کی دوسری وجہ یہ تھی کہ جس طرح مدینہ سے ولید کے ہاتھ سے امام حسینؑ کا نکل جانا اس کی نااہلیت کا ثبوت بنا دیا ہے ہی امام حسینؑ کا اس وقت اس کے ہاتھ سے نکل جانا یزید کے سامنے اس کی نااہلیت کا ثبوت قرار پانا اور اس کی سبب کی کا سبب بنتا۔

☆ تیسری وجہ یہ تھی کہ اس وقت مکہ میں موجود حجاج میں یہ خبر عام ہو چکی تھی کہ حسینؑ مکہ میں اپنے لئے خطرہ محسوس کر کے یہاں سے نکلے ہیں اور یہ بات مکہ کے گورنر کے خلاف حجاج کے دل میں غیظ و غضب کا سبب بن رہی تھی اس لئے وہ پریشان تھا۔

☆ اس کے علاوہ حاکم مکہ نے دیکھا کہ امام حسینؑ نے عراق کا سفر اختیار کیا ہے جب کہ عراق ہی بنی امیہ کے مخالفین کا مرکز اور حکومت بنی امیہ کے لئے معارض بنا ہوا تھا۔ یہ بات اس کے لئے

پریشانی کا سبب تھی۔ اگر امام عراق کے علاوہ کسی اور جگہ کا عزم کرتے تو حکومت کو زیادہ تشویش نہ ہوتی۔

غرض وادی معیم میں امام کی بیٹی ابی سعید کے لشکر سے جھڑپ ہوئی اور امام نے اسے واپس پلٹنے پر مجبور کر دیا۔ عمر ابن سعید کے خط کے جواب میں آپ نے لکھا کہ:

”تم نے اپنے خط میں جس نیکی اور صلہ رحمی کا اظہار کیا ہے (اگر وہ حقیقت پر مبنی ہے) تو خدا تمہیں دنیا و آخرت میں جزائے خیر دے۔ تمہاری طرف سے مجھے اختلاف اور فتنہ سے باز آنے کی نصیحت کا جہاں تک تعلق ہے تو سمجھ لو کہ جو مسلمان عمل صالح کرتے ہیں اور لوگوں کو خدا کی طرف دعوت دیتے ہیں وہ فتنہ برپا نہیں کرتے۔ جہاں تک تمہاری امان کا تعلق ہے جس کا تم نے اپنے خط میں وعدہ کیا ہے تو جان لو کہ بہترین امان صرف خدا کی امان ہے۔ اس شخص کے لئے خدا کی امان نہیں جو اس دنیا میں خدا سے نہ ڈرے۔

میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ خوفِ خدا کرو تا کہ آخرت میں خدا کی امان ملے۔“

کتنا عجیب اتفاق اور عبرت کا مقام ہے کہ عمر ابن سعید اشدرق جس نے حسینؑ کو امان دینے کا لالچ دیا وہ خود بنی امیہ کے ظلم سے نہ بچ سکا اور بنی امیہ نے اس کو اور اس کے اہل اور اقربا کو قتل کر کے ٹکڑے ٹکڑے کیا۔ اس طرح وہ دنیا اور آخرت دونوں کی امان سے محروم ہوا۔

(۲)۔ معیم میں دوسرا واقعہ یہ پیش آیا کہ جناب نعتب سلام اللہ علیہا کے شوہر حضرت عبداللہ ابن جعفر کو جب یہ خبر ملی کہ امام حسینؑ مکہ چھوڑ کر عراق روانہ ہوئے ہیں تو انہوں نے بے تاب ہو کر ادھر تو اپنے دو فرزندوں کو یہ کہہ کر امامؑ کی طرف روانہ کیا کہ وہ جہاں بھی ملیں انہیں روکیں اور کہیں کہ میں بھی پہنچ رہا ہوں۔ اور خود عبداللہ ابن جعفر والی مکہ عمر ابن سعید اشدرق کے پاس گئے اور اس سے نام حسینؑ کے لئے ایک امان نامہ طلب کیا۔ ان کا امان نامہ طلب کرنا چوں کہ خود والی مکہ کی عین خواہش کے مطابق تھا اس لئے اس نے بغیر پس و پیش فوراً ایک

امان نامہ لکھ کر اپنے بھائی یحییٰ ابن سعید اشدرق کے ہاتھ میں دیا (شاید یہ وہی امان نامہ ہو جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے)۔ غرض عبداللہ امامؑ کی خدمت میں پہنچے تو امامؑ نے ان کے ساتھ واپس جانے سے انکار کیا۔ انہوں نے جب آپ سے واپس نہ چلنے کی وجہ پوچھی تو آپ نے جواب دیا کہ مجھے رسول اللہؐ نے ایک حکم دیا ہے جسے مجھے بہر حال انجام تک پہنچانا ہے۔ جب آپ سے اس حکم کے بارے میں پوچھا کہ وہ کیا حکم ہے تو آپ نے فرمایا کہ وہ نہ میں نے کسی کو بتایا ہے اور نہ بتاؤں گا۔ یہ سن کر عبداللہ ابن جعفر واپس مکہ آئے اور امامؑ نے اپنا سفر جاری رکھا۔

(۳) معیم میں تیسرا واقعہ جو رونما ہوا وہ جیسا کہ اکثر مقاتل میں بیان کیا گیا ہے یہ ہے کہ امام حسینؑ جب یہاں پہنچے تو دیکھا کہ ایک قافلہ اونٹوں پر لدے ہوئے تھے و تحائف لے کر شام کی طرف جا رہا ہے۔ یہ تحائف والی یمن بکیر ابن یسار نے یزید کے لئے بھیجے تھے۔ امام حسینؑ نے ان تحائف پر قبضہ کیا اور قافلہ والوں سے کہا کہ تم میں سے جو شخص یہاں سے واپس جانا چاہے واپس جاسکتا ہے، ہم اسے یہاں تک کی اجرت دیں گے اور جو بھی یہاں سے آگے ہمارے ساتھ چلنا چاہے ہم انہیں بھی ان کا حق ادا کریں گے۔

بعض جید علماء نے اس واقعہ سے انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ اقدام امام حسینؑ علیہ السلام کی شان اور مقام کے منافی ہے۔ آپ کی شان اس سے کہیں بلند و ارفع ہے کہ آپ ایسے کوئی اقدام کریں۔ جب کہ بعض سیرت نگار اور جید علماء نے نہ صرف اس واقعہ کی صحت کا اقرار کیا ہے بلکہ امامؑ کے اس اقدام کو صحیح اور ضروری اقدام قرار دیا ہے۔ اس اقدام کے صحیح اور ضروری ہونے کی سند میں وہ اس واقعہ کو پیش کرتے ہیں کہ جب یمن سے ایسے ہی تحفے و تحائف لے کر ایک قافلہ معاویہ کی طرف جا رہا تھا تو امام حسینؑ نے مدینہ میں ان تحائف پر قبضہ کر کے معاویہ کو خط لکھا تھا کہ:

”یہ تحفے و تحائف شام کے فرزانہ میں جمع ہونے کے لئے جا رہے تھے لیکن ان تحائف کے زیادہ حقدار مدینہ کے نادار اور مسکین ہیں اس لئے ہم نے ان تحائف کو ان مستحق حاجتمندوں میں تقسیم

کرنے کے لئے لے لیا ہے۔“

دوسری سند یہ ہے کہ پیغمبر اکرمؐ اور مسلمانوں کو ابوسفیان اور مشرکین کے ظلم و ستم سے نکل آ کر جب مکہ چھوڑ کر مدینہ آنا پڑا تو آپؐ نے مکہ اور شام کے درمیانی راستہ پر ایک دستہ مقرر کیا جس نے ابوسفیان کے قافلہ کے اس مال پر قبضہ کیا جو وہ شام سے مکہ لے کر جا رہا تھا۔ اس طرح پیغمبر اکرمؐ نے مشرکین مکہ کی اقتصادی ناکہ بندی کی۔

تیسری سند یہ ہے کہ یزید کی حکومت ایک غاصب حکومت تھی اور مالِ مسلمین پر اس کا قبضہ غاصبانہ تھا۔ امام حسین علیہ السلام کے اس اقدام کو اسی صورت میں غلط قرار دیا جاسکتا ہے جب اس کی خلافت و حکومت کو جائز اور مالِ مسلمین پر اس کو ادلیٰ بالتصرف مان لیا جائے۔ لیکن اگر اس حکومت کو ناجائز تھی اور یقیناً ناجائز تھی تو پھر امام کا اقدام سو فیصد درست اور صحیح تھا نیز کسی کے مال کا ضبط کرنا اس صورت میں درست نہیں جب وہ اس کا مال ہو لیکن اگر وہ مال ہی غصبی ہو تو پھر اسے ضبط کرنے کا اختیار امام کے پاس موجود ہوتا ہے۔ چنانچہ اگر امام حسینؑ کے اس اقدام کو غلط قرار دیا جائے تو امام علی علیہ السلام کے اس اعلان اور فرمان کو کیا کہیں گے جہاں آپؑ نے خلیفہ سوم کے دور خلافت میں بیت المالِ مسلمین سے ناجائز طور پر غیر مستحق لوگوں کو دیئے گئے مال کے متعلق فرمایا کہ:

”خدا کی قسم میں ایسا سب مال بیت المال میں واپس لاؤں گا اگرچہ وہ عورتوں کے جہیز میں ہی کیوں نہ دیا گیا ہو اور اس کو چاہے کنیزوں کی خریداری پر ہی کیوں نہ صرف کیا گیا ہو۔“ (نسخ البلاغہ خطبہ نمبر ۱۵)

از روئے اسلام و شریعت نہ پیغمبر اکرمؐ کا ابوسفیان کے مال پر قبضہ کرنا غلط تھا نہ امام علی علیہ السلام کا یہ فرمان اور اعلان اور نہ ہی امام حسین علیہ السلام کا یہ اقدام۔

چنانچہ امام علی علیہ السلام نے سب سے پہلا اقدام جو کیا وہ یہ تھا کہ حضرت عثمان نے جو مال

غیر شرعی طور پر تقسیم کیا تھا آپؑ نے اسے غیر مستحق افراد سے واپس لے کر بیت المال میں جمع کرنے کا حکم نافذ فرمایا۔

نوٹ

امام حسین علیہ السلام کے مقدس قیام و انقلاب کے دوران آپؑ کے بہت سے اقدامات، خطبات اور کلمات پیچیدہ، مشکل اور ناقابلِ فہم اس لئے قرار پاتے ہیں کہ عموماً لوگ آپؑ کے قیام کو ایک بے بس، مجبور اور ایک غیر ارادی عام انسان کا قیام سمجھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ امام کو یزید کی حکومت سے کوئی مخالفت نہیں تھی اور وہ اس کی غاصبانہ حکومت کے خلاف کوئی اقدام نہیں کرنا چاہتے تھے اور یہ کہ وہ تو صرف یزید ہے جو امام حسینؑ کو چھیڑ بیٹھا اور نہ اگر یزید، امام کو نہ چھیڑتا تو امام حسینؑ (معاذ اللہ) خاموش رہتے اور یزید کے خلاف قیام نہ کرتے۔

یہ ایک سطحی فکر ہے اور ان لوگوں کی فکر ہے جو خلافت اور حکومت کو ائمہ کے لئے شجر ممنوعہ اور ایک ناپاک چیز سمجھتے ہیں۔ اس فکر کے حامل لوگوں کے لئے نہ صرف لوگوں کے ناجائز اور غیر شرعی قبضہ سے اسواں کو واپس لینا بلکہ امام حسینؑ علیہ السلام کے بہت سے خطبات اور کلمات بھی قابلِ ہضم نہیں ہیں۔ اس قسم کا تصور آج بھی ہمارے درمیان بڑی شد و مد سے فروغ پا چکا ہے۔ لوگ استعمار کے تمام استحصالی اور استعماری کارناموں اور دھاندلیوں پر خاموش رہتے ہیں اور انہیں جائز اور قانونی قرار دیتے اور مسلمانوں کی اس سلسلہ میں جوابی کارروائی کو غیر اسلامی اور غیر قانونی قرار دیتے اور مسلمانوں کی اس سلسلہ میں جوابی کارروائی کو غیر اسلامی اور غیر قانونی قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ استعمار کے نمائندے مسلمانوں کے علاقوں میں جب سیاحی یا کسی اور روپ میں جاسوسی کے لئے آتے ہیں تو ان کی جاسوسی پر لوگوں کو کوئی اعتراض نہیں ہوتا گویا وہ ان کے اس عمل کو قانونی قرار دیتے ہیں لیکن ان جاسوسوں کو پکڑنا غیر قانونی سمجھا جاتا ہے۔ اسلامی ممالک میں ہزاروں مسلمان روزانہ قتل کئے جاتے ہیں اور ان کے خلاف کوئی آواز بلند نہیں ہوتی



امام اور فرزدوق کے درمیان اس گفتگو سے جو نکات روشن ہوتے ہیں وہ یہ ہیں۔

☆ فرزدوق ایک معاشرہ شناس انسان تھا اور اس کی دلیل یہ ہے کہ جب امام نے اس سے کوفہ کے بارے میں پوچھا تو اس نے جواب دیا کہ ”لوگوں کی تلواریں آپ کے خلاف ہیں لیکن ان کے دل آپ کے ساتھ ہیں۔“

اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ معاشرے کے لوگوں کے مزاج اور طبیعت سے آشنائی رکھتا تھا۔

☆ فرزدوق عقائد اسلامی کے حقائق و دقائق سے آگاہی اور آشنائی رکھتا تھا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اپنے تبصرے کے بعد اس نے کوفہ کے بارے میں اپنی معلومات کو مشیت الہی سے مربوط کیا اور وضاحت کی کہ یہ میری معلومات ہیں لیکن نہیں معلوم خدا کا فیصلہ کیا ہے پس پر وہ حقیقی فیصلہ خدا کا ہی فیصلہ ہوتا ہے اور ہونا وہی ہے جو خدا چاہتا ہے۔

☆ امام حسین اپنی اس سفر میں ایک اعلیٰ و ارفع مقصد کے لئے نکلے تھے۔ آپ کے یہ اہداف اتنے عظیم با مقصد اور ان کے حصول کے لئے آپ کے عزائم اتنے راسخ تھے کہ زمانہ کے نشیب و فراز اور فتح و شکست کا تصور ان کو متزلزل نہیں کر سکتے تھے چنانچہ آپ فرماتے ہیں کہ۔

”ہم اگر اپنا مقصد حاصل نہ بھی کر سکے تب بھی ہم خسارے میں نہیں کیونکہ جس کی نیت حق اور شیوہ تقویٰ ہو وہ جاوہ حق سے منحرف نہیں کہلاتا۔“

یہاں انسان کے ذہن میں ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ۔

امام نے اپنے قیام و انقلاب کے لئے فرزدوق جیسے دانا و بینا اور معاشرہ شناس شخص سے کیوں مدد طلب نہیں کی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ۔

امام نے جب اس سے یہ پوچھا کہ تم کون ہو تو اس نے اپنا نام بتانے سے گریز کیا۔ چنانچہ

امام نے سمجھ لیا کہ وہ آپ کی نصرت سے اپنا پہلو بچانا چاہتا ہے۔ اس کے بعد بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ حسین جیسا بامروت شخصیت اس سے مدد طلب کر کے اسے شرمسار کرتی۔

یہاں یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ لوگ امام حسین کو حق پر سمجھتے تھے جیسا کہ خود فرزدوق کے اس جملے سے واضح ہے کہ۔

”لوگوں کے دل آپ کے ساتھ ہیں۔“

لیکن امام کو حق پر سمجھتے ہوئے بھی ان کی نصرت سے جان چراتے تھے۔ اس کی وجہ اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ حق کے مقابلے میں لوگوں کو اپنی جانیں زیادہ پیاری تھیں۔

البتہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ وہی فرزدوق ہے جس نے کچھ عرصہ گزرنے کے بعد امام سجاد کی حمایت میں ہشام بن عبد الملک جیسے ظالم و جابر طاغوت سے نکلنے کے لئے خطرہ مول لیا۔ کل کے اس فرزدوق اور آج کے اس فرزدوق میں یہ فرق بتاتا ہے کہ۔

”کل کا فاسد انسان آج کا انقلابی اور کل کا انقلابی انسان آج کا فاسد انسان ہو سکتا ہے۔“

### ذاتِ عرق

یہ اہل عراق کی میقات ہے اور نجد اور تہامہ کے درمیان واقع ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ مکہ جاتے وقت ایک پہاڑ راستے میں آتا ہے جس کا نام عرق ہے اس پہاڑ کی مناسبت سے اسے ذاتِ عرق کہتے ہیں۔

عہد جاہلیت میں یہاں کچھ آبادی تھی جب یہ آبادی بڑھ گئی تو لوگ یہاں سے منتقل ہو گئے۔ پیغمبر اکرم نے یہاں ایک جگہ پر نماز پڑھی تھی اور اس کو اہل عراق کے لئے میقات قرار دیا تھا بعد میں اس جگہ پر مہدی عباسی نے ایک مسجد بنائی۔ میں ابن یوسف جعفری کہتے ہیں کہ ذاتِ عرق سے ڈھائی میل پہلے ایک مسجد ہے جو مسجد نبی کے نام سے مشہور ہے درحقیقت میقات وہ ہے۔ یہ مسجد تہامہ کے شروع میں ہے۔ اس کو مسجد نجد بھی کہتے ہیں۔ وہ مسجد جو ذاتِ

عرق میں ہے اسے مسجد عرق جبل کہتے ہیں۔ غرض مکہ سے عراق جاتے ہوئے ذات عرق راستے میں آتا ہے۔ آج کل اس کو ”طریق شرق“ یا ذات عرق مندرجہ کہتے ہیں۔

مورخین لکھتے ہیں کہ امام حسینؑ جب یہاں پہنچے تو بشر ابن غالب نے عراق سے آتے ہوئے یہاں امام سے ملاقات کی امام نے اس سے اہل عراق کے بارے میں پوچھا تو اس نے جواب دیا کہ۔

”کے دل آپ کے ساتھ لیکن ان کی تلواریں بنی امیہ کی حمایت میں ہیں۔“

اس پر امام حسینؑ نے فرمایا کہ۔

”برادر اسدی نے صحیح کہا خدا جو چاہتا ہے وہی کرتا ہے۔“

ذات عرق پر عبداللہ ریاشی نے بھی امام حسینؑ سے ملاقات کی۔ وہ کہتا ہے کہ۔

”فریضہ حج سے فارغ ہونے کے بعد میں تنہا اپنے سفر کو جاری رکھے ہوئے تھا کہ میری

نظر ایک خیمہ پر پڑی میں اس خیمہ کی طرف گیا اور معلوم کیا کہ یہ کس کا خیمہ ہے تو معلوم ہوا کہ یہ

حسینؑ ابن علیؑ کا خیمہ ہے۔ میں خیمہ کے نزدیک گیا تو دیکھا کہ امامؑ اپنے خیمہ کے دروازے پر تکیہ

کئے ہوئے کچھ خطوط پڑھ رہے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں۔

آپ اس دھت بیان میں کیسے کہ جہاں نہ کوئی آبادی ہے اور نہ رہائش؟“

امامؑ نے جواب دیا کہ۔

”بنی امیہ نے مجھے ڈرایا ہے۔ یہ اہل کوفہ کے خطوط ہیں جنہوں نے مجھے بلایا ہے یہی اہل کوفہ

مجھے قتل کریں گے (اور دیکھنا کہ) مجھے قتل کرنے کے بعد یہ ہر حرمت کو پامال کریں گے۔ خدا وید

عالم ان پر ایسا شخص مسلط کرے گا جو ان کو ختم کر دے گا اور ان کو ذلیل و رسوا کرے گا یہاں تک کہ

یہ لوگ خرقہ حیض سے بھی زیادہ ذلیل ہو جائیں گے۔“

امام حسینؑ علیہ السلام کے اس جواب میں اور مختصر کلمات میں چند نکات اور حقائق غور طلب

ہیں۔

☆ امام کا قیام ایک عام اور عادی قیام نہیں بلکہ اس وقت یہ قیام ہنگامی حالت اور خوف کے عالم

میں تھا۔

☆ کوفہ کی طرف یہ سفر آپؑ نے اہل کوفہ کی دعوت پر اختیار کیا ہے۔

☆ امامؑ یہ جانتے ہیں کہ اہل کوفہ آپؑ کو قتل کریں گے۔

☆ اپنے قتل کئے جانے کے خطرناک نتائج سے آگاہ کرتے ہوئے آپؑ نے بتایا کہ۔

(الف) میرے قتل کے بعد شریعت اور حرمت خدا پہلے سے زیادہ پامال ہوگی اور ان کی اہانت

ہوگی۔

(ب) میرے قتل کے بعد اہل کوفہ بھی محفوظ و مامون نہیں رہیں گے جس طرح مجھے قتل کیا گیا ان کو

بھی قتل کیا جائے گا۔

(ج) میرے قتل کے بعد یہ لوگ ذلیل و رسوا ہو جائیں گے۔

ہم یہاں امام حسینؑ علیہ السلام کے قتل کے نتائج میں سے پہلے دو شقوں کے بارے میں

کوئی بحث نہیں کریں گے (کیونکہ اس موضوع پر ہماری ایک کتاب انشاء اللہ جلد منظر عام پر آئے

گی) بلکہ تیسری شق کے بارے میں گفتگو کریں گے جس میں آپؑ نے پیشین گوئی فرمائی ہے کہ

میرے قتل کے بعد یہ لوگ ذلیل و خوار ہوں گے۔“

قتل امامؑ کے نتیجے میں امت کی ذلت و خواری

اپنے قتل کے بعد امت کو جس ذلت و رسوائی کا سامنا کرنا پڑے گا اس کے بارے میں

متعدد بار آپؑ امت کو اپنے قتل کے بعد برد آمد ہونے والے نتائج سے آگاہ کر چکے تھے چنانچہ۔

(۱) ملن عقبہ میں جعفر ابن سلیمان ضعی سے فرمایا کہ۔

”یہ لوگ میرا خون بہا کر دم لیں گے میرے قتل کے بعد خدا وید عالم ایک ایسے شخص کو ان

پر مسلط کرے گا جو ان کو فرقہ جیش سے بھی زیادہ ذلیل و خوار کرے گا۔“

(۲) منزلِ رنیمہ پر کوفہ سے آنے والے ابوہریرہ نامی شخص نے جب آپ سے اس سفر کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ۔

”بنی امیہ نے میرے ناموس کو سب و شتم کیا میں نے صبر کیا میرے مال کو لوٹا میں نے صبر کیا اب یہ میرا خون بہانا چاہتے ہیں تو میں نکل کر آیا ہوں۔ خدا کی قسم اگر انہوں نے مجھے قتل کیا تو خدا وید عالم ان کے سردوں پر ایسی تلوار مسلط کرے گا جو (مسلل) ان کو قتل کرتی رہے گی۔ خدا ان پر ایسے شخص کو مسلط کرے گا جو ان کو ذلیل و خوار کرے گا اور یہ اس قوم سب سے بھی زیادہ ذلیل و رسوا ہوں گے جن پر ایک عورت حکمرانی کرتی تھیں۔“

(۳) امام حسین علیہ السلام نے یوم عاشورا اپنے خطبہ میں فرمایا کہ۔

”لوگو! ہوش میں آ جاؤ اور آگاہ ہو جاؤ۔ میرے قتل کے بعد تم بھی زندہ نہیں بچو گے۔ تمہیں اتنی فرصت اور مہلت بھی نہیں ملے گی جتنی (سوار ہوتے وقت) ایک رکاب میں پیر ڈالنے کے بعد دوسری رکاب میں پیر ڈالنے کے لئے درکار ہوتی ہے۔ انسانوں کو پینے والی چکی کا دور تم پر آنے کا منتظر ہے تمہاری گردنیں اڑائے جانے کا ذن قریب ہے۔ (یا درکھو!) یہ ایک ایسا وعدہ ہے جو میرے جد سے میرے پدربزرگوار کے ذریعہ مجھ تک پہنچ ہے۔“

اس کے بعد امام نے آسمان کی طرف ہاتھ بلند کئے اور فرمایا کہ۔

”خداوند! آسمان کی بارش ان پر بند کر دے خداوند! جس طرح حضرت یوسفؑ کی زندانی کے دور میں اہل مصر کو قحط سالی میں مبتلا فرمایا ان کو بھی قحط سالی میں مبتلا فرما، ان پر ایک غلام ثقیف کو مسلط فرما جو انہیں موت کا مزا چکھائے کیونکہ انہوں نے ہمیں جھٹلایا ہے اور تنہا چھوڑا ہے۔“

خداوند! تو میرا رب ہے تیری ہی ذات پر میرا بھروسہ اور توکل ہے۔“

”خدا کی قسم ان میں سے کوئی نہیں بچے گا خدا ان سے میرا انتقام لے گا اور ہمارے ہر مقتول

کے بدلے میں ان کے ایک ایک شخص کو قتل کرے گا۔ وہ میرے اور میرے اہل بیت اور شیعوں کی مدد کرے گا۔“

چنانچہ امام حسینؑ نے متعدد مقامات پر اپنے قتل کے بعد پیش آنے والے نتائج اور اپنے قاتلوں کے انجام سے امت کو آگاہ کیا اور بتایا کہ میرے قتل کے نتیجہ میں۔

☆ یہ لوگ بھوک پیاس فقر و فاقہ اور قحط سالی میں مبتلا ہوں گے۔

☆ یہ لوگ ذلیل و خوار ہوں گے۔

☆ ان سب سے انتقام لیا جائے گا۔

☆ یہ لوگ آپس میں دست و گریباں ہوں گے۔

☆ ظالم جابر، شقی اور نا اہل حکمران ان پر مسلط ہوں گے۔

مندرجہ بالا آثار و نتائج جن کی پیشین گوئی امامؑ نے جا بجا فرمائی ان میں ایک نکتہ غور اور تحقیق طلب ہے اور قارئین کے لئے لمحہ فکریہ ہے اور وہ یہ کہ۔

کیا یہ سب امامؑ کی بددعا کا نتیجہ ہیں جو انہوں نے اپنے دشمنوں کے رویے، عناد و دشمنی، ظلم و ستم سے تنگ آ کر خدا کی بارگاہ میں کی اور اس یقین کے ساتھ کی کہ ”حسینؑ“ کا خدا امت کے حق میں ”حسینؑ“ کی اس بددعا کو مستجاب فرمائے گا اور یہ امت اسی عذاب میں مبتلا ہوگی؟

یا

یہ نتائج جن کی امامؑ نے خبر دی ایک غیبی خبر ہے جو معصومؑ نے اپنے پدروجد کے توسط سے سنی اور امت تک پہنچائی جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے؟

یا پھر۔

یہ آثار و نتائج ایک قانون قدرت اور سنتِ الہی ہیں کہ جب بھی کوئی قوم اہل اور صالح قیادت کو چھوڑ کر نا اہل اور فاسد قیادت کو معاشرے میں جگہ دیتی ہے تو اس کے فطری آثار و نتائج یہی

ہوتے ہیں؟

تاریخ انسانی کا عقل و فطرت، روایات ائمہؑ، انبیاء اور آیات قرآنی کی روشنی میں ایک وقت نظر سے مطالعہ کریں تو اسی تیسری اور آخری شق کی تائید و توثیق ہوتی ہے کہ جب بھی کسی معاشرے میں اہل اور صالح رہبر کی قیادت سے منہ موڑ کر اہل حکمرانوں کی قیادت کو قبول کیا جائے گا تو ان نتائج اور سزاؤں کا وقوع پذیر ہونا ایک حتمی قانون ہے، چاہے اس فاسد قیادت کو غیر شعوری اور غیر ذمہ داری کے نتیجے میں قبول کیا گیا ہو، طمع و لالچ کے تحت قبول کیا گیا ہو یا خوف و ہراس کی وجہ سے۔ اس حقیقت کا تحلیل و تجزیہ (چاہے جملہ معترضہ کی حیثیت ہی کیوں نہ رکھتا ہو) نہایت اہم اور ضروری ہے۔

(۱)۔ معاشرے میں رہبر کی ضرورت

انسانی معاشرے کی ضروریات میں رہبر کی ضرورت ایسے ہی ہے جیسے لباس غذا اور مکان کی ضرورت۔ دین و مذہب ہی نے رہبر کی ضرورت کا احساس نہیں دلایا بلکہ دین و مذہب سے پہلے بھی ہر معاشرے میں رہبر کی ضرورت انسانی زندگی کی ضروریات میں شمار ہوتی تھی۔ لہذا ہر انسانی معاشرہ چاہے وہ صالح ہو یا غیر صالح، مومن ہو یا منافق، مسلمان ہو یا کافر۔ کسی نہ کسی رہبر کا محتاج اور نیاز مند ہے۔

(۲)۔ شریعت میں رہبر کی اہمیت

شریعت اسلامی میں جہاں نماز، روزہ، حج، زکات اور جہاد کی اہمیت کو واضح کیا گیا وہاں ایک صالح رہبر کی اہمیت کو بھی شد و مد کے ساتھ نہ صرف اجاگر کیا گیا ہے بلکہ ان سب پر مسئلہ رہبریت کو فوقیت اور اہمیت دی گئی ہے۔ چنانچہ بعض روایات کے تحت شریعت میں فروع دین اور اصول دین کی اہم شقوں کے فروغ و نفاذ کو رہبریت کے مسئلہ سے مربوط کیا گیا ہے۔ اور اس کا انحصار ایک صالح رہبر کے وجود کا مرہون منت بتایا گیا ہے۔ فرمایا گیا ہے کہ ایک صالح رہبر ہی

معاشرے میں توحید و خد پرستی، انبیاء اور مرسلین کے احترام و تکریم اور عقیدہ معاد کی طرف رغبت و تشویق دلاتا ہے۔

چنانچہ امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ۔

”اسلام کی بنیاد نماز، روزہ، حج، زکات اور ولایت پانچ ستونوں پر قائم ہے۔ لیکن جتنی اہمیت ولایت کو حاصل ہے اور اسلام میں جتنی سفارش ولایت کے بارے میں کی گئی ہے اتنی پہلے چار ستونوں کے بارے میں نہیں کیونکہ ولایت ہی ان چار ستونوں کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ لیکن لوگوں نے بد قسمتی سے پہلے چار ستونوں کو اہمیت دی اور ولایت سے روگردانی اختیار کی۔“

(۳)۔ فاسد اور نااہل رہبر اور جرائم کا فروغ

بعض آیات قرآنی اور روایات پیغمبر اور ائمہؑ کے تحت معاشرے میں موجود تمام برائیوں کی جڑ فاسد اور فاسق رہبر ہی کو قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ تمام برائیاں فاسد قیادت ہی کے ذریعہ پھیلتی ہیں۔

حکمرانوں کی ہر ممکن کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح اپنی حکومت کی مدت کو دراز کریں۔ اس کے لئے وہ لوگوں میں مقبولیت حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لوگوں میں مقبولیت حاصل کرنے اور اپنی حکمت کو دوام و بقا بخشنے کی خاطر ان کے لئے ناپسندیدہ امور برائیوں اور جرائم سے پرہیز مانگ کر یہ ہے۔ ان کی اس پرہیزگار کو دو وقتوں کے چیلنج کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایک داخلی قوت اور دوسرے بیرونی قوت۔

داخلی قوت

نااہل اور فاسد حکمرانوں کی زندگی چونکہ علم و تقویٰ جیسی نعمت سے عاری ہوتی ہے۔ وہ اپنی نادانی و جہالت، نفسانی خواہشات اور اندرونی خباثت کہ جو ان کی فطرتِ ثانیہ بن جاتی ہے زیادہ دیر تک چھپا کر اور دبا کر نہیں رکھ سکتے۔ ان کی اندرونی خباثت انہیں بار بار رکشی پر ابھارتی رہتی ہے

اور آخر کار پردہ چاک ہو جاتا ہے اور ان کے جرائم جب آشکارا ہونے لگتے ہیں تو وہ ان پر پردہ ڈالنے اور چھپانے کے لئے مزید جرائم کا ارتکاب کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور ایک گناہ کو چھپانے کے لئے انہیں دوسرا گناہ کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ نا اہل اور فاسد حکمرانوں کی مجرمانہ ذہنیت جو بار بار ان کو ایک کے بعد دوسرے جرم پر مجبور کرتی ہے ان کے لئے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتی ہے جس کا انہیں سامنا ہوتا ہے۔

بیرونی قوت

ہرقوم و معاشرہ میں نا اہل اور فاسد حکمرانوں کے مقابلے میں باشعور لائق اور اہل افراد بھی موجود ہوتے ہیں جو ایک صالح قیادت کے اہل بھی ہوتے ہیں اور خواہاں بھی۔ چنانچہ یہ لوگ ہمیشہ حکمرانوں کے لئے ایک خطرہ اور چیلنج ثابت ہوتے ہیں لہذا حکمرانوں کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ مقام و منصب یا ثروت و دولت کی رشوت دے کر ان کو خاموش کر دیا جائے یا خوف و ہراس، ڈھونس و ہمکی، قید و بند اور جلا وطنی کے ذریعہ انہیں دور رکھا جائے ورنہ پھر ان کے وجود ہی کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا جائے۔ اس قسم کے جرائم کا ارتکاب فاسد اور نا اہل حکمرانوں کو اپنی حکومت کے بقاء و دوام کے لئے ناگزیر ہے۔

(۴) امت واحدہ منتشر اور متفرق امت

انسانی معاشرہ میں با فضیلت شرافت اور عدالت پسند افراد کی نگاہیں ہمیشہ ایک صالح رہبر کی طرف لگی رہتی ہیں اور ان کی امیدیں اسی صالح قیادت سے وابستہ رہتی ہیں۔ ایک صالح رہبر کی امیدوں کا مرکز بھی ایسی ہی باشعور امت ہوتی ہے جس کی مدد و تعاون سے وہ ظالم و فاسد حکمرانوں سے ٹکڑ لینے اور نبرد آزما ہونے کے لئے کمر باندھتا ہے۔ ادھر فاسد حکمران امت کی توجہ ایسی صالح قیادت کی طرف سے ہٹانے کے لئے خود کو فعال اور با کردار حکمران کے روپ میں پیش کرنے کے لئے اصلاحات کا ڈھونگ رچاتے ہیں، خود اپنے جرائم پر پردہ ڈالنے کی کوشش

کرتے اور معاشرے میں جرائم پر قابو پانے کے لئے خود کو فعال ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور امت کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے بیت المال کے دروازے کھولنے اور خزانوں کو لٹکانے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ کبھی عام معافی کا اعلان کر کے عادی مجرموں کو بھی آزاد کرتے ہیں تاکہ امت کے نہ صرف نیک اور صالح افراد بلکہ فاسق و فاجر لوگ بھی وقتی طور پر خوش ہو جائیں۔ ان کی تمام نیکیاں اور عوام سے ہمدردیاں صرف دکھاوے کی ہوتی ہیں۔ ان کے قول و فعل میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ ان کا اصل مقصد امت کی فلاح و بہبود نہیں بلکہ مقصود عوام کو صالح قیادت سے کاٹنا اور صالح رہبر کو یک و تنہا کرنا ہوتا ہے تاکہ بعد میں اسے مفسد فی الارض اور قانونی سزا کا مستحق قرار دے کر راستے سے ہٹایا جاسکے۔ صالح قیادت کو ایک مرتبہ راستہ سے ہٹا کر اور میدان کو اپنے حریف و رقیب سے خالی دیکھ کر یہ سیاسی بازی گر پھر اپنے ابلسی عزائم میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ ان کی انتقامی حس پھر جوش میں آ جاتی ہے اور پھر ان تمام لوگوں سے یہ گن گن کر بدلہ لیتے ہیں جنہوں نے صالح قیادت کا ساتھ دیا تھا۔ معاشرے میں ان کو ذلیل و خوار کیا جاتا ہے، کبھی ان کو خانہ جنگیوں میں مصروف رکھتے ہیں اور کبھی جنگوں میں دھکیل دیتے ہیں ان کو نان و نفقہ کی فکر میں مصروف کر کے اقتصادی طور پر مفلوج کرتے ہیں تاکہ وہ کوئی آواز نہ اٹھاسکیں یہاں تک کہ ان کی سوچ بھی مفلوج ہو کر رہ جائے اور آئندہ اہل و نا اہل رہبر کے بارے میں وہ سوچ ہی نہ سکیں۔

چنانچہ یہ وہ طبعی اور ناگزیر آثار ہیں جو کسی نا اہل اور فاسد حکمران کے برسر اقتدار آنے کے نتیجے میں ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ یہ حقیقت بھی اپنی جگہ اہل اور مسلم ہے کہ ایک مرتبہ اگر کسی نا اہل اور فاسد رہبر کو قبول کر لیا جائے چاہے وقتی اور مختصر مدت کے لئے ہی کیوں نہ ہو تو پھر کسی صالح قیادت کا میسر آنا اتنا آسان نہیں۔ کسی فاسد حکومت کی وراثت میں اس سے بدتر اور فاسد تر حکومت تو وجود میں آ سکتی ہے صالح قیادت نہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ صالح قیادت

کے وجود میں آنے کے امکانات معدوم سے معدوم تر ہوتے جاتے ہیں۔ پھر کسی صالح قیادت کو وجود میں لانے کے لئے نہ معلوم آگ و خون کے کتنے دریا عبور کرنا پڑتے ہیں؟

پیغمبر اکرمؐ کی وفات کے بعد جب قیادت کا رخ اپنے صحیح مرکز سے ہٹا کر اہل لوگوں کی طرف موڑ دیا گیا اور قائد کو نہیں بلکہ قیادت کو اس کے اہل اور شرعی وارث حقیقی سے محروم کر دیا گیا تو جناب زہرا سلام اللہ علیہا نے اپنے پد ریز رگوار کی امت اور عالم انسانیت کو پیش آنے والی مصیبتوں کو دور کیا اور بے تابانہ گھر سے نکل آئیں اور کبھی فدک کے بہانے اور کبھی کسی اور وسیلہ سے سقیفہ کی ما اہل قیادت کے خلاف اپنی صدائے احتجاج کو ہر موقع پر بلند کرتی رہیں اور ساتھ ہی امت کو آئندہ پیش آنے والی مصیبتوں سے خبردار کرتی رہیں جو انہوں نے ابوالحسنؑ کی صالح قیادت سے منہ موڑ کر اور اہل قیادت کا دامن تھام کر خود مول لیں تھیں۔ چنانچہ ہزار مرضیہ کی پیشین گوئیوں کے عین مطابق دنیائے انسانیت ان فاسد اور اہل حکمرانوں کے ظلم و ستم کی پچکی میں آج تک پستی چلی آ رہی ہے اور معاویہؓ عبید اللہ ابن زیدؓ خلفائے بنی عباسؓ سلطنت عثمانیہؓ برطانوی امپیریلزمؓ روسی سوشلزمؓ صدام اور امریکہ کی یہود و نواز حکومت کے شکنجے میں آج تک انسانیت سسک رہی ہے۔

حاجر

لفظ حاجر حاجر سے لیا گیا ہے جس کے معنی روکنے اور منع کرنے کے ہیں۔ یہ ایک وادی ہے جو طین رملہ کے بعد آتی ہے۔ اسی وادی کا نام حاجر ہے۔ بصرہ سے مدینہ جانے والے اور کوفہ سے مدینہ جانے والے یہیں ایک دوسرے سے ملتے ہیں یعنی یہ بصرہ سے مدینہ جانے والے اور کوفہ سے مدینہ جانے والے راستے کا سنگم ہے۔

امام حسین علیہ السلام جب حاجر پہنچے تو آپؑ نے قیس ابن مسہر صیداوی کے ہاتھ ایک خط کوفہ والوں کو روانہ کیا۔

قیس ابن مسہر صیداوی ایک صالح جوان تھے اور اشراف بنی اسد سے تعلق رکھتے تھے۔ امام حسینؑ کے مکہ آنے کی خبر سن کر یہ اہل کوفہ کی طرف سے خط لے کر امام کو دعوت دینے مکہ گئے۔ مکہ سے امام کے سفیر حضرت مسلم بن عقیل کے ہمراہ واپس کوفہ آئے اور کوفہ سے اہل کوفہ کا خط لے کر دوبارہ مکہ گئے، مکہ سے امام حسینؑ کے ساتھ نکلے۔ امام جب حاجر میں بطین رملہ کے مقام پر پہنچے تو قیس ابن مسہر صیداوی دوبارہ امام کی طرف سے خط لے کر امام کی آمد کی خوشخبری دینے کے لئے کوفہ کی طرف روانہ ہوئے۔ جب قادیسیہ پہنچے تو حصین ابن نمیر نے ان کو گرفتار کر لیا۔ قیس ابن مسہر نے گرفتار ہوتے ہی وہ خط پھاڑ دیا۔ حصین ابن نمیر نے ان کو عبید اللہ ابن زیاد کے پاس بھیج دیا۔ ابن زیاد نے ان سے ان لوگوں کے نام معلوم کرنے کی کوشش کی جن کے نام وہ امام حسینؑ کا خط لائے تھے لیکن انہوں نے ان کے نام بتانے سے بالکل انکار کر دیا۔ عبید اللہ ابن زیاد نے ان کو مجبور کیا کہ وہ منبر پر جا کر امیر المؤمنین امام علی علیہ السلام اور امام حسینؑ پر سب و شتم کریں۔ قیس ابن مسہر منبر پر گئے اور وہاں جا کر حضرت علی اور امام حسینؑ کی بجائے النابغیہ اور اس کے باپ اور اس کے امیر پر لعنت کی اور کوفہ والوں کو امام کی آمد سے آگاہ کیا۔ (نقل از طبری۔ جلد ۵)

بعض مقاتل اور تاریخوں کے مطابق آپؑ نے یہ خط عبید اللہ ابن قحطریہ الخمریؓ کے ساتھ روانہ کیا۔ لیکن زیادہ تر تاریخ میں قیس ابن مسہر صیداوی کا نام آیا ہے کہ وہ یہ خط لے کر کوفہ گئے۔ لیکن چونکہ عبید اللہ بھی عبید اللہ ابن زیاد کے ہاتھوں شہید ہوئے جیسا کہ قیس ابن مسہر شہید ہوئے۔ اس لئے ہو سکتا ہے کہ وہ جب حضرت مسلم کے ساتھ کوفہ گئے تو واپسی پر کوفہ سے نکلنے ہوئے قادیسیہ کے مقام پر حصین ابن نمیر کے ہاتھوں گرفتار ہوئے ہوں اور ابن زیاد نے انہیں شہید کیا ہو یا پھر امام حسینؑ نے ان کو کسی اور جگہ سے کوفہ بھیجا ہو۔

☆ (نوٹ) عبید اللہ ابن قحطریہ کو امام حسین علیہ السلام کا رضاعی بھائی کہا جاتا ہے لیکن یہ ایک بہت بڑا اشتباہ ہے۔ اس لئے کہ روایات بتاتی ہیں کہ امام حسینؑ نے کسی خاتون کا دودھ نہیں

پیا۔ یہاں تک کہ اپنی مادر گرامی حضرت زہرا سلام اللہ علیہا کا بھی دودھ نہیں پیا کیونکہ وہ اس وقت علیل تھیں۔ امام حسین نے عہد طفلی میں اپنی خدایہ پیغمبر اکرم کی زبان مبارک اور انگشت مبارک سے حاصل کی۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر) (بقیہ گزشتہ صفحے کا حاشیہ) بعض روایات کے مطابق آپ نے جناب زہراء مرضیہ کے دودھ اور پیغمبر اکرم کی زبان اور انگشت کے علاوہ کسی خاتون کا دودھ نہیں پیا۔

یہ اشتباہ شاید اس وجہ سے ہوا کہ عبداللہ ابن یقطر کی والدہ امام حسین کی مربی تھیں جیسا کہ فضل ابن عباس کی والدہ ام الفضل لبابہ آپ کی مربی تھیں۔ درحقیقت عبداللہ یقطر لدہ امام حسین ہیں۔ یعنی عبداللہ یقطر بھی اسی روز پیدا ہوئے تھے کہ جس روز امام حسین پیدا ہوئے تھے۔ بہر حال امام حسین کے اس خط کا مضمون یہ تھا۔

”دروود سلام کے بعد معلوم ہو کہ مجھے مسلم ابن عقیل کا خط ملا جس سے معلوم ہوا تم سب اس بات پر متفق ہو کہ میں تمہارے پاس کوفہ پہنچوں۔ میں خدا اور بزرگ و برتر کے حضور دعا گو ہوں کہ وہ ہمیں نیک توفیق اور تمہیں اجر عظیم عطا فرمائے۔“

تمہاری متفقہ اور متحدہ دعوت پر میں ۸/۸ رزی الحجیر و زمنگل مکہ چھوڑ کر تمہاری طرف آنے کے لئے نکل کھڑا ہوا ہوں۔ میں جلد ہی تمہارے پاس پہنچنے والا ہوں۔ میرا یہ خط ملتے ہی تم منظم اور مربوط طور پر اپنی تحریک میں تیزی شروع کر دو۔“

امام کے اس خط سے آپ کے قیام و انقلاب کے چند پہلو سامنے آتے ہیں۔

☆ امام نے ان کے اتحاد و اتفاق پر خوش اور مطمئن ہو کر ان کے حق میں دعا فرمائی۔

☆ آپ اس وقت مکہ سے نہیں نکلے جب تک حضرت مسلم بن عقیل نے اس امر کی تائید و تصدیق نہیں کر دی کہ اہل کوفہ واقعاً متفق اور متحد ہو کر آپ کی قیادت کے منتظر ہیں۔ یعنی آپ اہل کوفہ

کے خطوط اور ان کے نمائندوں کی دعوت پر اس وقت تک نہیں گئے جب تک کہ ان کے صدق

و خلوص کی تائید حضرت مسلم کی طرف سے نہیں ہو گئی۔

☆ کوفہ والوں کی دعوت اور امام کا اس دعوت کو قبول کرنے کا مرکزی نقطہ امام کی نصرت کرنا اور غاصبوں سے ان کا حق چھین کر آپ کو دلوانا ہے۔

☆ امام کا اپنے اس خط میں یہ تحریر کرنا کہ تم منظم اور مربوط انداز میں اپنی تحریک میں تیزی شروع کر دو۔ اس بات کو واضح کرتا ہے کہ آپ اس امر سے بخوبی آگاہ تھے کہ دشمن بڑی تیزی سے آپ کے پیچھے لگے ہوئے ہیں لہذا دشمن سے یہ موقع چھین لینا چاہئے۔

عیون

حاجر سے آگے یہ ایک جگہ ہے جہاں سے چند چشمے نکلتے ہیں۔ عبداللہ ابن مطیع عدلی یہاں رہتے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ۔

”میں نے جب دیکھا کہ امام حسین کا رخ عراق کی طرف ہے تو میں ان کی خدمت میں گیا اور کہا کہ فرزند رسول خدا آپ کی حرمت کو بچائے میں آپ کو خدا کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کہ آپ اپنی حرمت کو ضائع ہونے سے بچائیں۔ خدا کی قسم جو چیز بنی امیہ کے قبضہ میں ہے اسے اگر آپ کو قتل کر دیں گے اور آپ کو قتل کرنے کے بعد تو وہ اور بھی بڑ رہو جائیں گے اور کسی کو بھی قتل کرنے سے نہیں جھجکیں گے۔ قریش کو بھی قتل کر دیں گے۔ خدا کے لئے آپ قریش کی حرمت کو بچائیں۔“

امام نے اس کی بات کو کوئی اہمیت نہیں دی اور اپنے سفر کو جاری رکھا۔ عبداللہ ابن مطیع کے اس خطاب سے اس کی سوچ و فکر کے چند پہلو سامنے آتے ہیں۔

☆ عبداللہ ابن مطیع کی فکر میں عربی تعصب اور نیشلمزم رچی بسی ہوئی تھی۔ وہ اسلام کو قریش اور عرب نیشلمزم کے حوالے سے دیکھتے ہیں اور امام کو اپنے ارادے سے روکنے کی کوشش کرتے ہیں۔

☆ وہ ”حسین“ کو فرزند رسول ہونے کی حیثیت سے زیادہ ان کے ذاتی حسن و جمال، کمال و شجاعت اور ان کی محبت و شفقت کے آئینہ میں دیکھتے ہیں اور ان سے اپنی ذاتی محبت و وابستگی کے نتیجہ میں ان کی جان کے زیاں کے خیال سے انہیں اپنے اس سفر سے باز رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس سے آگے وہ ”حسین“ کی معرفت نہیں رکھتے اور نہیں جانتے کہ ”حسین“ کے کاندھوں پر کتنی عظیم ذمہ داری ہے اور وہ اپنی کس الہی مسؤلیت کی ادائیگی کے لئے نکلے ہیں۔

چنانچہ آج بھی ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں عبداللہ بن مطیع ”حسین“ سے اپنی وابستگی اور پیوستگی کا اظہار صرف علم و ضریح اور ذوالجناح سے عقیدت میں سمجھتے ہیں اور نہ ”حسین“ کو درک کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور نہ ان کے ہدف و مقصد کو۔

یہ لاکھوں عبداللہ بن مطیع نہیں جانتے کہ ”حسین“ ابن علی کے مشن کی تکمیل کی ذمہ داری

آج بھی اسی طرح ان کے ذمہ ہے جس طرح کل کربلا میں ”حسین“ کے انصار و اعوان کے ذمہ تھی۔ یہ لوگ صرف ”حسین“ کی ذات سے وابستہ اور پیوستہ ہیں ان کے مشن اور ہدف سے نہیں۔ یہ لوگ نہیں پہچانتے کہ ”حسین“ فرزند رسول ہونے اور ذاتی فضائل و کمالات کے حامل ہونے کے علاوہ محافظ قرآن و شریعت بھی ہیں اور انبیاء بھی اور اسلام کے رکھوالے بھی۔

چنانچہ عبداللہ بن مطیع جیسے لوگوں نے ”حسین“ کی ذات کے لئے خطرہ دیکھا انہوں نے حسینؑ کا ساتھ نہیں دیا اور جن لوگوں نے اسلام اور دین و شریعت کے لئے خطرہ محسوس کیا ان لوگوں نے امامؑ کا ساتھ دیا۔

☆ عبداللہ بن مطیع کے خطاب سے ایک اور چیز واضح ہوتی ہے اور وہ یہ کہ وہ دیکھ رہا تھا کہ امامؑ جس چیز کے حصول کے لئے جا رہے ہیں وہ بنی امیہ کے قبضہ میں ہے اور وہ چیز حکومت و خلافت کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں۔

عبداللہ بن مطیع یہ بھی درک کر رہا تھا کہ ”حسین“ بنی امیہ سے جس چیز کے حصول کے لئے

جا رہے ہیں اس کے حصول کی کوشش کی سزا بنی امیہ کی طرف سے کم از کم موت ہے۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ظالم حکومتیں اپنے خلاف کسی قیام اور انقلاب کی سزا موت سے کم نہیں دیتیں۔

☆ عبداللہ بن مطیع نے جب یہ کہا کہ بنی امیہ سے جو چیز آپ چھیننے جا رہے ہیں اس کا نتیجہ موت ہے تو امامؑ نے اس کی تردید نہیں کی۔ اس سے کم از کم یہ بات تو واضح ہے کہ اس کا تجزیہ غلط نہیں تھا ورنہ امامؑ اس کی تردید کرتے۔

☆ امامؑ نے عبداللہ بن مطیع کے مشورہ کو کوئی اہمیت نہیں دی اور اس کو کوئی جواب دیئے بغیر اپنے سفر کو جاری رکھا۔ اس کی وجہ اس کے علاوہ کچھ اور نہیں ہو سکتی کہ وہ قتل ہو جانے کے خوف سے امامؑ کو ان کے ہدف و مقصد سے روکنے کی بات کر رہا تھا اس لئے آپؑ نے اسے جواب دینے سے گریز کیا۔

خرنہ میہ

خرنہ میہ، خرم کا اسم تصغیر ہے۔ مکہ اور کوفہ کے درمیانی منازل میں سے کوفہ سے نزدیک یہ ایک جگہ کا نام ہے۔ کوفہ سے مکہ آتے ہوئے یہ جگہ زور کے بعد آتی ہے۔ بعض نے کہا کہ کوفہ سے آتے ہوئے یہ جگہ ثعلبیہ کے بعد آتی ہے۔ معجم بلدان میں لکھا ہے کہ خرنہ میہ اور ثعلبیہ کے درمیان بیس میل کا فاصلہ ہے۔ یہ جگہ بنی ہاشم اور اسد سے تعلق رکھتی ہے۔ یہاں چھ کنویں ہیں پانی کے چشمے ہیں، درخت ہیں اور کچھ آبادی ہے۔ امام حسینؑ نے یہاں ایک دن اور ایک رات قیام کیا۔ اسی جگہ پر عقیلہ قریشیہ نے کبریٰ سلام اللہ علیہا نے امام حسینؑ سے کہا کہ میں نے ہاتھ سے صداسنی جو یہ شعر کہہ رہا تھا کہ۔

”یہ قافلہ موت کی طرف بڑھ رہا ہے اور موت ان کی طرف بڑھ رہی ہے۔“

امامؑ نے کہا کہ۔

”بہن! خدا کی جو مشیت ہے وہ پوری ہو کر رہے گی۔“

زور

اور ایک جگہ کا نام ہے جہاں کوفہ سے آنے والے حاجی قیام کرتے ہیں۔ یہ مقام کوفہ سے آتے ہوئے خزیمہ سے ایک میل پہلے واقع ہے۔ اس کو زور کہنے کی دو وجہ ہیں۔

(۱)۔ حلق سے نیچا تر جانے کو زور کہتے ہیں۔ چونکہ یہ ریگستانی علاقہ ہے اور یہاں کی زمین بارش کے پانی کو فوراً جذب کر لیتی ہے اس لحاظ سے اس جگہ کو ”زورڈ“ کہتے ہیں۔

(۲)۔ ابن کلبی کہتے ہیں کہ یثرب بن قانیہ کی تین بیٹیاں تھیں جن میں سے ایک کا نام زور تھا۔

چنانچہ اس کی بیٹی ”زورڈ“ کے نام سے یہ جگہ منسوب ہے۔ اس کے علاوہ ایامِ جاہلیت میں بنی ترعب اور بنی یربوع کے درمیان اس جگہ جنگ لڑی گئی لہذا تاریخ عرب میں وہ دن یومِ زور کے نام سے مشہور ہے۔

یہ وہ مقام ہے جہاں زہیر ابن قین بکلی کی ملاقات امام حسین علیہ السلام سے ہوئی۔ زہیر ابن قین شیعانِ امام حسین یا شیعانِ علیؑ میں سے نہیں تھے بلکہ وہ عثمانی العقیدہ تھے۔ زہیر حج کے بعد مکہ سے واپس آ رہے تھے۔ اور امام حسینؑ اپنا سفر جاری رکھے ہوئے تھے۔ اثناء سفر میں زہیر امام حسینؑ کا سامنا کرنے سے گریز کر رہے تھے۔ وہ اپنے کاروان کا خیمہ امام کے خیمہ سے آگے یا پیچھے ذرا فاصلہ پر نصب کرتے تھے تاکہ آسنا سامنا نہ ہو۔ ایک مرتبہ پانی نہ ہونے کی وجہ سے مجبوراً ان کو اپنا خیمہ امام کے خیمہ کے قریب نصب کرنا پڑا۔ خیمہ نصب کرنے کے بعد وہ کھانا کھانے کی تیاری کر رہے تھے کہ امام کا قاصدان کے پاس پہنچا اور سلام کے بعد پوچھا کہ آپ میں سے زہیر کون ہیں انہیں امام بلا رہے ہیں۔ یہ سن کر ایک خاموشی طاری ہو گئی کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس خاموشی کو زہیر ابن قین کی نیک اور صالحہ زوجہ ولیمہ بنت عمرو نے توڑا اور تعجب سے زہیر سے کہا کہ۔

”سبحان اللہ! فرزندِ رسول تم کو بلا رہے ہیں اور تم ان کی آواز پر لبیک نہیں کہتے۔“

تاریخ اور مقاتل لکھتے ہیں زہیر بادلِ نخواستہ اور چہرے پر ناگواری کے تاثرات کے ساتھ امام کے خیمہ میں گئے لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد فرحان و شاداں امام کے خیمہ سے واپس آئے۔ اپنے خیمہ میں واپس پہنچے اور اپنے خیموں کو امام کے خیموں کے ساتھ لگانے کے لئے کہا۔ اپنی نیک صفت زوجہ سے کہا کہ میں تم کو اجازت دیتا ہوں تم چلی جاؤ میں نہیں چاہتا کہ تم خیر کے علاوہ کوئی بُری خبر سنو۔ پھر اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہوئے اور انہیں اپنی زندگی کا ایک اہم واقعہ سناتے ہوئے کہا کہ۔

”ہم سلمان فارسی کے ہمراہ بلخ میں جنگ کے لئے گئے ہوئے تھے جس میں ہمیں فتح نصیب ہوئی بلخ فتح ہوا اور ہمیں بے شمار مالِ غنیمت ہاتھ لگا۔ ہم بہت شاداں اور مسرور تھے۔ ہمیں خوش و مسرور دیکھ کر سلمان فارسی نے کہا کہ اگر تم جو ان آلِ محمد گورک کر سکو تو اس مالِ غنیمت کے مقابلہ میں کہیں زیادہ خوشی اور مسرت محسوس کرو گے۔ جس دن تم نے آلِ محمد گورک کر لیا اس کے بعد ان کے مقابلہ میں اس مالِ غنیمت کی تمہاری نظروں میں کوئی قیمت و وقعت نہیں رہے گی۔“

یہ واقعہ سنا کر زہیر نے اپنے ساتھیوں کو اوداع کہا اور کہا کہ تم میں سے جو بھی میرے ساتھ امام حسینؑ کی نصرت کرنا چاہتا ہے وہ میرے ساتھ آجائے ورنہ یہ ہماری اور تمہاری آخری ملاقات ہے۔ یہ سن کر زہیر کی زوجہ مومنہ نے اپنے شوہر کے لئے دعائے خیر کی اور استدعا کی جب حسینؑ کے جد سے ملاقات ہو تو مجھے فراموش نہ کر دینا۔

شعلیہ

شعلیہ ایک جگہ کا نام ہے جو مکہ سے کوفہ کے راستہ میں خزیمہ کے بعد آتی ہے۔ شعلیہ کے بعد شقوق آتا ہے۔ مکہ سے شعلیہ پہنچنے کے بعد کوفہ کا دو تہائی راستہ طے ہو جاتا ہے۔ زجاجی کے قول کے مطابق یہ جگہ ثعلبہ بن مالک بن دودان بن اسد سے منسوب ہے۔ اس نے یہاں ایک کنواں کھودا تھا۔

جیسا کہ کتاب ”زندگانی امام حسین“ اور ”اعیان الشیعہ“ میں لکھا ہے۔

شعلیبیہ پر امام حسین علیہ السلام کی ملاقات ایک اور شخص سے ہوئی جس نے آپ سے سورہ بنی اسرائیل کی آیت ۱۷ ”یوم ندعو اکل اناس بائناہم۔۔۔۔۔“ کی تفسیر پوچھی۔ آپ نے اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا کہ امام اور داعی دو قسم کے ہوتے ہیں اسی طرح ان کی دعوت کو قبول کرنے والے لوگ بھی دو قسم کے ہوتے ہیں۔۔۔۔۔ ایک وہ امام جو لوگوں کو خدا کی طرف دعوت دیتے ہیں اور لوگوں کا ایک گروہ ان کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے اسے قبول کر لیتا ہے۔ جب کہ کچھ امام ایسے ہوتے ہیں جو لوگوں کو ضلالت اور گمراہی کی طرف بلا تے ہیں اور وہ ان کی دعوت کو قبول کر لیتے ہیں۔ آیت کی تفسیر کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ ”پہلا گروہ جنت میں جائے گا جب کہ دوسرا گروہ جہنم میں۔“ آپ اپنی اس تفسیر کے استدلال میں قرآن کی یہ آیت پیش کی۔

”فریق فی الجنة فریق فی السعیر۔۔۔۔۔“

(نقل از کتاب نہج الشہادۃ۔ ص ۲۴۶)

آپ نے دونوں قسموں کے نام کے نسب و خاندان کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ:

”ہم نے اور بنی امیہ نے خدا کے بارے میں ایک دوسرے سے دشمنی کی ہماری یہ دشمنی قیامت تک باقی رہے گی۔ حضرت جبرئیل ایک پرچم لے کر آئے جو انہوں نے ہمارے درمیان نصب کیا۔ (اس کے مقابلہ میں) ابلیس بھی اپنا باطل پرچم لے کر آیا جو اس نے بنی امیہ کے درمیان نصب کیا۔“ (نہج الشہادۃ۔ ص ۳۸۸)

امام علیہ السلام نے یہاں حق و باطل کی شناخت کے لئے کسوٹی اور معیار نسب و خاندان کو قرار دیا۔ یعنی باطل کی تمیز کرنے والے کے ذہن میں یہ امر واضح رہے کہ ایک طرف ”بیت نبوت“ ہے اور دوسری طرف ”بیت امیہ“۔

جب نصر ابن مالک نے امام سے آیت ”ہذا ان خصمان۔۔۔۔۔“ (سورہ حج۔ آیت

۱۹) کی تفسیر پوچھی تو آپ نے آیت کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا کہ:

”ہمارے اور بنی امیہ کے درمیان خدا کے بارے میں اختلاف ہے۔“

یعنی آپ نے حق باطل کا معیار اور کسوٹی ”قول و فعل“ کو قرار دیا اور فرمایا کہ ہمارا جھگڑانہ خاندانی ہے اور نہ مقام و منصب کے لئے اور نہ ہی زور زمین کے لئے بلکہ ہمارا جھگڑا خدا کے بارے میں ہے۔ ہم نے کہا کہ ”خداوند عالم نے جو کچھ فرمایا وہ سچ ہے چنانچہ ہم نے اپنے قول و فعل سے خدا کی تصدیق کی جب کہ بنی امیہ نے خدا کو جھٹلایا۔“

حارث ابن عاذر نے امام حسین سے ”والشمس والظہما، والقمر اذ اتانھا والنہار اذ اجلھا واللیل

اذ بغشھا“ کی تفسیر پوچھی تو آپ نے فرمایا کہ:

”شمس“ سے مراد پیغمبر ہیں۔

”قمر“ سے مراد علی ہیں۔

”نہار“ سے مراد امام زمانہ ہیں۔

اور

”لیل“ سے مراد بنی امیہ ہیں۔

امام حسین علیہ السلام نے امام وداعی کی شناخت کے لئے آثار و علامات کی وضاحت فرمائی ہے کہ امام حق کی پہچان۔۔۔۔۔ نور و ضیاء ہے۔ امام حق لوگوں کو تاریکی میں نہیں رکھتا بلکہ اس کی دعوت ہمیشہ روشن اور واضح ہوتی ہے۔ جب کہ امام باطل کی علامت تاریکی اور ضلالت ہے وہ لوگوں کو دھوکے کا ارتار تاریکی میں رکھتا ہے اور ایک دن ضلالت کی گمراہیوں میں دھکیل دیتا ہے۔

ایک مرتبہ ایک شخص نے امیر المؤمنین امام علی علیہ السلام سے پوچھا کہ۔

”ناس“ کون ہیں؟

”اشباہ الناس“ کون ہیں؟

اور "نساس" کون ہیں؟

تو حضرت نے اپنے فرزند امام حسینؑ سے سائل کے سوال کا جواب دینے کے لئے کہا امام حسینؑ نے فرمایا کہ:

"ناس" ہم ہیں۔

یعنی وہ تمام خصوصیات اور امتیازات جو ایک انسانِ کامل میں ہونا چاہئیں اس کا مصداق ہم ہیں۔ آپ نے اپنے جواب کا استدلال اس آیت سے کیا۔

"افيضوا من حيث افاض الناس" (سورہ بقرہ - آیت ۱۹۹)

اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ:

"اشباه الناس" ہمارے تابعین اور شیعہ ہیں۔ وہ ہم سے ہیں۔"

اپنے اس جواب کا استدلال آپ نے اس آیت سے فرمایا۔

"فمن تبعني فانه مني"

پھر آپ نے فرمایا کہ:

"نساس" تمام عام لوگ ہیں۔

اور اس کے استدلال میں آپ نے یہ آیت پیش فرمائی۔

"---- كالانعام بل هم اضل ----" (سورہ اعراف - آیت ۱۷۹)

ثعلبہ میں عبداللہ بن سلیم اور منذر ابن مشعل نامی دو اشخاص نے امام حسینؑ سے ملاقات کی۔ یہ دونوں آدمی امام حسینؑ کے پیچھے پیچھے آ رہے تھے انہوں نے منزلِ زوردر پر دیکھا کہ امام حسینؑ کوفہ سے آنے والے ایک شخص کی طرف شاید اس خیال سے بڑھے کہ اس سے کوفہ کے حالات معلوم کریں تو اس شخص نے اپنا راستہ بدل دیا اور امامؑ سے ملاقات سے گریز کیا۔ لیکن عبداللہ بن سلیم اور منذر ابن مشعل نے کہ جو امامؑ کے پیچھے پیچھے اپنا سفر جاری رکھے ہوئے تھے اس شخص کو

جالیا اور اس سے کوفہ کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ کوفہ کی خبروں میں سے اہم خبر حضرت مسلم بن عقیل اور ہانی بن عروہ کی شہادت کی خبر تھی۔ منزلِ ثعلبہ پر یہ دونوں امامؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ ہمارے پاس کچھ خبریں ہیں آپ چاہیں تو ہم یہیں بیان کریں اور اگر چاہیں تو خلوت میں بیان کریں۔ امامؑ نے اپنے اصحاب کی طرف نظر کی اور فرمایا کہ میں اپنے اصحاب سے کچھ نہیں چھپاتا تمہارے پاس جو خبر ہے سناؤ۔ انہوں نے عرض کیا کہ منزلِ زوردر پر جس شخص سے آپ کوفہ کے حالات پوچھنا چاہتے تھے وہ ہم نے اس سے معلوم کر لئے ہیں۔ وہ ہمارے ہی قبیلہ کا آدمی ہے اور معتبر انسان ہے۔ اس نے بتایا کہ "میں ابھی کوفہ سے نکلا نہیں تھا کہ مسلم بن عقیل اور ہانی بن عروہ کو شہید کر دیا گیا۔ امامؑ نے اپنے دو جانثاروں کی شہادت کی خبر سن کر آیتِ عہد کی تلاوت فرمائی اور ان کی مصیبت پر گریہ اور افسوس کرنے کے بعد صلاح اور مشورے کے لئے اپنے اصحاب کا ایک اجلاس طلب کیا۔

ثعلبہ میں امام حسینؑ کی اپنے اصحاب کے ساتھ میٹنگ

اگرچہ کسی مقاتل یا تاریخ میں ایسا کوئی ذکر نہیں ملتا کہ امامؑ نے صلاح و مشورے کے لئے اپنے اصحاب کا کوئی اجلاس طلب کیا ہو، لیکن قرآن، حالات اور اولادِ عقیل سے امام کی گفتگو آگے سفر جاری رکھنے یا واپس لوٹ جانے کے سلسلہ میں اصحابِ امامؑ میں اختلاف رائے۔۔۔۔۔ یہ تمام حقائق نشاندہی کرتے ہیں کہ ایک ایسا اجتماع یقیناً وجود میں آیا ہوگا۔ اس سلسلے میں ہم چند شواہد پیش کرنا چاہیں گے۔

☆ مقاتل میں لکھا ہے کہ منزلِ ثعلبہ پر امامؑ کو جب حضرت مسلم بن عقیل اور ہانی بن عروہ کی شہادت کی خبر ملی تو آپ نے کلمہ استرجع اپنی زبان پر جاری کیا، اولادِ عقیل کی طرف نظر کر کے دیکھا، ان کو پرسہ دیا اور ان سے پوچھا کہ اب ان کی کیا رائے ہے؟ انہوں نے بی ک زبان ایک عزم کے ساتھ کہا کہ ہم وہی راہ اپنائیں گے جس راہ میں مسلمؑ قربانی دی۔

امام نے فرمایا کہ:

”ان کے بعد اب زندگی بے کیف ہے۔“

چنانچہ مقاتل کی رود سے کم از کم یہ تو ثابت ہے کہ امام نے اولادِ عقیل کو جمع کیا اور ان سے رائے طلب کی۔

☆ مقاتل اور تاریخ سے یہ بات بھی ثابت ہے کہ حضرت مسلم اور ہانی بن عروہ کی شہادت کی خبر سننے کے بعد امام کے بعض اصحاب نے کہا کہ ”ہمیں یہاں سے واپس جانا چاہیے“ جب کہ بعض نے کہا کہ ”نہیں ہم اپنا سفر جاری رکھیں گے“ حالات جو بھی ہوں ہم ان کا مقابلہ کریں گے۔“

بعض اصحاب کا یہ کہنا کہ ”ہمیں یہاں سے واپس جانا چاہیے“ اور بعض اصحاب کا یہ کہنا کہ ”ہم سفر کو جاری رکھیں گے۔۔۔۔۔“ ظاہر ہے کہ یہ اختلاف رائے ایک بے ساختہ اور افراتفری کا عمل نہیں ہو سکتا کیونکہ ان اصحاب میں امام کے تربیت یافتہ افراد بھی تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ امام کے اجلاس طلب کرنے اور لوگوں سے اس موضوع پر رائے طلب کرنے کے نتیجے میں ہوا ہوگا۔

☆ امام کا یہ سفر ایک انفرادی سفر نہیں تھا امام کسی سیر و سیاحت پر نہیں نکلے تھے اور نہ ہی آپ نے کسی کی انفرادی دعوت یا اپنے خاندانی اعضاء اور احباب کی دعوت پر یہ سفر اختیار کیا تھا۔ بلکہ اس سفر میں سو کے قریب افراد آپ کے ہم سفر تھے یہاں تک کہ ان کے اہل و عیال بھی ان کے ہمراہ تھے۔ ان میں نہ صرف بنی ہاشم کی شخصیات شامل تھیں بلکہ یمن سے آنے والے افراد بھی تھے بصرہ سے آنے والے بھی تھے اس کے علاوہ دیگر مختلف افراد حتیٰ کہ وہ لوگ بھی شامل تھے جو اہل کوفہ کے نمائندے تھے اور کوفہ سے آپ کو بلانے آئے تھے۔ ان کا اپنا کوئی مقصد نہیں تھا بلکہ ان سب کے سفر کے مقاصد آپ ہی کے مقاصد سے مربوط تھے۔ لہذا یہ ممکن نہیں کہ امام صرف اولادِ عقیل کے جوانوں سے مشورہ کر کے ان کے مشوروں پر عمل کریں اور اپنے ان اصحاب کو نظر انداز کر کے ان سے رائے نہ لیں۔

لہذا ضروری امام نے اپنے تمام اصحاب کو مشورہ کے لئے جمع کیا ہوگا۔

☆ امام علیہ السلام اگرچہ مکہ سے اپنی جان بچانے اور اس سے زیادہ حرمتِ بیت اللہ کو بچانے کے لئے وہاں سے نکلے تھے لیکن بنیادی مقصد کوفہ کی طرف سفر تھا۔ یہ سفر اتفاقی طور پر نہیں تھا۔ بلکہ اہل کوفہ کی طرف سے سینکڑوں خطوط ملنے اور بہت سے وفود آنے کے بعد آپ نے اس سفر کا ارادہ کیا۔ نہ صرف اہل کوفہ کے خطوط و وفود کے بعد بلکہ آپ نے یہ سفر اسی وقت اختیار فرمایا جب آپ کے بھائی مسلم ابن عقیل نے یہ تائید و توثیق کر دی کہ کوفہ کی اجتماعی اور سیاسی قیادت سنبھالنے کے لئے لوگ آپ کے منتظر ہیں۔ لیکن ایک ایسے موڑ پر کہ جب اثناءِ راہ میں آپ کو یہ خبر ملتی ہے کہ آپ کے نمائندے مسلم اور ان کے میزبان ہانی بن عروہ کو بے دردی سے شہید کر دیا گیا، کوفہ پر عبید اللہ ابن زیاد جیسا سفاک شخص مسلط ہو چکا ہے، آپ کو دعوت دینے اور بلانے والے جیلوں میں ہیں یا روپوش ہیں۔۔۔۔۔ اپنے سفر کو جاری رکھنا خود کو خطرہ میں ڈالنے کے مترادف تھا۔ حالات میں یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ کوفہ میں آپ کا استقبال ہاروں اور پھولوں سے کیا جائے گا بلکہ اس کے برخلاف یہ امر یقینی ہے کہ اب آپ کا استقبال نیزوں، تلواروں، طوق و زنجیر اور قید و بند کے ذریعہ کیا جائے گا۔ ایسے حالات میں یہ کیسے ممکن ہے کہ امام خود کو اپنے عزیز و اقرباء کو اور اپنے ان تمام اصحاب کو پہلے سے آمادہ کئے بغیر اور اعتماد میں لئے بغیر ان خطرات میں جھونک دیں۔

چنانچہ اگرچہ پیغمبر اکرم کا انصارِ مدینہ سے پہلے سے معاہدہ تھا کہ وہ ہر حال میں پیغمبر کا ساتھ دیں گے لیکن اس کے باوجود جنگِ بدر کے موقع پر پیغمبر اکرم نے ان کو دوبارہ بلایا، ان سے پوچھا اور مشورہ کیا کہ اب کیا کرنا ہے؟ جب ان سب نے پیغمبر کو یقین دہانی کرائی کہ وہ آپ کے ہمراہ ہو کر مشرکین مکہ سے جنگ کریں گے تب آپ جنگ کے لئے مدینہ سے نکلے۔ پھر نواسہ رسول سے کیونکر یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے اصحاب کو بھیڑ بکریوں کی طرح (معاذ اللہ

(قربان گاہ کی طرف لے جائیں گے اور انہیں موت کے منہ میں دھکیل دیں گے۔ لہذا یہ ایک یقینی امر ہے کہ امام نے اپنے اصحاب کی ایک میٹنگ طلب کی ہوگی انہیں اعتماد میں لے کر حالات کی نزاکت اور سنگینی کو ان کے سامنے رکھا ہوگا ان سے سفر کو جاری رکھنے یا نہ رکھنے کے لئے مشورہ طلب کیا ہوگا اور اپنے قیام و انقلاب کے اگلے مرحلہ کے لئے لائحہ عمل طے کرنے کے لئے تعلیمیہ میں اپنے اصحاب کی ایک میٹنگ طلب کی ہوگی۔ اور قرین قیاس یہ ہے کہ اس میٹنگ کا ایجنڈا کچھ یوں ہوگا۔

ایجنڈے کے ممکنہ نکات

(۱)۔ کوفہ کے ان حالات کے تحت مکہ یا مدینہ واپس جائیں۔

(۲)۔ اگر مکہ یا مدینہ واپس نہ جائیں تو پناہ کی خاطر اسلامی مملکت کے کسی خطہ میں یا غیر مسلم مملکتوں میں سے کسی جگہ چلے جائیں۔۔۔۔۔ یا ایک عرصہ کے لئے پہاڑ کے کسی درے یا غار میں روپوش ہو جائیں۔

(۳)۔ یا۔۔۔۔۔ کوفہ کی طرف اپنے سفر کو جاری رکھیں۔

ہمارے پاس یقینی طور پر تو کوئی ثبوت نہیں ہے کہ اس موقع پر امام اور ان کے اصحاب کے درمیان کیا گفتگو ہوئی لیکن قرآن کی رو سے کہا جاسکتا ہے کہ موضوع بحث یہی نکات رہے ہوں گے۔ ہم چاہیں گے کہ مندرجہ بالا تینوں امکانات کا ایک سرسری جائزہ لیں اور دیکھیں کہ عقلی و منطقی لحاظ سے امام کا آئندہ اقدام کیا ہونا چاہئے۔

ان نکات پر تبصرہ

اگر کہا جائے کہ ان نازک اور سنگین حالات میں امام کو واپس مکہ یا مدینہ چلا جانا چاہئے تھا۔ بہ ظاہر یہ بات منطقی نظر آتی ہے۔ کہ حالات کا یہ رخ اختیار کر لینے کے بعد اب کوفہ جانا لا حاصل تھا۔ لہذا امام کو واپس مکہ یا مدینہ چلا جانا چاہئے۔ ویسے بھی ان حالات میں عام آدمی یہی

سوچتا ہے کہ مرنا ہی ہے تو اپنے گھر اور اپنے وطن میں جا کر موت کا سامنا کرے کہ کم از کم وہاں رونے اور گریہ کرنے والے تو ہوں گے۔ ہو سکتا ہے یہی سوچ کر بعض افراد نے امام کو یہ مشورہ دیا بھی ہو۔ لیکن یہ ایک عام آدمی کی سوچ تو ہو سکتی ہے، کسی عاقل کی نہیں۔ بالخصوص امام حسینؑ جیسی صاحب شخصیت ان بنیادوں پر نہیں سوچ سکتی۔ بھلا امام کیونکہ اس مدینہ کا رخ کر سکتے ہیں جہاں سے وہ رات کی تاریکی اور خوف و ہراس کے عالم میں آہستہ خوف کی تلاوت کرتے ہوئے ریاستی جبر و تشدد سے بچنے کے نکلے ہوں اور اب تو مدینہ کے حالات اور بھی بدتر ہو چکے ہیں۔ مدینہ کا گورنر ولید بن عتبہ اپنی تمام تر برائیوں کے باوجود ایک سنجیدہ انسان تھا لیکن اب تو وہ امام کے سلسلہ میں کابلی اور ساہل کا مظاہرہ کرنے کے الزام میں معز و ن ہو چکا ہے اور اس کی جگہ پر شتی مردان بن حکم کے خوابوں کی تعبیر عمر ابن سعید اشدق جیسا شتی ترین انسان مدینہ پر مسلط ہو چکا ہے۔

کیا امام مکہ واپس لوٹ جائیں؟ وہ مکہ کہ جس کو آپ اس لئے چھوڑنے پر مجبور ہوئے کہ عمر ابن سعید اشدق اپنی ہمراہ مسلخ افراد کے ساتھ اس عزم و ارادے سے وہاں پہنچ چکا تھا کہ آپ کو ایام حج ہی میں قتل کر دے یا گرفتار کر لے؟ مکہ میں نہ صرف یہ کہ آپ کی جان کو خطرہ بدستور موجود ہے بلکہ حرم خدا کی حرمت کا بھی اندیشہ ہے جو حسینؑ جیسا شخصیت کسی صورت میں گوارا نہیں کر سکتی تھی۔ پھر دشمن یہی تو چاہتا تھا کہ کسی طرح حسینؑ کو مکہ واپس لایا جائے تاکہ مکہ جب حاجیوں سے خالی ہو جائے تو انہیں قتل کر دیا جائے۔

جہاں تک اسلامی مملکت کے کسی اور خطے میں پناہ لینے کا تعلق ہے۔۔۔۔۔

تو اسلامی مملکت کا کیا کوئی خط ایسا تھا جو یزید کے علاوہ کسی اور کے تسلط میں ہو؟ یا اسلامی مملکت میں کوئی ایسی جگہ تھی جہاں سے بنی امیہ کی حکومت کے خلاف آواز اٹھی ہو یا امام کو قیام کرنے کی دعوت ملی ہو؟ اگر ایسے کوئی خطے تھے بھی تو قیام و انقلاب کے لئے ان کی نظریں بصرہ اور کوفہ پر لگی

ہوئیں تھیں۔ جب کوفہ ہی کی ناکہ بندی ہو جائے تو پھر کیوں کر ممکن ہے کہ دوسرے شہروں کے دروازے حسینؑ ابن علیؑ کے لئے کھلے ہوں جب کہ یزید کے خلاف امامؑ کے قیام و انقلاب کی اطلاع تمام گورنروں کو یقیناً پہنچ چکی تھی۔

کیا حسینؑ اپنے رفقاء، اصحاب اور اہل و عیال کے ساتھ کسی پہاڑ کے درے میں یا کسی قلعہ میں روپوش ہو جائیں؟ لیکن کب تک؟ کیا اس صورت میں ان کے لئے محاصرہ کا خطرہ نہیں؟ اب رہ گیا کسی غیر مسلم ملک میں پناہ لینے کا تعلق۔۔۔۔۔ تو کسی غیر مسلم ملک کے حکمرانوں پر کیسے بھروسہ کیا جاسکتا ہے جب کہ حکومتیں ایک دوسرے سے تعلقات قائم رکھنے اور افراد کی بجائے ایک دوسرے کی رضا و خوشی کو زیادہ ترجیح دیتی ہیں۔ پھر سیاسی سمجھوتے کے تحت ایک غیر مسلم حکومت کسی وقت بھی حسینؑ اور ان کے ساتھیوں کو بنی امیہ کے حوالے کر سکتی تھی۔ خصوصاً ان حالات میں کہ امام حسینؑ ایک تحریک کے پانی اور حامی تھے۔ ایک غیر مسلم حکومت کس طرح اس کی آزادی ان کو دے سکتی تھی؟

اب حسینؑ کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں کہ وہ کوفہ کی طرف اپنا سفر جاری رکھیں۔ کوفہ کی طرف اپنا سفر جاری رکھنے کا عقلی، منطقی اور سرعی جواز بھی ہے۔ چنانچہ سیاسی، اجتماعی اور مزہبی نقطہ نظر سے تجزیہ اور تحلیل کرنے والے بھی یہی کہتے ہیں کہ حسینؑ کو کوفہ کی طرف اپنا سفر جاری رکھنا چاہئے تھا۔ مند بھہ زیل حقائق امامؑ کے اس اقدام کی تائید کرتے ہیں۔

☆ کوفہ کی طرف امامؑ کا یہ سفر اہل کوفہ اور امامؑ کے درمیان متعدد معاہدوں، عہد و پیمان اور بہت سے نمائندوں کی آمد و رفت کے نتیجے میں وجود میں آیا۔ امامؑ نے ان سے حتمی وعدہ کیا کہ ان کے پاس پہنچیں گے۔ اس معاہدے اور عہد و پیمان کی رو سے امامؑ پر یہ واجب ہو گیا تھا کہ وہ اپنے وعدے کے مطابق ان کے پاس جائیں اور بتائیں کہ میں نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ ورنہ کوفہ والوں کو یہ حق پہنچتا تھا اور وہ یہ کہنے میں حق بجانب ہوتے کہ ”ہم تو اپنے وعدے پر قائم تھے، امامؑ

نے ہمیں موقع ہی نہیں دیا اور ہمیں موقع دیئے بغیر ہی وہ واپس چلے گئے۔“ چنانچہ بعض افراد نے جب امامؑ کو کوفہ نہ جانے اور واپس لوٹ جانے کا مشورہ دیا تو آپؑ نے فرمایا کہ:

”ہمارے دوران کے درمیان ایک معاہدہ ہے، مجھے بہر حال اس معاہدے کو پورا کرنا ہے۔“

اس کے علاوہ کربلا میں لشکرِ حر سے خطاب کرتے ہوئے امامؑ نے اسی معاہدے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ:

”میں اپنے وعدے کی ایفا کے لئے آیا ہوں، اب تمہاری باری ہے کہ تم اپنا وعدہ پورا کرو۔“

☆ کوفہ کی طرف امامؑ کا سفر صرف اس بنا پر نہیں ہے کہ وہاں سے آپؑ کو بارہ ہزار خطوط مل چکے ہیں اور متعدد نمائندے آپؑ کو قیادت سنبھالنے کی دعوت دے چکے ہیں بلکہ اس کے علاوہ آپؑ کے اور اہل کوفہ کی جید اور ممتاز شخصیتوں کے درمیان کئی سال تک معاہدے اور مذاکرات جاری ہو چکے تھے۔

☆ اس وقت کی جید اور برجستہ شخصیات قرآن، شواہد اور حالات کی بناء پر یہ بخوبی جانتی تھیں کہ اہل کوفہ کے دلوں میں بنی امیہ عبید اللہ ابن زیاد کے خلاف سخت نفرت پائی جاتی ہے۔

☆ اگر یہ کہا جائے کہ حضرت مسلم بن عقیلؑ امام حسینؑ علیہ السلام کی حمایت و نصرت میں اہل کوفہ کو جمع اور متحد کرنے میں خاطر خواہ نتائج حاصل کرنے میں ناکام رہے تب بھی یہ احتمال باقی ہے کہ امامؑ کی کوفہ میں موجودگی اور ان کی شخصیت لوگوں پر اثر انداز ہو اور امامؑ کو بہ نفس نفیس سامنے دیکھ کر لوگوں کو اپنی غلطی کا احساس ہو اور وہ مذمت اور پشیمانی کے ساتھ امامؑ کے لشکر میں شامل ہو جائیں۔ چنانچہ اس کی واضح دلیل یہ ہے کہ کربلا میں کچھ لوگ عمر سعد کے لشکر سے نکل کر امامؑ کے ساتھ ہو گئے۔

☆ ابھی تک کوفہ سے جو خبریں ملی تھیں وہ حضرت مسلم بن عقیلؑ اور ہانی بن عروہ کی شہادت کی خبریں تھیں۔ کوفہ میں حبیب ابن مظاہرؑ، مسلم بن عویجہؑ، سلیمان ابن صردؑ، زاعمیؑ جیسی شخصیات ابھی

موجود تھیں جن کی جانثاری اور وفاداری پر امامؑ کو مکمل اطمینان تھا۔ ان کے بارے میں خیانت اور کسی بدعہدی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ لہذا امید کی کرن ابھی باقی تھی لہذا اس بات کو اگر تسلیم کر بھی لیا جائے کہ عبید اللہ ابن زیاد کے کوفہ پر مسلط ہونے کے بعد کوفہ امامؑ کے خلاف متقلب ہو گیا تھا تب بھی یہ حقیقت اپنی جگہ موجود ہے کہ کوفہ میں کم از کم ایک گروہ ایسا ہے جو امامؑ کی نصرت سے کسی بھی حالت میں منہ نہ موڑے گا۔ چنانچہ تجربہ نے ثابت بھی کیا کہ کوفہ امامؑ ان تک نہیں پہنچ سکے ان لوگوں نے کسی نہ کسی طرح اپنے آپ کو امامؑ کی خدمت میں پہنچا اور آپؑ پر اپنی جان نثاری کی۔

اس کے برخلاف مدینہ یا مکہ واپس لوٹنے کی صورت میں کسی گروہ کے آپؑ کے ساتھ شامل ہونے کی کوئی امید نہیں تھی۔ اور آپؑ اس کا تجربہ بھی کر چکے تھے کہ ان لوگوں نے آپؑ کا ساتھ نہیں دیا اور آپؑ مظلومانہ عالم میں مدینہ سے بھی نکلے اور مکہ سے بھی..... لہذا اب اگر خطرات کی طرف بڑھنا ہی ہے تو عقل اور منطق کا تقاضا یہی ہے کہ انسان اس طرف قدم بڑھائے جہاں دفاع کی کوئی نہ کوئی امید ہو..... نہ کہ اس طرف جہاں سے انسان مایوس ہو چکا ہو۔

شقوق

یہ ایک جگہ کا نام ہے جو مکہ سے کوفہ جاتے ہوئے زبالہ سے پہلے آتا ہے۔ امام حسینؑ جب اس منزل پر پہنچے تو ایک شخص کو دیکھا جو کوفہ سے آ رہا تھا۔ آپؑ نے اس سے کوفہ کے حالات پوچھے تو اس نے بتایا کہ کوفہ کے لوگ آپؑ سے جنگ کرنے کے لئے متحد ہو چکے ہیں اور انہوں نے آپؑ سے جنگ کرنے کا تہیہ کر لیا ہے۔ اس پر آپؑ نے فرمایا کہ۔

”خدا ہر آن نئی شان میں ہے۔ ہر امر خدا کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جو چاہتا ہے وہی ہوتا ہے۔“

اس کے بعد آپؑ نے کچھ اشعار پڑھے جن کا مفہوم کچھ یوں ہے۔

”لوگوں کی نظر میں دنیا اگر اتنی ہی پرکشش اور قدر و قیمت کی حامل ہے تو آخرت اس سے کہیں

زیادہ ارزش و قیمت رکھتی ہے۔ وہ مال و دولت جو انسان جمع کرتا ہے آخر ایک دن اسے یہیں چھوڑ کر چلا جانا ہے۔ پھر ایسے مال و دولت کے لئے آدمی کیوں حرص کرے جسے چھوڑ کر ایک دن چلے جانا ہے۔ انسان کا رزق اگر پہلے ہی سے مقرر و مقدر ہو چکا ہے تو ایسے مال کے لئے حرص نہیں کرنا چاہئے۔ انسان کا جسم اگر فانی ہے اور اگر وہ مرنے ہی کے لئے پیدا ہوا ہے تو پھر کیوں نہ خدا کی راہ میں جان دے۔“

اگرچہ امامؑ کا قیام پہلے ہی روز سے عرفن و آگہی کین بنیادوں پر استوار تھا، لیکن اس منزل پر خصوصیت کے ساتھ اپنے عرفان عقیدتی اور عرفان عملی کی طرف آپؑ ایک واضح اشارہ فرماتے ہیں۔

عرفان عقیدتی

اس عراقی نے جب آپؑ کو اہل کوفہ کے عزائم اور آپؑ کے خلاف ان کے عزم و ارادہ سے آگاہ کیا تو ان کے مقابلہ میں امامؑ نے اپنے عزم و ارادے کا اظہار کرتے ہوئے اس عقیدتی عرفان کی طرف اشارہ فرمایا۔

”مرادان حق کا شیوہ یہ ہونا چاہئے کہ وہ اپنے اور پوری دنیا کے بارے میں مؤثر حقیقی خدا کو سمجھیں۔ دنیا کے ہر اسباب و علل، عزم و ارادے، جدوجہد اور سعی و کوشش کے پیچھے ایک اور ارادہ لایزال موجود ہے جس کے مقابلے میں نہ کوئی اسباب و علل کار فرما ہے اور نہ عزم و ارادہ۔ اس لئے انسان کو چاہئے کہ نہ وہ اپنے اسباب و علل پر بھروسہ کرے اور نہ اپنے عزم و ارادے پر تکیہ کرے اور نہ ہی حق کی راہ میں کسی سے خوف زدہ ہو کیونکہ جب مسبب حقیقی خدا ہے تو انسان کیوں نہ اپنے آپ کو خدا سے وابستہ کر لے؟“

لہذا بنی امیہ کو اگر اپنی جاہل و نادان اور حریص و لالچی رعایا پر بھروسہ ہے اور ان احمق و نادان لوگوں اور حریص و لالچی خواہان حکومت کو بنی امیہ کی حکومت پر اعتماد اور بھروسہ ہے تو پھر ”حسینؑ

“کیوں نہ اپنے مالکِ حقیقی پر بھروسہ کرے جو سب سے قوی اور عظیم ہے کہ جس کی مشیت کے سامنے ہر عزم و ارادہ بچ ہے اور جس کے سامنے کوئی طاقت نہیں ٹھہر سکتی؟ مردِ مومن کو چاہئے کہ وہ ہمیشہ خدائے لایزال کے فیصلہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دے۔

عرفانِ عملی

عملی عرفان کا آغاز دوسرے وابستگی ترک کرنے اور دنیا پر عدم اعتماد سے ہوتا ہے۔ یعنی انسان مال و دولت، نشان، شوکت، جاہ و جلال، کرسی و اقتدار پر تکیہ و بھروسہ نہ کرے۔ گو دنیا میں رہتے ہوئے دنیا سے وابستہ چھوڑنا آسان کام نہیں ہے چنانچہ جب امامؑ سے پوچھا گیا کہ دنیا میں رہتے ہوئے انسان کے لئے دنیا سے وابستگی ترک کرنا کیوں کر ممکن ہے تو آپؑ نے فرمایا کہ عقل و فکر کے نقطہ نظر سے اگر دیکھا جائے تو دنیا و مافیہا بذاتہ حقیر اور بے قیمت چیز ہے اور قابلِ بھروسہ نہیں۔ انسان کا دنیا پر تکیہ کرنا بھوسہ کو پہاڑ سمجھنے کے مترادف ہے۔ پھر بھی اگر مان لیا جائے کہ دنیا کوئی ارزش و قیمت رکھتی ہے تو دارِ آخرت اس دنیا سے کہیں زیادہ قدر و قیمت رکھتا ہے۔ اس لئے عقل کا تقاضا یہ ہے کہ اس دنیا کے مقابلے میں آخرت کا انتخاب کیا جائے جہاں ہمیشہ رہنا ہے اور جس کا اجر و ثواب اس دنیا کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ اگر انسان خدا کی رزاقیت پر یقین رکھتا ہے تو مالِ دنیا جمع کرنے کا حریص کیوں بنے؟ مالِ دنیا جمع کرنے میں اگر کوئی حسن ہے تو اسے راہِ خدا میں خرچ کرنا کہیں زیادہ احسن ہے۔ اسی طرح مالِ زندگی اگر یہ ہے کہ انسان کو ایک دن اس دنیا کو بہر حال چھوڑ کر جانا ہے تو پھر شہادت کی راہ اختیار کر کے کیوں نہ خدا کی راہ میں جان دے۔

زبالہ

زبالہ وہ جگہ ہے جو مکہ سے کوفہ جاتے ہوئے شقوق کے بعد آتی ہے، یہ واقعہ اور ثعلبیہ کے درمیان ہے یہاں ایک قلعہ ہے اور بنی غاضرہ کی ایک مسجد بھی ہے۔ اس جگہ کو زبالہ کہنے کی دو وجہ بیان کی

جاتیں ہیں۔۔۔۔ ایک یہ کہ زبالہ بنتِ مسعود یا زبالہ بنتِ معاصر نے جو قبیلہ زبالغہ سے تھی۔ یہاں سکونت اختیار کی اور اس کے نام پر اس جگہ کا نام زبالہ پڑا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ”زبل“ دراصل مشک میں پانی جمع کرنے کو کہتے ہیں، یہاں چونکہ بارش کا پانی جمع ہوتا ہے اس لحاظ سے اسے زبالہ کہتے ہیں۔ جس طرح اس جگہ کا نام زبالہ ہے اسی طرح عربوں کے یہاں ایک دن بھی ہے جو یومِ زبالہ کے نام سے معروف ہے۔

امام حسینؑ جب منزلِ زبالہ پر پہنچے اور آپؑ کو حضرت مسلم بن عقیلؑ، ہانی بن عروہ اور قیس بن مسہر صیداوی کی شہادت کی خبر ملی تو آپؑ نے جیسا کہ بعض مقاتل میں ہے خود یا اپنے کچھ اصحاب کے توسط سے ایک اعلان کیا کہ۔

”ہمیں ایک بری خبر ملی ہے کہ مسلم بن عقیلؑ، ہانی بن عروہ اور ہمارے کچھ اصحاب با وفا شہید ہو چکے ہیں اور ہمارے شیعوں نے ہمارے ساتھ بے وفائی کی ہے اور ہمیں تنہا چھوڑا ہے۔ ان حالات کے تحت تم لوگوں میں سے اگر کوئی واپس جانا چاہے تو وہ ہمیں سے واپس چلا جائے۔“

مقاتل میں لکھا ہے کہ مکہ سے نکلنے کے بعد جو لوگ آپؑ کے ساتھ یہاں تک آئے تھے وہ سب آپؑ کو چھوڑ کر چلے گئے۔

منزلِ زبالہ کے علاوہ امام حسینؑ نے اسی طرح دوسرا اعلان کر بلا میں شبِ عاشور فرمایا تھا اور اپنے اصحاب کو واپس چلے جانے کی اجازت دی تھی۔ لیکن شبِ عاشور آپؑ کی کھلی اجازت کے باوجود کوئی بھی آپؑ سے جدا نہیں ہوا بلکہ آپؑ پر اپنی جان نثار کرنے کے عزم و ارادے کا اظہار کیا اگرچہ بعض مقاتل منزلِ زبالہ سے امامؑ کا ساتھ چھوڑ کر لوگوں کے چلے جانے کے واقعے کو شبِ عاشور سے مخلوط کر کے یہ اشتباہ کرتے ہیں کہ کچھ لوگ شبِ عاشور امامؑ کو چھوڑ کر چلے گئے۔

بہر حال امام حسینؑ علیہ السلام کا ایک مرتبہ منزلِ زبالہ پر اور دوسری مرتبہ کر بلا میں شبِ

عاشورا اپنے اصحاب کو واپس چلے جانے کی اجازت دینا ایسے اقدامات ہیں جو غور طلب اور تشریح طلب ہیں۔

مرحلہ تاسیس اور مرحلہ تصحیح و تطہیر

ہر قیام و انقلاب دو مرحلوں کے درمیان اپنا سفر طے کرتا ہے۔ ایک مرحلہ تاسیس اور دوسرا مرحلہ تصحیح و تطہیر۔

(۱)۔ مرحلہ تاسیس

کسی بھی قیام و انقلاب کے لئے پہلا مرحلہ اس قیام و نصیحت کے لئے لوگوں کو دعوت دینا ہے۔ یہ دعوت عمومی ہوتی ہے جو بھی اسے قبول کرے۔ چنانچہ پیغمبر اکرمؐ جب انقلاب کا پیغام لے کر اٹھے تو انہوں نے اپنے انقلاب کی خصوصیات بیان کر کے سب کو ایک عام دعوت دی۔ جس نے بھی اس دعوت پر لبیک کہا اور اس کو قبول کیا اس کو آپؐ نے اپنے کیمپ میں شامل کیا۔ کسی کو بھی رو نہیں کیا چاہے اس نے آپؐ کی پوری کی پوری دعوت کو قبول کیا ہو یا جزوی طور پر قبول کیا ہو۔ یہاں تک کہ منافقین کو بھی اپنے کیمپ اور اسلام کے دائرے میں شامل کر لیا۔ حتیٰ عبد اللہ بن ابیہ جیسے منافق بھی اپنی پوری منافقت کے ساتھ پیغمبر اکرمؐ کی دعوت میں شامل ہو گئے۔ چنانچہ قرآن ایسے منافقین کی نشاندہی کرتے ہوئے کہتا ہے کہ۔

”وَمَنْ حَوْلَكُمْ مِنَ الْأَعْرَابِ مُنَافِقُونَ وَمَنْ أَهْلُ الْمَدِينَةِ مُرَدُّوهُمُ الْعَلِيِّ النِّفَاقِ لَا تَعْلَمُهُمْ وَنَحْنُ نَعْلَمُهُمْ“ اور تمہارے گرد و بہاؤوں میں بھی منافقین ہیں اور اہل مدینہ میں تو وہ بھی ہیں جو نفاق میں ماہر اور سرکش ہیں تم ان کو نہیں جانتے لیکن ہم خوب جانتے ہیں۔“ (سورہ توبہ۔ آیت ۱۰۱)

ایسے لوگوں کو نہ صرف یہ کہ آپؐ نے قبول کر لیا بلکہ انہیں مقام و منصب بھی دیا اور ان کے اس جزوی ایمان سے استفادہ بھی کیا۔ اگر ان کو آپؐ اپنی دعوت میں اس ابتدائی مرحلہ پر شامل نہ

کرتے تو یہ دعوت چند افراد تک محدود رہتی اور آخر کار منجمد ہو کر ختم ہو جاتی۔ اس لئے کسی قیام و انقلاب کی تاسیس کے وقت ابتدائی مرحلہ میں دعوت کو قبول کرنے والے ہر شخص کے لئے دروازے کھلے رکھنا ناگزیر ہے۔

(۲)۔ مرحلہ تصحیح و تطہیر

دوسرا مرحلہ وہ ہے کہ جب اپنے قیام و انقلاب کو منظم، متحرک اور مضبوط بنانے اور مضمر اثرات اور ناپسندیدہ عناصر سے محفوظ رکھنے کے لئے تصحیح اور تطہیر کا عمل کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ ائمہ اطہارؑ کا دور قیام و انقلاب میں شریک افراد میں سے ان چہروں کو سامنے لانے کا ہے جو اس قیام و انقلاب کو درک کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور نہ صرف درک کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں بلکہ استقامت بھی رکھتے ہیں۔ اس کے برعکس اپنے قیام و انقلاب کو ایسے تمام عناصر سے پاک کرنا بھی نہایت ضروری ہے کہ جو اس قیام کو نقصان اور ضرر پہنچانے کا سبب بنیں۔ پہلا مرحلہ نسبتاً آسان ہے۔ دعوت کے پیغام میں اگر جاذبیت ہے تو لوگ جوق در جوق دعوت میں شریک ہوتے ہیں۔ ”یدخلون فی دین اللہ انواجا“، لیکن دوسرا مرحلہ یعنی باصلاحیت باکردار، مستقل مزاج اور پیغام کی روح کو درک کرنے والوں کو چھانٹ کر سامنے لانا دشوار مرحلہ ہے، لیکن ناگزیر ہے کیونکہ کسی تحریک کا دار و مدار اسی پر ہے۔ ستیفہ بنی ساعدہ میں امت جس انحراف کا شکار ہوئی اس کی وجہ یہ تھی کہ لوگ پیغام کی روح کو درک نہیں کر سکے تھے۔ امیر المؤمنین علیؑ اور جناب زہراءؑ نے امت کے لئے اس خطرے کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ پیغمبر اکرمؐ کی وفات کے بعد جناب زہراءؑ مرضیہ کو اسی بات کا قلق تھا جس کے نتائج اور عواقب سے وہ ہر موقع پر امت کو آگاہ کرتی رہیں۔

خلفائے راشدین کا دور تو عہد پیغمبرؐ سے قریب اور متصل ہونے کی وجہ سے پھر غنیمت تھا، لیکن ایک وقت گزرنے کے بعد حضرت علیؑ کو ظلم و زبیر اور مردان سے مقابلہ کرنے میں اسی وجہ سے دشواری

پیش آئی کہ لوگوں میں حق کو درک کرنے کی صلاحیت کا فقدان تھا۔ صفین میں معاویہ کے ساتھ جنگ میں علیؑ کو اسی دشواری کا سامنا تھا۔ یہاں تک کہ پیغمبر اکرمؐ کے جید اصحاب اور علیؑ کے قریبی اصحاب بھی آپؑ کے لشکر میں ہوتے ہوئے معاویہ کے خلاف جنگ کرنے کے مسئلہ پر شش و پنج میں مبتلا تھے اور اس کے خلاف اپنی تلواروں کو نیام سے نکالتے ہوئے بیچکچا رہے تھے۔

لہذا ایسے افراد کو کہ جو حق و باطل میں تمیز کرنے کا شعور نہ رکھتے ہوں کسی قیام و انقلاب اور کسی تحریک میں ساتھ نہیں لیا جاسکتا چاہے وہ کسی بھی مقام و منصب پر فائز ہوں۔ چنانچہ جب حضرت علیؑ کو غیرہ ابن شعبہ اور دوسرے افراد نے معاویہ اور عمر عاص جیسے لوگوں کو ساتھ لے کر چلنے کا مشورہ دیا تو آپؑ نے صاف انکار کر دیا۔ اس کا ذکر نوح البلاغہ کے خطبہ نمبر ۱۶ میں ہے۔ حالانکہ آپؑ کو اس انکار کی بہت بڑی قیمت ادا کرنا پڑی۔ پیغمبر اکرمؐ نے علیؑ کی تربیت کرتے ہوئے پہلے ہی ان کو یہ بتا دیا تھا کہ میرا دور دوریتا نہیں اور تمہارا دور دوری صبح اور دورِ ظہیر ہوگا۔ چنانچہ آپؑ نے فرمایا۔

”یا علیؑ! میرا قیام تنزیل کے لئے ہے جب کہ تمہیں تاویل کے لئے قیام کرنا پڑے گا۔“

امام حسین علیہ السلام کو بھی اپنے قیام و انقلاب میں انہی دشواریوں کا سامنا تھا۔ عوام تو ایک طرف اس وقت کے علماء اور دانشوروں کو بھی بیزید کے تمام انحرافات اور جرائم کے باوجود اس کے حنیفہ مسلمین اور امیر المؤمنین کے منصب پر قابض ہونے پر انہیں کوئی اشکال نظر نہیں آتا تھا اور اس کے خلاف کسی قیام و انقلاب کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے۔ چنانچہ آپؑ نے اپنے مقدس قیام میں جہاں ایک طرف اپنی آواز اور اپنی دعوت دور دور تک ہر جگہ پہنچانے کی کوشش کی وہاں دوسری طرف اپنی آواز اور اپنی دعوت دور دور تک ہر جگہ پہنچانے کی کوشش کی وہاں دوسری طرف اپنی تحریک کو ہر قسم کے انحراف سے بچانے کے لئے ہر موقع پر صبح و ظہیر کا اہتمام بھی کیا۔ اس لئے آپؑ کو ایسے افراد کی ضرورت تھی جو اسلامی اور مسلمین کو اس وقت درپیش مسائل

کو اچھی طرح درک کر سکتے ہوں قیادت کی صحیح شناخت اور معرفت رکھتے ہوں اور قائد کی تحریک پر جان کے نذرانے کو حقیر سمجھتے ہوں۔ ایسے افراد جب اور جہاں آپؑ کو مل جاتے تھے آپؑ ان کو ابدی سعادت کی بشارت دیتے اور ان کے درجات کی بلندی کے لئے دعا فرماتے تھے جب کہ ان صفات اور شعور سے عاری اور خالی افراد کو اپنے حلقہ اور بزم سے پاک رکھتے تھے تاکہ آپؑ کی تحریک اور آپؑ کا قیام کسی انحراف اور ناکامی کا شکار نہ ہو۔

دینی تحریکوں اور تنظیموں کے لئے درس

امام حسین علیہ السلام کا لوگوں پر حقائق واضح کرنے کے بعد واپس جانے کی کھلی اجازت دینا آج کی اور آئندہ آنے والی دینی تحریکوں اور تنظیموں کے لئے ایک درس ہے جس کو ہم اپنی عملی زندگی میں نظر انداز کئے ہوئے ہیں۔ اسلامی تحریکوں میں لوگوں کی شمولیت کی بنیاد اور معیار ”کمیت“ اور ”کیفیت“ دونوں کو ہونا چاہئے۔ یعنی نہ تنہا کمیت ”ملاحظہ خاطر رہے اور نہ صرف ”کیفیت“۔ بلکہ کسی تحریک کی کامیابی کے لئے کمیت اور کیفیت دونوں پر نظر رکھنا چاہئے اور دونوں میں ایک تناسب رکھنا ضروری ہے۔

چنانچہ امام علیہ السلام اپنی افرادی قوت کو بڑھانے کے لئے اپنی تحریک کے آغاز سے لے کر اپنی شہادت تک ہر موقع اور ہر منزل پر لوگوں کو اپنی تحریک کی طرف دعوت دیتے رہے اور اس کے ساتھ ساتھ آپؑ نے ہر اس شخص کو جو امامؑ کے مشن اور پیغام سے ذہنی موافقت اور آمادگی نہیں رکھتا اس کو رخصت کرنے میں کبھی بیچکچاہٹ محسوس نہیں کی بلکہ ہر موقع پر لوگوں کو حقائق اور اپنے ہدف اور مقصد سے آگاہ کر کے انہیں مکمل آزادی دی کہ وہ جو راہ چاہیں اختیار کریں۔

لوگوں کا کثیر تعداد میں آپؑ کے ساتھ شامل ہونا اور رفتہ رفتہ امامؑ سے کٹتے جانا اس بات کی دلیل ہے کہ بہت سے لوگ اس وہم و گمان کے ساتھ آپؑ کے ساتھ شامل ہوئے تھے کہ امامؑ کو فہم میں اقتدار سنبھالیں گے اور ان کو بھی مقام و منصب ملے گا۔ لیکن جب لوگوں نے آپؑ سے اہل

کوفہ کی بے وفائی کی خبر سنی اور امام نے ان پر اس حقیقت کو واضح کر کے واپس چلے جانے کی اجازت دی کہ اب مقام و منصب کی کوئی امید نہ رکھے تو لوگ دائیں بائیں منتشر ہونے لگے۔

بطین عقبہ

منزل زبالہ کے بعد امام نے بطین عقبہ پر قیام فرمایا۔ یہاں آپ نے اپنے اصحاب سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ۔

”میں نے خواب میں دیکھا کہ کچھ کتے مجھ پر حملہ کر رہے ہیں ان کتوں میں سے ایک کتا جو مجھ پر بڑھ چڑھ کر حملہ کر رہا ہے وہ برص میں مبتلا ہے۔“

آپ نے اپنے اس خواب کی تعبیر کرتے ہوئے بتایا کہ۔

”میں دیکھ رہا ہوں کہ میں شہید ہو جاؤں گا یہ لوگ مجھے قتل کر کے دم لیں گے۔“

عمر ابن لوزان بن عکرمہ مدینہ جاتے ہوئے بطین عقبہ پر امام حسین علیہ السلام سے ملا اور اہل کوفہ کے مزاج و طبیعت سے امام کو آگاہ کرتے ہوئے بتایا کہ بے وفائی ان کی فطرت میں شامل ہے۔ اس نے امام سے اس سفر کو ترک کرنے کی درخواست کی۔ امام نے اس کو جواب دیا کہ جو بات تم مجھے بتا رہے ہو میں اس سے خوب آگاہ ہوں یہ باتیں مجھ سے پوشیدہ نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ خدا کی مشیت پوری ہو کر رہتی ہے اسے کوئی نہیں روک سکتا۔

اسی مقام پر جعفر ابن سلیمان زبالی سے امام نے فرمایا کہ یہ لوگ (بنی امیہ) جب تک میرا خون نہ بہالیں مجھے نہیں چھوڑیں گے، لیکن مجھے قتل کرنے کے بعد لوگوں کو چین نصیب نہیں ہوگا خداوند عالم ایسے شخص کو ان پر مسلط کرے گا جو انہیں ذلیل و خوار کرے گا۔ ان کی ذلت و پستی اس حد تک پہنچے گی کہ ان کی حیثیت ایامِ حوض میں استعمال ہونے والے حرقہ سے بھی بدتر ہوگی۔

چند چیزیں جو واضح ہو کر یہاں سامنے آتی ہیں وہ یہ ہیں۔

☆ امام نے کسی کو دھوکے میں نہیں رکھا

امام ہر منزل اور ہر مقام پر اپنے اس سفر میں پیش آنے والے خطرات سے لوگوں کو آگاہ کرتے رہے۔ لوگوں کو ان خطرات سے بھی آگاہ کیا جن کا سامنا کرنا یقینی تھا اور ان خطرات سے بھی جن کا کسی نہ کسی صورت میں احتمال تھا تا کہ کل کوئی شخص یہ نہ کہہ سکے کہ حسین نے ہمیں اندھیرے میں رکھا۔ بلکہ جو بھی آپ کا ساتھ دینا چاہے وہ ایک آگہی کے ساتھ شریک سفر ہو۔

☆ امام کا سفر سفر آگہی تھا

اس سفر میں بہت سے لوگ خلوص و محبت کے اظہار کے طور پر امام کو آنے والے خطرات سے آگاہ کرتے تھے جب کہ بہت سے لوگ اپنے تجربے اور مردِ شناسی کی بناء پر آپ کو خطرات سے آگاہ کرتے تھے اور اہل کوفہ کی ذہنیت ان کے مکر و فریب اور بے وفائی کی طرف اشارہ کر کے امام کو اس سفر کے انجام سے ڈراتے تھے۔ امام علیہ السلام نہ صرف اپنے علمِ امامت بلکہ اپنے عرفان و بصیرت، تجربے اور معاشرہ شناسی کی بناء پر ان تمام خطرات سے پوری طرح آگاہ تھے۔ چنانچہ لوگ جب آپ کو خطرات سے ڈراتے تو آپ ان کو جواب دیتے کہ یہ باتیں ہم سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔ یعنی میرا سفر بے ساختہ یا کسی غفلت اور فریب کے نتیجے میں بلکہ میرا سفر عرفان و آگہی کا سفر ہے۔

☆ امام نے لوگوں کو ان کے انجام سے آگاہ کر دیا تھا

امام جہاں لوگوں کو اپنے اس سفر میں پیش آنے والے خطرات سے ہر موقع اور ہر منزل پر آگاہ کرتے رہے وہاں اپنی جان بچانے والے لوگوں کو بھی (خواہ وہ اہل کوفہ ہوں یا دوسرے) ان کے انجام سے آگاہ کرتے رہے کہ میرے بعد تم بچ نہیں سکو گے۔

بطین عقبہ کے بعد امام حسین علیہ السلام نے منزل شراف پر قیام فرمایا۔ شراف (بروزن فعال) واقعہ اور قرعہ کے درمیان ہے۔ شراف سے واقعہ کا فاصلہ دو میل ہے۔ شراف اور واقعہ دو مرد تھے جو عمر بن معقل بن زمرہ بن عقیل بن عوص بن ارم بن سام بن نوح کے فرزند تھے۔ یہ

دونوں اس جگہ قیام پذیر تھے۔ معجم بلدان میں کلبی نے کہا ہے کہ ان دونوں کے نام پر یہ جگہ شراف اور واقعہ کے نام سے منسوب ہے۔ شراف اور واقعہ کے درمیان تین بڑے کنویں تھے جن کا پانی بہت شیریں تھا۔ ان کنوؤں کو سبلی عمالیق میں سے شراف نے کھودا تھا۔

امام حسین علیہ السلام اس جگہ صبح کے قریب پہنچے۔ امام نے یہاں پر اپنے اصحاب کو حکم دیا کہ جتنا ہو سکے یہاں سے پانی لے کر ذخیرہ کر لیں۔ یہاں سے کوٹ کرنے کے بعد ظہر کے قریب امام نے کوفہ کی طرف سے آتے ہوئے ایک بڑے لشکر کو دیکھا۔ لشکر کو دیکھ کر آپ نے اپنے بائیں جانب ذوجم نامی پہاڑ کے دامن میں پناہ لی۔ آپ نے دیکھ کر حرکی قیادت میں ایک ہزار کا لشکر عبید اللہ ابن زیاد کے حکم پر اس غرض سے بھیجا گیا ہے کہ وہ نہ آپ کو کوفہ کی طرف بڑھنے دے اور نہ مدینہ واپس جانے دے۔ یہ لشکر جب امام حسین کے مقابل پہنچا تو آپ نے دیکھا کہ پورا لشکر پیاس کی شدت سے بے حال ہے۔ امام نے اپنے اصحاب کو حکم دیا کہ حر کے تمام لشکر کو اور ان کی سوار یوں کے جانوروں کو پانی سے سیراب کیا جائے۔ اس لشکر میں علی ابن طعان محاربی نامی ایک ایسا شخص بھی تھا جس کا پیاس کی شدت سے برا حال تھا یہاں تک کہ اس میں مشکیزہ کے دہانے کو پکڑنے اور خود سے پانی پینے کی بھی تاب نہ تھی۔ یہ دیکھ کر امام خود آگے بڑھے اور اپنے ہاتھ سے اسے پانی پلایا۔

اس کے بعد حر نے امام سے یہاں آنے کی وجہ پوچھی اور پوچھا کہ آپ کہاں تشریف لے جا رہے ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ یہاں اپنی طرف سے خود نہیں آیا ہوں بلکہ تم لوگوں کی طرف سے مجھے خطوط ملے اور تمہارے نمائندوں نے آ کر مجھے کوفہ آنے کی نہ صرف دعوت دی بلکہ اصرار کیا کہ میں اپنی مسئولیت کو پورا کروں۔ چنانچہ میں اسی دعوت پر یہاں آیا ہوں۔ اب اگر تم لوگ اپنی دعوت پر قائم ہو تو میں نے اپنا عہد ایفا کر دیا ہے اور اگر تم لوگ میرے آنے سے ناخوش ہو اور اپنے عہد سے پھر گئے ہو تو میں یہیں سے واپس چلا جاتا ہوں۔

اس گفتگو کے دوران نماز کا وقت ہو گیا تو امام نے ہجاج بن مسروق جعفی کو ظہر کی اذان دینے کا حکم دیا اور حر سے فرمایا کہ میں اپنے اصحاب کے ساتھ نماز پڑھتا ہوں تم اپنے لشکر کے ساتھ نماز پڑھو۔ حر نے جواب دیا کہ ہم علیحدہ نہیں بلکہ آپ کی اقتداء میں نماز پڑھیں گے۔

بیضا

یہ مقام واقعہ اور عذیب الجحانات کے درمیان واقع ہے۔ یہ ایک وسیع میدان ہے۔ جو بنی یربوع بن حنظلہ کی ملکیت ہے۔ یہاں امام حسین علیہ السلام نے حر سے خطاب فرمایا۔ یہاں سے آگے ایک جگہ ہے جس کا نام ”رہیمیہ“ ہے۔ یہاں ابوہرم نامی شخص جو کوفہ سے آ رہا تھا امام سے ملا اور ان سے پوچھا کہ ”کس امر نے آپ کو اپنے جد کے حرم سے نکلنے پر مجبور کیا؟“ آپ نے جواب دیا کہ۔

”اے ابوہرم! بنی امیہ نے میرے خاندان کو سب و شتم کیا (غالبنا مراد امیر المومنین علی علیہ السلام پر منبروں سے سب و شتم کئے جانے سے ہے) میں نے صبر کیا انہوں نے میرا مال چھینا (مراد غالباً فدک سے ہے) اس پر بھی میں نے صبر کیا اب یہ لوگ میری جان کے درپے ہیں اور میرا خون بہانا چاہتے ہیں اس لئے میں مدینہ چھوڑنے پر مجبور ہوا۔ خدا کی قسم یہ لوگ مجھے قتل کر کے دم لیں گے اور جب ی ہ مجھے قتل کر دیں گے تو (دیکھنا کہ) ان پر ایسا شخص مسلط ہوگا جو انہیں ذلیل کر دے گا یہاں تک کہ یہ لوگ اس قوم سب سے زیادہ ذلیل ہوں گے جس پر ایک عورت حکومت کرتی تھی۔“

رہیمیہ

رہیمیہ، رہم کا اسم تصغیر ہے۔ یہ ایک جگہ ہے جو کوفہ سے ایک منزل پہلے ہے۔ کوفہ سے شام جاتے ہوئے یہیں سے گزرتے ہیں۔ رہیمیہ کے بعد قصر بنی مقاتل آتا ہے۔

امام حسینؑ رہیمیہ کے بعد قصر بنی مقاتل پہنچے۔ امام جب رہیمیہ پہنچے تو ابوہرم نامی ایک شخص

یہاں آپ سے ملا اس نے آپ سے پوچھا کہ۔

”فرزند رسول! کس چیز نے آپ کو آپ کے جد کے حرم سے جدا ہونے پر مجبور کیا۔“

امام نے جواب دیا۔

”بنی امیہ نے میرے ناموس کو سب و شتم کیا۔ میں نے صبر کیا، میرے مال کو لوٹا میں نے صبر کیا، اب یہ میرا خون بہانے پر تلے ہیں تو میں نکلا ہوں۔ خدا کی قسم! اگر انہوں نے مجھے قتل کیا تو میرے بعد خدا و بند عالم ان کے سروں پر ایسی تلوار مسلط کرے گا جو انہیں قتل کرتی رہے گی، خدا ان پر ایسے شخص کو مسلط کرے گا جو ان کو ذلیل و خوار کرے گا اور یہ لوگ اس قوم سب سے بھی زیادہ ذلیل و خوار ہوں گے جس پر ایک عورت حکومت کرتی تھی۔“

قطقطا نہ یا قطقطہ

بارش کے چھوٹے قطرات اور کنویں سے نکالے جانے والے پانی سے جو قطرات ابھرتے ہیں انہیں قطقطا نہ یا قطقطہ کہتے ہیں۔

یہ اس مقام کا نام ہے جو کوفہ اور کربلا کے درمیان واقع ہے اور کوفہ سے نزدیک تر ہے۔ یہاں نعمان بن منذر کا قید خانہ ہے۔ رزمیہ کے بیان میں قطقطا نہ کا ذکر آتا ہے اور رزمیہ وہ جگہ ہے جہاں سے امام حسین علیہ السلام گزرے تھے۔ رزمیہ اور قطقطا نہ کے درمیان بیس میل کا فاصلہ ہے۔

قادیسیہ

قادیسیہ وہ مقام ہے جو کوفہ سے پندرہ فرسخ کے فاصلے پر ہے۔ قادیسیہ اور ”عذیب الجنات“ کے درمیان چار میل کا فاصلہ ہے۔ جیسا کہ ابو عمرو نے کہا ہے ”قادیسیہ“ لفظ ”قادیسیہ“ سے لیا ہے جس کے معنی ہیں بڑی کشتی۔ ”قادیسیہ“ کا پہلے ”قدیس“ کہا جاتا تھا جو لفظ ”قدس“ سے لیا گیا۔

اس جگہ کو قادیسیہ کہنے کی ایک وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ اس جگہ پر مسلمانوں اور فارس کے

لشکروں کے درمیان چار روز تک سخت جنگ ہوئی۔ ان چار دنوں میں سے ہر دن کا ایک نام رکھا گیا۔ ان میں سے ایک دن کا نام ”قادیسیہ“ رکھا گیا اور یہ وہ دن تھا جس دن مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی۔ چنانچہ اس دن کا نام ”یوم القادیسیہ“ رکھا گیا اور اس لحاظ سے اس جگہ کا نام ”قادیسیہ“ پڑا۔ قادیسیہ کی جنگ ۷ ہجری میں خلافتِ دوم میں سعد بن ابی وقاص کی قیادت میں لڑی گئی اور اس میں مسلمان فتحیات ہوئے۔

قیام امام حسینؑ کے سلسلہ میں قادیسیہ کا نام دو حوالوں سے آتا ہے۔ ایک یہ کہ حضرت مسلم بن عقیل کی شہادت کے بعد عبید اللہ بن زیاد نے حسین بن نمیر کی قیادت میں ایک لشکر اس مقام پر متعین کیا تا کہ وہ کوفہ میں داخل ہونے والوں اور کوفہ سے نکل کر جانے والوں کی نگرانی کرے۔ ادھر امام حسین علیہ السلام جب منزلِ ثعلیہ پر پہنچے تو آپ نے کوفہ کے شیعوں کے نام عبداللہ بن یقطر یا قیس ابن مسہر صیداوی کے ہاتھ ایک خط یا دونوں کے ہاتھ لگا لگا دو خط لکھ کر کوفہ روانہ کئے۔ امام کے ان دونوں قاصدوں کو حسین بن نمیر نے قادیسیہ کے مقام پر گرفتار کیا اور انہیں عبید اللہ بن زیاد کے سامنے پیش کیا۔

ذو جسم

امام حسینؑ صبح کے اول وقت میں منزلِ شراف سے نکلے اور دن کو دوپہر کے وقت جب ذو جسم پہنچے تو آپ نے ایک لشکر کی بڑی تعداد کو آتے ہوئے دیکھا۔ اس لشکر کو دیکھ کر امام نے اپنے اصحاب سے پوچھا کہ یہاں کوئی ایسی پناہ گاہ ہے جہاں دشمن ہم پر پیچھے سے حملہ نہ کر سکے اور ہم سامنے سے دشمن کا حملہ روک سکیں تو اصحاب نے جواب دیا کہ یہاں نزدیک میں ذو جسم نامی ایک پہاڑ ہے جو ہمارے لئے ایسی پناہ گاہ ثابت ہو سکتا ہے اس پر امام نے اپنی حرکت کا رخ بائیں طرف کر دیا۔ حرکی قیادت میں آنے والے لشکر نے بھی اپنا رخ اسی سمت موڑ دیا لیکن ”ذو جسم“ پہاڑ تک پہلے پہنچنے میں امام کامیاب ہو گئے۔ حرا اپنے لشکر کے ساتھ جب وہاں پہنچا تو امام نے

اس سے پوچھا: تم یہاں کیوں آئے ہو؟

حرنے جواب دیا: میں آپ کو گرفتار کر کے کوفہ لے جانے پر مامور ہوا ہوں۔

امام حسینؑ اور حر کے درمیان اس گفتگو کی دوران نماز کا وقت ہو گیا۔ امام حسینؑ کی اقتداء میں نماز جماعت ہوئی۔ نماز کے بعد امامؑ نے خطبہ دیا اور اس کے بعد آپ نے اپنے کاروان کو سفر جاری رکھنے کا حکم دیا لیکن حرنے نے آپ کا راستہ روکا۔ آپ نے حرسے فرمایا:

”تمہاری ماں تمہارے غم میں بیٹھے تم آخر چاہتے کیا ہو؟“

حرنے جواب دیا: آپ کے علاوہ کوئی اور اگر میری ماں کا نام لیتا تو میں جواب دیتا لیکن آپ کی ماں کا نام میں بغیر ادب نہیں لے سکتا۔ میں بہر حال اس بات پر مامور ہوا ہوں کہ آپ کو گرفتار کر کے لے جاؤں، البتہ مجھے آپ سے جنگ کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

امامؑ نے فرمایا: ”میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا۔“

اس پر حرنے نے کہا: ”پھر آپ قادیسیہ اور عذیب الجھنات کے درمیان کوئی ایسا راستہ اختیار کریں کہ نہ آپ حجاز جا سکیں اور نہ ہی میں آپ کو کوفہ لے جاؤں۔“

امامؑ نے اس تجویز سے اتفاق کیا اور ذوسم سے اپنے کاروان کا رخ بائیں جانب موڑ دیا۔ یہ راستہ قصر بن مقاتل سے ہوئے نینوا تک پہنچتا ہے۔

حرسے اس گفتگو کے بعد امام حسینؑ ذوسم سے نکلے اور عذیب الجھنات پہنچے۔ اس اثناء میں حر آپ کے ساتھ ساتھ رہا۔

عذیب الجھنات

عذیب عذب کی تصغیر ہے اور عذب خوشگوار پانی کو کہتے ہیں۔ یہاں ایک نہر ہے جو قادیسیہ اور مغیشہ کے درمیان ہے۔ یہاں سے قادیسیہ چار میل اور مغیشہ بیس میل کے فاصلہ پر ہے۔ یہ جگہ اہل فارس کے محاذ میں شمار ہوتی تھی۔ کوفہ کے حاجی یہاں قیام کرتے تھے۔ یہ جگہ بنی تمیم کے

تصرف میں تھی۔

یہ وہ جگہ ہے جہاں ہلال بن نافع، مجمع بن عبد اللہ مزجی، اس کا غلام عمر ابن خالد صدیادی اور طرماح وغیرہ کوفہ سے آ کر امام حسینؑ کے ساتھ شامل ہوئے۔ یہ لوگ کوفہ سے امامؑ کے لشکر میں شامل ہونے کے لئے امامؑ کی طرف آ رہے تھے کہ حرنے نے ان کا راستہ روکا۔ امامؑ نے حرسے فرمایا کہ ”یہ میرے انصار و جانثار ہیں اور میرے لشکر میں شامل ہیں۔ اگر تم نے ان کا راستہ روکا تو میں مزاحمت کروں گا۔“ اس پر حرنے نے ان لوگوں کو امامؑ کی خدمت میں جانے کا راستہ دے دیا اور یہ لوگ آپ کے ساتھ شامل ہو گئے۔ امامؑ نے ان سے کوفہ کے حالات معلوم کئے تو انہوں نے بتایا کہ حکومت وقت نے بڑے بڑے لوگوں کو بھاری رشوتیں دے کر اپنے ساتھ ملا لیا ہے لیکن عام لوگوں کے دل آپ کے ساتھ ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہم جب کوفہ سے نکلے تو دیکھا کہ ایک بڑا لشکر کوفہ کے باہر جمع ہے۔ پوچھا تو معلوم ہوا کہ یہ لشکر آپ سے جنگ کی تیاریاں کر رہا ہے۔ ان لوگوں نے امامؑ سے پوچھا کہ جو لوگ آپ کے ساتھ ہیں کیا ان کے علاوہ اور کوئی آپ کے ساتھ نہیں؟ ان لوگوں نے امامؑ سے کہا کہ اگر آپ مناسب سمجھیں تو اس پہاڑ پر چلے جائیں، یہاں ایک قلعہ ہے جو غسماں اور حمیر سے تعلق رکھتا ہے۔ بیس ہزار کی فوج بھی اگر یہاں حملہ کرے تو وہ آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی۔ امامؑ نے جواب دیا کہ ہمارے اور ان (اہل کوفہ) کے درمیان ایک معاہدہ طے ہوا ہے جس پر مجھے بہر حال عمل کرنا ہے۔ یہ فرما کر امامؑ قصر بنی مقاتل کی طرف روانہ ہوئے۔

قصر بنی مقاتل

یہ ایک جگہ کا نام ہے۔ یہ ”قصر“ اور ”بنی مقاتل“ دونوں سے مرکب ہے۔

قصر

قصر کے کئی معنی ہیں۔

بہادر اور شجاع سمجھا جاتا تھا اور شعراء میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ یہ اپنی طاقت اور قوت کے بل بوتے پر لوگوں کی جائیداد پر ڈاکہ ڈالتا اور راستوں پر لوگوں کو لوٹا کرتا تھا۔ یہ عثمانی العقیدہ تھا اور دل میں حضرت علیؑ کے خلاف کدورت رکھتا تھا اسی وجہ سے یہ جب صفین میں علیؑ کے خلاف معاویہ کے لشکر میں شامل تھا۔

جب صفین کے بعد عبید اللہ ابن جریجی نے شام میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ اس طرح ایک عرصہ گزر گیا۔ اس عرصہ میں اس کی بیوی کو جو کوفہ میں رہتی تھی جب ایک مدت تک اس کے مرنے یا زندہ رہنے کی خبر نہ ملی تو اس کی واپسی سے مایوس ہو کر اسکے بھائی نے اس کو عکرمہ کے عقد میں دے دیا۔ عبید اللہ جریجی کو جب یہ خبر ملی کہ اس کی بیوی نے عکرمہ سے عقد کر لیا ہے تو وہ کوفہ آیا اور حضرت علیؑ کی خدمت میں شکایت کی کہ میری بیوی عکرمہ کے عقد میں آ گئی ہے۔ علیؑ نے اس کو دیکھ کر کہا کہ ”کیا تم وہی آدمی نہیں ہو جس نے ہمارے خلاف ہمارے دشمن کا ساتھ دیا اور اس کی مدد کی؟“ اس نے کہا کہ ”کیا اس بناء پر میں آپ کی عدالت اور انصاف سے محروم ہو جاؤں گا؟“ تو علیؑ نے جواب دیا کہ ”نہیں! ایسا نہیں ہوگا۔“ آپ نے فوراً اس کی بیوی کو جو اس وقت حاملہ تھی عکرمہ سے واپس لیا اور ایک امین شخص کے سپرد کیا۔ بچہ کی پیدائش کے بعد آپ نے بچہ کو عکرمہ کے اور بچہ کی ماں کو عبید اللہ جریجی کے حوالے کر دیا۔ وہ اپنی بیوی کو لے کر شام چلا گیا اور جب تک حضرت علیؑ زندہ رہے وہ شام میں رہا۔ حضرت علیؑ کی شہادت کے بعد واپس کوفہ آ کر یہاں سکونت اختیار کی۔

جب اس نے یہ سنا کہ امام حسینؑ کوفہ سے فرار ہو کر قصر بنی مقاتل پہنچا۔

ادھر امام جب قصر بنی مقاتل اور دیکھا کہ عبید اللہ ابن جریجی یہاں مقیم ہے تو آپ نے حجاج ابن مسروق جریجی کو یہ پیغام دے کر اس کے پاس بھیجا کہ وہ آپ کا ساتھ دے اور آپ کی نصرت کرے۔ حجاج یہ پیغام لے کر اس کے پاس گئے اور کہا کہ۔

(۱) قصر یعنی مقصد غایت۔

(۲) قصر یعنی روکنا، منع کرنا۔

(۳) قصر یعنی کسی چیز کو اپنے اصل سے ملانا۔

(۴) قصر یعنی یعنی ضیق باندھنا۔

(۵) قصر یعنی نصف کرنا، آدھا کرنا۔

اور

(۶) قصر یعنی کاٹنا۔

یہاں قصر کے معنی بلند محل اور عمارت کے ہیں۔ ایسی عمارت جو محکم ہو اور چاروں طرف سے محصور ہو جس میں کوئی نہ آسکے اسے قصر کہتے ہیں جیسے ”حور مقصورات“ یعنی ایسی حوریں جو قصر میں بند ہیں۔ لفظ قصر ہمیشہ مضاف کے معنوں میں آتا ہے جو کسی سے نسبت رکھتا ہو۔

مقاتل

دوسرا لفظ ”مقاتل“ ہے۔ یہ مقاتل بن حسن تغالیہ سے منسوب ہے۔ کتاب ”معجم بلدان“ میں اس کو قیس ابن زید بن منات بن تمیم سے نسبت دی ہے۔

یہ جگہ عین التمر اور قطقطانہ کے درمیان واقع ہے۔ اس کو قیس ابن علی ابن عبد اللہ نے ویران اور برباد کیا اور بعد میں اسے آباد کیا۔

عبید اللہ ابن جریجی سے امام کی ملاقات

امام حسینؑ علیہ السلام جب یہاں پہنچے تو دیکھا کہ یہاں پہلے ہی سے ایک بہت بڑا خیمہ نصب ہے جس میں عبید اللہ ابن جریجی مقیم ہے۔ اس کے خیمے کے دروازے پر ایک طویل نیزہ نصب تھا، سامنے ایک زین کسا ہوا گھوڑا موجود تھا جس پر ایک تلوار لگی ہوئی تھی۔ یہ سب اس بات کی علامت سمجھی جاتی تھی کہ اس خیمے میں کوئی شجاع اور جنگجو شخص قیام پذیر ہے۔ یہ شخص بہت

”میں امام کی طرف سے تمہارے لئے نیکی اور سعادت کا ہدیہ لے کر آیا ہوں۔ امام نے تمہیں اپنی حمایت و نصرت کے لئے بلایا ہے۔ اگر تم ان کے رکاب میں ان کے دشمن سے جنگ کرو گے تو عظیم اجر و ثواب کے مستحق قرار پاؤ گے اور اگر مر گے تو شہداء میں تمہارا شمار ہوگا۔“

امام کے اس پیغام کے جواب میں عبید اللہ جعفی نے کہا کہ۔

”واللہ! میں نے کوفہ اس لئے چھوڑا کہ میں ڈیکھ رہا تھا کہ لوگ حسین کے خلاف جنگ کے لئے نکل رہے ہیں انہوں نے حسین کو تہاوا کیلا چھوڑ دیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ حسین قتل ہونے والے ہیں میں اپنے نفس کو موت کے لئے آمادہ نہیں پاتا اس لئے میں نہیں چاہتا کہ میرا اور حسین کا آنا سا منا ہو۔“

حجاج نے واپس آ کر اس کا یہ جواب امام کو پہنچایا۔ اس کا یہ جواب سن کر امام خود بہ نفس اپنے خاندان کے چند افراد اور دیگر چند شخصیات کے ہمراہ اس کے پاس پہنچے۔ آپ کو جگہ دی۔ وہ کہتا ہے کہ ”حسن و جمال میں حسین جیسا میں نے کہیں نہیں دیکھا، مجھے کبھی کسی کو دیکھ کر اتنی رقت نہیں ہوئی جتنی حسین کو ان کے چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ دیکھ کر ہوئی، جب میری نظر آپ کی ریش مبارک پر پڑی تو میں نے پوچھا کہ آپ کی ریش مبارک کے بالوں کی سیاہی قدرتی ہے یا آپ نے خضاب لگایا ہے تو آپ نے جواب دیا کہ بڑھاپے نے مجھ پر جلدی حملہ کیا ہے“

امام حسین علیہ السلام نے خداوند ذوالجلال کی حمد و ثناء کے بعد فرمایا کہ۔

”اے عبداللہ! تمہارے شہر والوں نے تمہارا متفق ہو کر مجھے کوفہ آنے کی دعوت دی لیکن اب معلوم ہوا کہ حالات ایسے نہیں ہیں۔“

عبداللہ! تمہاری گردن پر بہت گناہ ہیں، کیا تم چاہو گے کہ توبہ کرو..... ایسی توبہ کہ تمہارے تمام گناہ دھل جائیں؟“

اس نے پوچھا: ”یا فرزند رسول! وہ کون سی توبہ ہے؟“

آپ نے جواب دیا: ”تم ہمارے ہمراہ ہو کر ہمارے دشمن سے جنگ کرنے کے لئے آمادہ ہو جاؤ۔“

اس نے جواب دیا: ”میں جانتا ہوں کہ جو آپ کا ساتھ دے گا اور آپ کی پیروی کرے گا وہ آخرت میں سعادت مند ہوگا، لیکن میں نے کوفہ میں آپ کی مدد کرنے والا ایک فرد بھی نہیں دیکھا، میرا اپنا نفس موت کے لئے آمادہ نہیں اس لئے آپ مجھے معاف رکھیں اور مجھ سے اپنی مدد و نصرت کا تقاضا نہ کریں..... ہاں! البتہ اس سلسلے میں میں اتنا کر سکتا ہوں کہ آپ کی خدمت میں اپنا وہ تیز رفتار گھوڑا پیش کر دوں جس پر بیٹھ کر جب بھی میں کسی کے پیچھے گیا تو اسے جالیا اور جس سے میں نے فرار کیا وہ مجھے پانہ سکا۔“

آپ نے اس کی اس پیشکش کے جواب میں فرمایا کہ۔

”جب تم نے میری مدد کرنے سے اپنی جان چرائی اور میری نصرت سے روگردانی کی تو مجھے تمہارے گھوڑے یا تمہاری کسی اور چیز کی ضرورت اور طمع نہیں۔ میں گمراہ لوگوں سے کسی مدد یا پشت پناہی کا خواہاں نہیں۔“

البتہ میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ تم ہم سے اتنی دور چلے جاؤ کہ ہماری رتی بھی نہ دیکھ سکو اور نہ ہی ہماری صدائے استغاثہ سن سکو۔ خدا کی قسم! جو بھی ہمارے استغاثہ کی آواز کو سنے اور ہماری مدد کو نہ آئے، خدا اس کو منہ کے بل جہنم میں داخل کرے گا۔“

امام کے کلام کا اس پر کچھ اثر نہ ہوا اور یہ بد نصیب انسان جو لوگوں میں بہادر اور شجاع سمجھا جاتا تھا، ایک طویل مدت جنایت و انحرافات اور ضلالت و گمراہی میں گزارنے کے بعد اپنے دروازے پر آئے ہوئے سعادت و نجات کے ہدیہ الہی کو ٹھکرا کر ہمیشہ کے لئے حسرت و ندامت کا سرمایہ سمیٹ کر شرمندگی کے عالم میں بزدلی کے ساتھ قصر بنی مقاتل سے چلا گیا۔

امام حسین کی شہادت کے بعد حق و باطل کی جنگ کے شعلے جب ٹھنڈے پڑ گئے تو یہ شخص عبد اللہ ابن زیاد کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے اس کے دربار میں یہ یقین دلانے کے لئے گیا کہ ”میں حسین کے لشکر میں شامل نہیں تھا اور میں نے ان کا ساتھ نہیں دیا۔“ لیکن ظالم و جاہر حکمران ایسے لوگوں سے کہ جو خود کو غیر جانبدار اور الگ تھلگ رکھنا چاہتے ہیں کسی اور طریقے سے نمٹتے ہیں۔ ان ظالم و جاہر حکمرانوں کو مطمئن کرنے کے لئے صرف یہ کافی نہیں کہ کوئی شخص ان کے مخالف اور دشمن کا ساتھ نہیں دیتا بلکہ وہ ان کی حکومت کا ساتھ نہ دینے پر ایسے لوگوں سے باز پرس کرتے ہیں۔ چنانچہ عبید اللہ ابن زیاد نے عبید اللہ ابن جریجی سے اس کو تا ہی پر باز پرس کی اور پوچھا کہ۔

”تو اتنے عرصے کہاں تھا؟“

عبید اللہ جریجی نے جواب دیا: ”میں بیمار تھا۔“

ابن زیاد نے کہا: ”جسمانی طور پر بیمار تھا یا قلبی طور پر؟ کیا تو ہماری دشمنی کے ساتھ نہیں تھا؟“

اس نے جواب دیا: ”میں اتنا غیر معروف آدمی تو نہیں ہوں کہ میں حسین کے لشکر میں ہوتا اور کسی کو پتہ نہ لگتا۔“

ابن زیاد اور عبید اللہ جریجی کے درمیان یہ گفتگو جاری تھی کہ ایک مرتبہ ابن زیاد کی نظر اس سے ہٹی اور وہ کسی اور طرف متوجہ ہوا۔ عبید اللہ جریجی موقع غنیمت دیکھتے ہوئے وہاں سے فرار ہو گیا۔

حسین ابن علیؑ کا ساتھ نہ دے کر عبید اللہ جریجی نہ ابدی سعادت حاصل کر سکا نہ حکام وقت کی خوشنودی اور نہ ہی وہ اپنی بقیہ زندگی میں سکون پاسکا۔ حسرت و مذمت کے عالم میں وہ بار بار ایک شعر پڑھتا تھا جس کا ترجمہ یہ ہے۔

”میری زندگی کا یہ کتنا حسرت بھرا سانحہ ہے جو میرے سینے اور گلے کے درمیان مسلسل کھٹک رہا ہے کہ قصر بنی مقاتل پر حسین ابن علیؑ نے اہل ضلالت اور اہل نفاق سے لڑنے کے لئے مجھ

سے نصرت طلب کی اور کہا کہ..... ”وائے ہوتجھ پر کہ تو مجھے چھوڑ کر جاتا ہے۔“ کاش میں حسینؑ کی مدد کرتا تو قیامت کے دن سعادت کا مالک ہوتا۔ لیکن افسوس کہ میں نے ان کی مدد نہیں کی۔ جن لوگوں نے ان کی مدد کی انہیں سعادت نصیب ہوئی اور جنہوں نے غفلت برتی وہ نقصان اور خسارے میں رہے۔“

عبید اللہ ابن جریجی اور امام حسینؑ کے درمیان گفتگو پر تبصرہ

عبید اللہ جریجی نے امام کا ساتھ دینے سے یہ کہہ کر معذرت طلب کی کہ۔ ”میں نے دیکھا کہ کوفہ میں کوئی آپ کی مدد اور حمایت کرنے والا نہیں ہے۔“

ایسا ہی ایک مرحلہ اس وقت پیش آیا جب جناب زہراء اسلام اللہ علیہا نے پیغمبر اکرمؐ کی وفات کے بعد قیادت کے رخ کو صحیح سمت میں لانے کے لئے معاذ ابن جبل کو ابوالحسنؑ کی حمایت کرنے کی دعوت دی تو ان کو بھی ایسا ہی جواب سننا پڑا۔ چنانچہ معاذ ابن جبل جیسے صحابی جلیل نے جواب دیا کہ۔

”میرے علاوہ اور کتنے افراد آپ کے ساتھ ہیں؟“

یعنی چونکہ آپ کے پاس افرادی قوت نہیں ہے اس لئے میں آپ کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ عبید اللہ جریجی نے بھی امام کا ساتھ دینے سے اپنے انکار کی یہ تو جیہہ پیش کی۔

”چونکہ آپ کے سات اور کوئی نہیں ہے اس لئے شکست اور موت آپ اور آپ کا ساتھ دینے والوں کے لئے حتمی اور یقینی ہے۔“

عبید اللہ جریجی اور اس جیسے دوسرے لوگ جنہوں نے امام کا ساتھ دینے سے جان چرائی ان کی منطق یہ تھی کہ اس جنگ میں امام کی فتح کا کوئی امکان نہیں، البتہ اگر فتح پانے کا کوئی امکان ہوتا تو وہ آپ کا ساتھ دیتے تاکہ کوفہ میں امام حسینؑ کی حکومت قائم ہونے کے بعد ان لوگوں کو بھی کوئی عہدہ اور مقام ملتا۔ لہذا اس لحاظ سے اس کا یہ کہنا صحیح تھا کہ۔

”میں جلدی مرنے کے لئے تیار نہیں۔“

کیونکہ کوئی عہد اور اقتدار ملنے کی جب کوئی امید ہی نہ ہو تو پھر امامؑ کا ساتھ دینا گھائے اور خسارے کا سودا ہے۔

تاجرانہ ذہنیت رکھنے والوں کی کل بھی یہی سوچ تھی اور آج بھی ایسے لوگوں کی یہی سوچ ہوتی ہے جن کے نزدیک ادائیگی فرض اور مسؤلیت نامی کوئی چیز نہیں۔

☆ امامؑ نے عبید اللہ جعفی کو گناہوں سے توبہ کرنے کی دعوت دی اور فرمایا کہ۔

”تمہاری گردن پر بہت بڑا گناہ ہے، آیا تم اس گناہ کی توبہ کرنے کے لئے تیار ہو۔“

وہ کون سا بڑا گناہ تھا جس کو دھو ڈالنے کی امامؑ نے اسے دعوت دی؟ اپنے اس گناہ سے عبید اللہ جعفی بھی آگاہ تھی اسی لئے اس نے یہ نہیں پوچھا کہ وہ کون سا گناہ ہے بلکہ توبہ کی نوعیت اور کیفیت کے بارے میں پوچھا کہ۔

”فرزند رسول! کون سی توبہ؟“

چنانچہ امامؑ نے جواب دیا کہ توبہ کی نوعیت اور کیفیت تمہارے گناہ سے ہم آہنگ ہے۔ تمہارا گناہ یہ ہے کہ تم نے امامؑ سے روگردانی کی اس لئے اس کی تلافی بھی یہی ہے کہ اب تم امامؑ حق کا ساتھ دو۔

☆ کل کے عبید اللہ جعفی اور آج بھی ہزاروں عبید اللہ جعفی اپنی مادی سوچ اور فکر کے ساتھ یہ سمجھتے ہیں کہ دین و دنیا دونوں کی سعادتیں روپیہ پیسہ اور مال دنیا کے ذریعہ حاصل کی جاسکتی ہیں۔ چنانچہ عبید اللہ جعفی نے اسی نقطہ نظر کے تحت کہا کہ ”میں آپ کی مالی معاونت کرنے کو تیار ہوں۔“

”یہ میرا گھوڑا، یہ میری تلوار، یہ میرا نیزہ میں آپ کی نذر کرتا ہوں اور یہ گھوڑہ ہے کہ اگر کسی کا پیچھا کرنا ہو تو اس کو یہ جانے نہیں دے گا اور اگر کسی سے فرار کرنا ہو تو اس کو کوئی پکڑ نہیں سکتا۔“

اپنے گھوڑے کی صفات بیان کرنے کے بعد اس نے امامؑ کو یہ مشورہ دیا کہ ”آپ

اُس پر سوار ہو کر یہاں سے نکل جائیں، آپ کے بچوں کا میں ضامن ہوں میں بعد میں آپ کے بچوں کو آپ تک پہنچا دوں گا۔“

امامؑ نے فرمایا کہ۔

”جب تم اپنی جان دینے سے نکل سے کام لے رہے ہو تو مجھے تمہارے مال کی ضرورت نہیں، کیونکہ میں ظالموں سے مدد اور پشت پناہی کا طالب نہیں۔“

یعنی تم نے اصل مسئلہ ہی سے انحراف کیا اور امامؑ حق سے روگردانی کی تو تمہاری ظالم ہونے میں اب کوئی شک نہیں۔ امام دقت سے جو منحرف ہو وہ ظالم ہے اور میں ظالموں سے مدد نہیں لیتا۔ کیونکہ نص قرآن کے تحت ظالموں سے مدد لیمنا حرام ہے۔

☆ کسی صالح قیادت کے تحت سعادت سے ہمکنار ہونے کے لئے دعوائل کا موجود ہونا اور تیسرے عامل کا مفقود ہونا ضروری ہے۔ یہ دعوائل موجود نہ ہوں یا ان میں نقص ہو اور تیسرا عامل مفقود نہ ہو تو انسان سعادت کی منزل تک نہیں پہنچ سکتا۔

(۱)۔ صالح قیادت کی موجودگی

معاشرے میں اگر صالح قیادت موجود نہ ہو تو معاشرے کا فساد و گمراہی سے دوچار ہونا ایک لازمی امر ہے لہذا سعادت کے حصول کے لئے ایک ضروری شرط صالح قیادت کی موجودگی ہے۔

(۲)۔ صالح رہبری کی شناخت

سعادت تک پہنچنے کے لئے دوسرا عامل قائد اور صالح رہبر کی شناخت ہے۔

(۳)۔ حائل رکاوٹوں اور موانع کا مفقود ہونا

صالح رہبری موجود ہو لوگ اس کی کما حقہ معرفت بھی رکھتے ہوں لیکن تیسرا عامل یعنی اہل دعیال کی محبت، مال و دولت کی طمع اور حسب جاہ و منصب اگر راہ میں رکاوٹ بن جائیں تو نہ رہبری کی موجودگی اس کے کچھ کام آ سکتی ہے اور نہ رہبری کی معرفت اسے سعادت کے ساحل تک

پہنچا سکتی ہے۔

چنانچہ عبید اللہ جعفی کے سامنے امام وقتؑ بہ نفس نفیس خود موجود ہیں، وہ امامؑ کی معرفت بھی خوب رکھتا ہے جیسا کہ خود قسم کھا کر کہتا ہے کہ۔

”میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ جو آپؑ کا ساتھ دے گا وہ آخرت میں سعادت سے

ہمکنار ہوگا۔“

لیکن امام وقتؑ کی موجودگی اور آپؑ کی تمام تر معرفت رکھنے کے باوجود وہ امامؑ کا ساتھ نہیں

دیتا اس لئے کہ جب دنیا مانع ہے۔

یہ تین غیر مقدس تثلیث..... یعنی (۱) اہل و عیال، (۲) مال و دولت اور (۳) جاہ و منصب وہ

فتنے ہیں جو امام حقؑ کا ساتھ دینے اور اس کی راہ کو اپنانے میں ہمیشہ آڑے آتے رہے ہیں اور

امامؑ کی معرفت اور اس کی راہ سے آشنائی کے باوجود انسان کو سعادت سے دور اور شقاوت سے

ہمکنار کرتے رہے ہیں۔ لہذا ان رکاوٹوں کو اپنی سعادت کی راہ میں حائل نہیں ہونے دینا چاہئے۔

چنانچہ اگر تاریخ ائمہ کا مطالعہ کریں تو دیکھیں گے کہ صرف عبید اللہ جعفی ہی نہیں بلکہ

سینکڑوں انسان جو ہم سے کئی گنا زیادہ امامؑ کی معرفت رکھتے تھے لیکن راہ میں حائل ان

رکاوٹوں کو ہٹانہ سکنے کی وجہ سے معرفت کے باوجود نہ صرف یہ کہ سعادت حاصل نہ کر سکے بلکہ

الناشقاوتِ ابدی کو اپنے لئے خرید لیا۔

عبید اللہ جعفی نے جب امامؑ کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا تو آپؑ نے اس سے فرمایا کہ۔

”اگر میرا ساتھ نہیں دے سکتے تو یہاں سے اتنی دور چلے جاؤ کہ میری صدائے استغاثہ نہ سن

سکو کیونکہ میری صدائے استغاثہ سننے کے بعد بھی جو میری مدد کو نہ پہنچے وہ یقینی جہنم کا بندھن بنے

گا۔“

امامؑ نے یہ جملہ نہ صرف عبید اللہ جعفی سے کہا بلکہ ان تمام لوگوں سے کہا جنہوں نے امامؑ

کا ساتھ دینے سے انکار کیا۔ امامؑ کے اس فرمان کی دقت جیہہ ہو سکتی ہیں۔

پہلی وجہ تو یہ کہ روایات سے ثابت ہے کہ اگر کوئی مسلمان فریاد و استغاثہ کرے اور اس کی

فریاد و استغاثہ کو سننے والا اس کی مدد نہ کرے تو احادیث کی رو سے وہ مسلمان نہیں۔ اور جو مسلمان نہ

ہو وہ جہنمی ہے۔

ایک عام مسلمان کی فریاد ہی نہ کرنے والا جب جہنمی ہے تو امام وقتؑ کا استغاثہ پر خاموش

رہنے والے کا ٹھکانہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ آپؑ نے ان لوگوں سے

اس لئے دور چلے جانے کے لئے کہا ہو کہ یہ کمزور ضعیف الارادہ لوگ کہیں خوف کی وجہ سے یا کسی

طمع و لالچ کے تحت دشمن کے لشکر سے نہ جا ملیں۔

انصار کا انوکھا کردار

اس کے علاوہ قصر بنی مقاتل پر عمرو بن صحاک بن عبد اللہ مشرقی اور اس کے چچا زاد بھائی

مالک بن نصر ارجبی نے امامؑ سے ملاقات کی اور امامؑ کی خدمت میں سلام عرض کیا۔ امامؑ نے ان

سے ان کی آمد کی وجہ پوچھی تو انہوں نے کہا کہ ”خدا آپؑ کو سلامت رکھے ہم آپؑ کو سلام عرض

کرنے اور آپؑ کے ساتھ تجدید عہد کرنے حاضر ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ چاہتے ہیں کہ آپؑ کو

لوگوں کی نیکیوں اور ان کے ارادوں سے آگاہ کریں۔ یہ لوگ آپؑ سے جنگ کرنے کے لئے متحد

و متفق ہو چکے ہیں۔“ امامؑ نے فرمایا کہ ”خداوند عالم ہی ہماری مدد اور نصرت کے لئے کافی ہے وہی

ہمارا وکیل ہے۔“ اس کے بعد یہ دونوں امامؑ کو الوداعی سلام کر کے اور امامؑ کے حق میں دعا کرنے

کے بعد اٹھے۔ جب یہ رخصت ہونے لگے تو امامؑ نے فرمایا کہ ”تم دونوں میری مدد و نصرت کیوں

نہیں کرتے؟ تمہیں کون سا ممانع ہے؟“ امامؑ کے طلب نصرت پر ان دونوں کا جواب کم و بیش

ایک ہی تھا اور وہ یہ کہ۔

”ہم عیالدار ہیں اور ہمارے بچے ہیں، اس کے علاوہ ہمارے اوپر لوگوں کے قرضے ہیں۔“

امام نے ان دونوں کا جواب سن کر خاموشی اختیار کی۔

ابنِ ضحاک نے امام کی خدمت میں عرض کیا: ”میں اس شرط کے ساتھ آپ کا ساتھ دینے کو تیار ہوں کہ میں آپ کے رکاب میں اس وقت تک آپ کے دشمنوں سے جنگ کروں گا جب مجھے اس بات کا یقین رہے گا کہ آپ بچ جائیں گے، لیکن جب یہ امید ختم ہو جائے گی اور میں نا امید ہو جاؤں گا تو میں آپ کو چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ کیا آپ اس شرط کے ساتھ میری مدد قبول کرنے کو تیار ہیں؟“

امام نے اس کی عجیب و غریب شرط کو قبول فرمایا۔

امام اور ابنِ ضحاک اور ابنِ ارجی کے مابین گفتگو پر تبصرہ

☆ عمر ابنِ ضحاک اور مالک بن ارجی جو امام کی خدمت میں عقیدت پیش کرنے اور امام کو سلام کرنے کے لئے آئے تھے انہوں نے امام کا ساتھ دینے سے معذرت کی اور یہ عذر پیش کیا کہ۔

”ہمارے بال بچے کوفہ میں ہیں۔“

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ۔۔۔

سوائے چند افراد کے کیا امام کے لشکر میں موجود دوسرے احوان و انصار کے بال بچے نہیں تھے؟ کیا ان کو یہ مسائل درپیش نہیں تھے صرف ان دونوں کو درپیش تھے؟

☆ اس کے علاوہ ان دونوں نے امام سے کہا کہ ”ہم آپ کی خدمت میں تجدید عہد کرنے آئے ہیں۔“ سوال یہ ہے کہ۔۔۔۔۔

وہ کون سا تجدید عہد تھا؟

یہ جاننا ضروری ہے کیونکہ ہم بھی آج ائمہ علیہم السلام کے میلا و شہادت کے موقعوں پر یہ جملہ

دہراتے ہیں کہ۔۔۔۔۔

”ہم آج یہاں امام سے تجدید عہد کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں۔“

یہ جملہ ہم نے ان سے سیکھا ہے یا انہوں نے ہم سے سیکھا تھا؟

☆ ان دونوں نے امام کا ساتھ نہ دینے کے سلسلے میں ایک اہم فقہی عذر پیش کیا کہ۔۔۔۔۔

”ہمارے اوپر لوگوں کے قرضے ہیں۔“

کیا لوگوں کے قرضوں کی اتنی اہمیت ہے کہ ان قرضوں کی ادائیگی سے پہلے امام وقت کا

ساتھ نہیں دیا جاسکتا؟

کیا قرضوں کی ادائیگی کے قریضے کو وصیت اور دوسرے طریقوں سے حل نہیں کیا جاسکتا؟

اگر یہ منطقی اور عذر قابل قبول تھا تو امام نے اس عذر کی تائید و توثیق کیوں نہیں کی تاکہ رہتی دنیا

تک اس کے لئے سند مل جاتی؟

دوسرے اگر یہ عذر معقول اور صحیح تھا تو آپ نے عمر ابنِ ضحاک کو کیوں منع نہیں کیا کہ تم پر میرا

ساتھ دینے کا فرض اس لئے ساقط ہے کہ تمہیں اپنا قرض اتارنا ہے؟

☆ عمر ابنِ ضحاک نے اتنے پس و پیش کے بعد اس عجیب شرط کے ساتھ آپ کا ساتھ دینے کا وعدہ

کیا کہ۔۔۔۔۔ ”جب آپ کے بچنے کی تمام امیدیں ختم ہو جائیں گی تو میں آپ کو چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔“

اور فی الواقع ہوا بھی یہی کہ جب آپ مصیبت کے عالم میں تنہا رہ گئے تو وہ آپ کو چھوڑ کر چلا گیا

۔۔۔۔۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ۔۔۔۔۔

آپ نے اس کی اس شرط کو کیوں قبول کر لیا اور کیوں اسے اپنے کاروان میں شامل کر لیا؟

استفا

اس زمانے میں اور آج بھی دور و دراز کے سفر اور خاص طور پر صحرا اور بیابانوں کے سفر میں پانی

کی ضرورت رہتی ہے لہذا جہاں چشمہ یا خوشگوار پانی نظر آتا ہے وہاں سے پانی ساتھ لے لیتے

ہیں، لیکن تاریخ میں کہیں یہ دیکھنے میں نہیں آتا کہ پانی اکٹھا کرنے کے لئے کیا اور کتنے وسائل

و ذرائع میسر تھے۔ بہر حال امام نے قصر بنی مقاتل چھوڑتے وقت صبح سے پہلے اپنے اصحاب کو حکم

دیا کہ یہاں سے پانی اکھٹا کر لیں۔ چنانچہ آپ یہاں سے پانی جمع کر کے روانہ ہو گئے۔

کربلا

کربلا ایک جگہ ہے جو کوفہ جاتے ہوئے راستے میں آتی ہے۔ معجم بلدان کے مطابق لفظ ”کربلا“ ”کربلہ“ سے لیا گیا ہے اور ”کربلہ“ کے معنی ہیں زم زم زمین۔ چونکہ یہاں کی زمین نرم ہے اس لئے اس کربلا کہتے ہیں۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ”کربلا“ ”کربل“ سے لیا گیا ہے۔ ”کربل“ یا کترش سبزی کا نام ہے۔ شاید یہ سبزی یہاں زیادہ ہوتی ہوگی اس لحاظ سے اس کا نام کربلا پڑ گیا۔

علامہ شہرستانی کہتے ہیں کہ یہ لفظ ”کورباہل“ سے لیا گیا ہے۔

الستاس کربلی جسے ابو اللغوی کہا جاتا ہے کا کہنا ہے کہ ”کربلا“ دو لفظوں ”کرب“ اور ”ایل“ سے مرکب ہے۔ ”کرب“ کے معنی ہیں ”حرم“ اور ”ایل“ کے معنی ہیں ”اللہ“۔ دونوں لفظوں کو ملا کر اس کے معنی ”حرم اللہ“ یا ”معبد اللہ“ ہوتے ہیں۔ نینوا اور عتقرباہل کے رہنے والوں کے لئے کربلا معبد تھا۔

بعض کے نزدیک ہر اس چیز کو جو غرب ہو اسے ”کرب“ کہتے ہیں جیسے ”کرب الشمس“ یعنی سورج کا غرب ہونا۔

کچھ لوگوں نے ”کربلا“ کو ”کربا“ کہا ہے اور کربا کے معنی ہیں جنگ اور قتل کی جگہ۔

درحقیقت یہ عربی کا لفظ نہیں ہے بلکہ سامیہ عجمی لفظ ہے۔ یہ سامی ہارامی بابلیہ کی زبان ہے۔ یہ جگہ بابلیوں کے زیر حکومت تھی۔ ۱۴ ہجری میں حضرت عمر کے دور خلافت میں سعد بن ابی وقاص نے جب قادسیہ کو فتح کیا تو کربلا کو فوجیوں کا مرکز قرار دیا گیا پھر وہاں سے یہ مراکز کوفہ منتقل ہوا۔

ساسانیوں نے شاہ پورزی الاکتاف کے دور میں عراق کو ضلعوں میں اور ہر ضلع کو تحصیلوں میں تقسیم

کیا۔ عراق میں ایک جگہ ہے جس کا نام بابل ہے جو نجف اور حله کے درمیان ہے۔ وہ لوگ حله کو ”کوز“ کہتے تھے۔ جب تقسیم شہر بندی کی گئی تو ”بابل“ اور ”حله“ کے علاقے کا نام ”حله بابل“ یعنی ”کورباہل“ ہوا۔ اور لفظ ”کربلا“ کورباہل سے لیا گیا۔ لیکن یہ صحیح نہیں بلکہ ایک اشتباہ ہے۔ یہ ایک آباد شہر تھا، لیکن مسلمانوں نے اسے چھوڑ دیا تو یہ ویران اور بنجر زمین بن کر رہ گیا۔ اس زمین کے مختلف نام بیان کئے ہیں لیکن یہ تمام نام ایک جگہ کے نہیں ہیں بلکہ مختلف علاقوں اور مختلف منطقوں کے نام ہیں جسے لوگ ایک جگہ کا نام سمجھتے ہیں۔ مثلاً۔

(۱) نینوا۔ جو کربلا کے جنوب مشرق میں ایک پہاڑی کی چوٹی پر واقع ہے۔

(۲) عتقر۔ یہ جنوب مغرب کی طرف واقع ہے۔

(۳) نوادیس۔ یہ شمال مغرب کی طرف ہے اور نصاریٰ کا قبرستان ہے۔

(۴) طف۔ دریا کی اوپر والی اونچی زمین کو کہتے ہیں۔

(۵) غاضریہ۔ یہ ایک عورت کا نام ہے جو بنی عامر سے تھی اور یہاں رہتی تھی۔ اس کے نام پر اس جگہ کا نام غاضریہ مشہور ہوا۔

(۶) ہر علقمہ۔

(۷) عمورا۔

(۸) ماریہ۔

کربلا کے شمال میں دجلہ اور جنوب میں فرات ہے، شمال مشرق میں ایران اور جنوب میں حجاز ہے۔

نینوا

نینوا ایک علاقے کا نام ہے جو دجلہ اور کربلا کے شمال مشرق کی طرف ہے۔ قدیم زمانے میں یہ منطقہ ”طف“ کا ایک گاؤں تھا۔ یہ بلندی پر واقع ہے۔ اس کی حد دوزیر علقمہ سے ملتی ہیں۔

حضرت یونس ابن متی یہیں پیدا ہوئے تھے۔ آج کل اسے ”توریج“ کہتے ہیں۔

امام حسینؑ جب اس جگہ پہنچے تو عبید اللہ ابن زیاد کا قاصد اس کا ایک خط لے کر یہاں پہنچا اور اسے ملا۔ اس خط میں لکھا تھا کہ امام حسینؑ کا کسی ایسی جگہ پر محاصرہ کر دیا گیا ہے جو اب وہاں سے ہرگز نہیں نکلے گا۔ امام کا راستہ روکنا چاہتا تو زہیر ابن قین نے امام سے کہا کہ ہمارے لئے اس گروہ سے اس وقت جنگ کرنا آسان ہے، آئندہ حالات مشکل سے مشکل تر ہوتے چلے جائیں گے اور بہتری کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی۔ امام نے جواب دیا کہ۔

”میں نہیں چاہتا کہ جنگ کا آغاز میری طرف سے ہو۔“

غاضرہ

غاضرہ کربلا کی سرزمین کا نام ہے۔ یہ ایک گاؤں ہے جو کوفہ کے اطراف میں واقع ہے اور کربلا سے نزدیک ہے۔ غاضرہ طاقتور بنی اسد سے تعلق رکھتا ہے۔ بنی اسد کے عراق میں آنے کے بعد یہ گاؤں ان کے نام سے منسوب ہوا۔ امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا کہ۔

”غاضرہ میں ہماری قبور کی زیارت کرو۔ غاضرہ وہ بقعہ ہے جہاں حضرت موسیٰ ابن عمران نے خدا سے کلام کیا، حضرت نوحؑ نے خدا سے مناجات کی، ہی ہنقدس ترین سرزمین ہے۔ اس عظمت اس لحاظ سے ہے کہ خداوند عالم نے اپنے انبیاء اور اولیاء کے اجساد پاک کو اس سرزمین میں رکھا۔“

امام حسین علیہ السلام جب کربلا پہنچے تو اہل نینوا اور اہل غاضرہ سے یہ علاقہ ساٹھ ہزار درہم میں خریدا اور زمین انہیں کو اس شرط کے ساتھ واپس کر دی کہ جب ہمارے زائرین یہاں آئیں تو ہماری قبر کی طرف ان کی رہنمائی کرنا اور تین دن تک ان کی مہمانی کرنا۔

امام نے جو زمین یہاں خریدی وہ جیسا کہ تاریخ میں بیان کیا گیا ہے ایک بنجر اور غیر آباد زمین تھی۔ اسلامی فقہ میں قرآن و سنت کی رو سے ایسی زمین کسی کی ملکیت قرار نہیں پاسکتی کہ جس پر کسی

کو مالکانہ حقوق دیئے جائیں ایسی زمینیں یا طبعی طور پر آباد زمینیں امام کی ملکیت ہوتی ہیں۔ امام حسین علیہ السلام شرعی لحاظ سے خود اس مالک تھے، جب امام شرعی طور پر خود اس کے مالک تھے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر آپ نے خرید و فروخت کی صورت میں کیوں اس کو پہلے خریدا اور پھر ہدیہ یا عطیہ کے طور پر بنی اسد کو عطا کر دیا اور ان کو مالکانہ حقوق دے دیئے؟ اس کی دو وجوہ ہو سکتی ہیں۔

☆ ایک یہ کہ شواہد و قرائن سے یہ بات کسی حد تک واضح ہو چکی تھی امام یہیں پر شہید ہوں گے۔ اپنی شہادت کو حتمی سمجھتے ہوئے ممکن ہے آپ نے سوچا ہو کہ آپ کی شہادت کے بعد آپ کے پاس موجود ساٹھ ہزار درہم کی رقم مالی غنیمت کے طور پر کیوں دشمن کے ہاتھوں میں جائے۔ اس سے بہتر یہ ہے کہ یہ رقم بنی اسد کے مستضعفین کے پاس جائے۔

☆ دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ آپ جانتے تھے آپ کی شہادت کے بعد یہ جگہ بارگاہ اور قبۃ عالم بنے گی اور یہ سرزمین رموز و حید پرستی اور شریعت کی سر بلندی کے لئے مینار ہدایت ثابت ہوگی، زائرین جو جوق در جوق یہاں حاضر ہوں گے اور آپ کی اور آپ کے انصار و اعوان کی قبور مطہرہ سے ظالمین اور مستکبرین کے خلاف جہاد و مبارزہ کی روح اور غذا حاصل کریں گے۔ اس لئے یہاں کے رہنے والوں کا باہر سے آنے والے زائرین کے ساتھ سلوک و رویہ محبت بھرا اور مہمان نوازانہ ہوگا۔

نوادیس

نوادیس، ماؤس کی جمع ہے، قبر بنانے کے بعد علامت کے طور پر جو پتھر لگاتے ہیں اسے ماؤس کہتے ہیں۔ یہ جگہ گزشتہ زمانہ میں نصاریٰ کا قبرستان تھی۔ آج کل اسے ”ارضیہ جمالیہ“ کہتے ہیں۔ یہ کربلا کے شمال مغرب میں ہے۔ اس کا ذکر کتاب ”من لا یحضرہ الفقیہ“ میں آیا ہے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ۔

”نوادیس نے اپنی گرمی کی شدت کی خدا اس شکایت کی تو خدا نے فرمایا کہ چپ ہو جاؤ“  
قاضیوں کی جگہ تم سے کہیں زیادہ گرم ہے۔“

امام حسین علیہ السلام نے اس جگہ کا ذکر مکہ میں اپنے اس خطبہ میں فرمایا ہے جس میں آپ نے فرمایا کہ۔

”نوادیس اور کربلا کے درمیان درندے میرے جسم کو ٹکڑے ٹکڑے کریں گے۔“

حضرت حر بن یزید ریاحی کی قبر بھی یہیں ہے ان کی قبر یہاں ہونے کی دو جہات بیان کی جاتیں ہیں۔ ایک یہ کہ حضرت حر جنگ کرتے ہوئے یہاں پہنچ کر شہید ہوئے۔ درمیان میں دشمن کے حائل ہونے اور فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے امام حسین علیہ السلام اور ان کے اصحاب ان کی لاش مطہر کو دیگر شہداء کے لاشوں کے پاس نہیں لاسکے۔ دوسری وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ جب حضرت حر کے قبیلہ والوں کو یہ معلوم ہوا کہ عمر سعد شہداء کے لاشوں کی بے حرمتی کرنے کا ارادہ رکھتا ہے تو ان لوگوں نے حضرت حر کی لاش کو اس میدان سے دور لے جا کر یہاں دفن کیا۔

طف

یہ ایک جگہ کا نام ہے۔ طف لغت میں زمین سے اوپر اٹھی ہوئی جگہ کو کہتے ہیں۔ طف کوفہ کی آبادی سے ملے ہوئے دھت بیابان کا نام ہے۔ امام حسینؑ پر شہید ہوئے۔ یہاں پر قدیم زمانے میں پانی کے چشمے ہوتے تھے۔ سرحد کی فوجیں یہاں سے پانی لیتی تھیں۔ یہ جگہ قدیم زمانے میں طف کے نام سے معروف تھی۔

ادبیات اور شعراء کے کلام میں امام حسینؑ کہے جانے والے مرثیوں میں ”روز طف“، ”مقتولین طف“ کے الفاظ کثرت سے استعمال ہوئے ہیں۔ پیشبر اکرمؑ کی پیشین گوئیوں میں بھی اس کا ذکر آیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ۔

”میرا یہ نواسہ ارض طف میں شہید ہوگا۔“

علقہ یا علقمی

علقہ ایک نہر کا نام ہے جو دریائے فرات سے نکلتی ہے۔ اس کا پانی صاف اور خوشگوار ہے۔ یہ پانی کربلا اور کربلا سے ملحق آبادی کو سیراب کرتا ہے۔ اس نہر کو علقہ کہنے کی چند وجوہات ہیں۔  
☆ یہ ایک شخص کے نام سے موسوم ہے جس نے اس نہر کو کھودا تھا۔ کہتے ہیں کہ اس کو موسیٰ الدین علقمی کے جد نے کھودا تھا جب کہ خود موسیٰ الدین علقمی نے اس نہر کو تباہ کیا۔ موسیٰ الدین علقمی عباسی حکومت کے آخری خلیفہ مستعصم کا وزیر تھا۔ (فرہنگ عاشورا منتقل از موسوعات عتبات مقدسہ ج ۸ ص ۳۲)

لیکن اس کو علقمی کہنے کی یہ تو جیہ غلط ہے کیونکہ یہ نہر واقعہ کربلا سے بھی پہلے علقمی کے نام سے موجود تھی۔

صاحب کتاب ”بطل العلقمی“ لکھتے ہیں کہ نہیں معلوم کہ اس نہر کو کس نے کھودا تھا۔ شاید یہ بادشاہان کسری کے دور سے بھی پہلے موجود ہو۔ یہ نہر فرات کے بند ”ہندیہ“ (کہ جو میسب میں ہے) سے نکلتی ہوئی حضرت عباسؑ کی مرقد کے قریب سے گزرتی ہے۔ وہاں سے نیوا کے جنوب مشرق کی طرف ”برس“ نامی قریہ میں پہنچتی ہے اور وہاں سے ”خانہ نصف“ نامی منزل سے گزرتی ہوئی کوفہ پہنچتی ہے۔

☆ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ فرات کے شیریں اور خوشگوار پانی کی ضد میں اسے علقہ (یعنی کڑوا پانی) کہا جاتا ہے کیونکہ عرب میں ایک قاعدہ ہے کہ جب کوئی چیز اپنے حسن و خوبی کی وجہ سے حد سے بڑھ جائے تو اس کو اس کی ضد سے متعارف کیا جاتا ہے۔ مثلاً۔

خرمہ چونکہ بہت میٹھا جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ خرمہ کھاتے کھاتے منہ کھٹا ہو گیا۔

یا

دریائے نیل کہ جو دوسرے دریاؤں کے مقابلے میں بہت زیادہ صاف و شفاف ہے اسے

زرقا کہتے ہیں۔

یا

کوا کہ جس کی نگاہیں بہت تیز ہوتی ہیں اسے اعمور کہتے ہیں۔

یا

کنیز جو بہت حسین اور خوبصورت ہو اسے قبیحہ کہتے ہیں۔

اسی طرح

فرات کا صاف و شفاف اور خوشگوار پانی کہ جسے نومولود بچہ کو پلانے کے لئے تجویز کیا جاتا ہے اسے اس کی ضد میں علقمہ یعنی (تلخ پانی) کہا گیا۔

☆ لیکن بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ خیام اہل بیت سے پانی اتنے نزدیک ہوتے ہوئے بھی اولاد پیغمبر متشدد و پیاسی رہی اور فرزند رسول اپنے اعموان و انصار کے ساتھ بھوکے اور پیاسے شہید ہوئے اس لئے اسے علقمہ کہا گیا ہو۔

امام حسین کا کربلا میں ورود

امام حسین جب کوفہ کے اطراف میں واقع نینوا کے مقام پر پہنچے تو آپ نے دیکھا کہ ایک شترسوار جس کا نام مالک بن نصر تھا وہاں پہنچا۔ اس نے عبید اللہ ابن زیاد کی طرف سے ایک خط حرکودیا یہ خط پڑھ کر حرنے امام حسین کا راستہ روکا۔ امام نے فرمایا کہ ہمارے اور تمہارے درمیان یہ طے پایا تھا کہ ہم کوفہ میں اور قادیسیہ کے درمیان اس راستے پر اپنا سفر جاری رکھنے کی اجازت ہوگی جو نہ کوفہ جانا ہو اور نہ مدینہ۔ حرنے جواب دیا کہ ابھی ابھی مجھے حکم ملا ہے کہ میں آپ کو آگے نہ بڑھنے دوں اور آپ کو ایسی جگہ قیام کرنے پر مجبور کروں کہ آپ کے ساتھ کوئی نرمی نہیں برت سکتا اور آپ کو مزید سہولت نہیں دے سکتا۔

اس اثناء میں آپ کی سواری نے بھی آگے قدم بڑھانے سے انکار کیا۔ اس پر امام نے اپنے

اصحاب سے اس سرزمین کے نام کے بارے میں دریافت کیا تو زہیر نے کہا کہ اس سرزمین کا نام ”طف“ ہے۔ آپ نے پوچھا کہ کیا اس کا کوئی اور بھی نام ہے تو زہیر نے کہا کہ اسے کربلا بھی کہتے ہیں۔ امام کی سواری کا اس مقام پر رکنا اور آگے قدم بڑھانے سے انکار کرنا ایسا ہی تھا جیسا کہ پیغمبر اکرم کی سواری کا حدیبیہ کے مقام پر رکنا اور آگے قدم بڑھانے سے انکار کرنا ہجرت کے موقع پر آنحضرت کی سواری کا حضرت ابویوب انصاری کے دروازے پر آ کر رک جانا اور آگے قدم بڑھانے سے انکار کرنا۔ بہر حال امام نے جب یہ سنا کہ اس سرزمین کا نام ”کربلا“ ہے تو آپ نے فرمایا کہ ”ہم ہر کرب و بلا سے خدا کی پناہ مانگتے ہیں۔“ اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ ”ہم یہیں رکیں گے“ اور حکم دیا کہ ”سامان یہیں اتا رویا جائے۔“ جس دن آپ اس سرزمین پر پہنچے وہ ۲ محرم الحرام ۶۱ھ بدھ یا جمعرات کا دن تھا۔

آپ کے کربلا پہنچنے کے بعد جو واقعات اور حادثات پیش آئے وہ یہ ہیں۔

واقعات و حوادث کربلا

(۱)۔ آپ نے اپنے اہل بیت کو جمع کر کے ان کے چہروں پر نظر ڈالی اور درگاہ خدا میں مناجات کی کہ۔

”خدا وندا! ہم تیرے نبی کے اہل بیت ہیں، ہمیں ہمارے گھروں سے نکالا اور اپنے جد کے حرم سے جدا کیا گیا ہے۔ بنی امیہ نے ہم پر ظلم و ستم کیا ہے۔ پروردگارا! تو ہم کو ہمارا حق دلا اور ظالموں کے خلاف ہماری نصرت فرما۔“

(۲)۔ اس مناجات کے بعد آپ اپنے اصحاب کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ۔

”جو صورت حال ہمیں پیش آئی ہے وہ تم دیکھ رہے ہو۔ دنیا نے اپنی نیکیاں ہم پر بند کر دیں ہیں اور ہم سے اپنا منہ موڑ لیا ہے۔ اب اس زندگی میں کچھ باقی نہیں رہ گیا سوائے اس کے کہ جس طرح برتن کی تہہ میں کچھ تری باقی رہ جاتی ہے۔ اب جو کچھ ہے وہ ایسے ہی ہے جیسے کسی

قبر پر کچھ سبزہ اگ آیا ہو۔ کیا تم نہیں دیکھ رہے کہ حق پر عمل نہیں ہو رہا اور لوگ باطل سے باز نہیں آتے۔ ان حالات میں مومن کو چاہئے کہ وہ تقائیا لہی کی تمنا کرے۔ میں تو ان ظالمین کے ساتھ زندہ باقی رہنے کو ہلاکت سمجھتا ہوں اور موت کو سعادت۔ لوگ دنیا کے غلام بن چکے ہیں۔ دین ان کی زبان پر ایک لقلعہ سے زیادہ نہیں۔ دین ان کے پاس بس اسی وقت تک ہے جب تک ان کی زندگی کو کوئی خطرہ نہ ہو۔ جب بلائیں اور آزمائشیں ان کو گھیر لیں تو دین دار بہت کم رہ جاتے ہیں۔“

امام نے اپنے اس خطاب میں دنیا کے چہرہ پر پڑے ہوئے پردے کو ہٹا کر اپنے اہل بیت اور اصحاب کے سامنے جن حقائق کو پیش کیا ہے وہ یہ ہیں۔

☆ ہر مصیبت میں اور ہر حال میں بندے کو خدائے ذوالجلال کی قوت ہی سے پناہ مانگنا چاہئے کیونکہ اس کی ذات کے علاوہ کوئی پناہ اور بچا نہیں۔

☆ لوگوں کی دین داری دیانت داری اور مذہب سے اظہارِ محبت جو عام حالات میں نظر آتا ہے اس پر آنکھیں بند کر کے بھروسہ نہیں کر لینا چاہئے۔ کسی شخص کا حقیقی چہرہ اس وقت سامنے آتا ہے جب آزمائش کی چھلنی میں اسے چھانا جائے اور آزمائش اور ابتلا کی گھڑیاں اسے گھیر لیں۔

☆ انسان کی زندگی کی قدر و قیمت زندگی کے وسائل، آرائش اور آسائش کے سائے میں نہیں بلکہ اس کی قدر و قیمت حق کی سر بلندی میں ہے۔ اگر حق اور شریعت کی حکمرانی نہ ہو تو تمام آسائشوں اور لذتوں سے منہ موڑ کر مومن کو آخر کی اس ابدی سعادت کی طرف رخ کرنا چاہئے جس کا وعدہ خدا نے مومنین سے کیا ہے۔

امام کا خطبہ ختم ہوتے ہی زہیر ابن قین اپنی جگہ سے اٹھے اور کہا کہ ”فرزند رسول! ہم نے آپ کا فرمان سنا۔ اگر یہ دنیا ہمیشہ باقی رہنے والی بھی ہو یا خداوند عالم ہمارے لئے اسے ہمیشہ رہنے والی جگہ بھی بنا دے تب بھی ہم اس دنیا میں رہنے کے مقابلے میں آپ کے ہمراہ قیام

کرنے کو ترجیح دیں گے۔“

اس کے بعد نافع بن ہلال اٹھے اور کہا کہ ”فرزند رسول! آپ بہتر جانتے ہیں کہ آپ کے جد پیغمبرِ حتمی مرتبت کو یہ نصیب نہ ہوا کہ وہ اپنی محبت کا جام سب لوگوں کو پلا دیتے ان کے دلوں کو اپنی محبت سے بھر دیتے اور سب کو اس راہ پر گامزن کر سکتے جس پر وہ ان کو لانا چاہتے تھے۔ ان کے حلقہ میں وہ منافق بھی تھے جو نصرت کا وعدہ کرتے تھے اور اپنے اندر غدر اور بے وفائی کو چھپائے جائے تھے۔ انہی حالات میں خدانے آپ کے جد کو اپنی طرف بلا لیا۔ اسی طرح آپ کے پدر بزرگوار کو بھی ایسے ہی بے وفا ساتھیوں سے سابقہ پڑا جو مختلف بہانوں کا سہارا لے کر ان کے خلاف نبرد آزما ہوئے جب کہ ان کے بعض با وفا جانشینوں نے ان پر اپنی حقیر جانوں کو فدا کیا۔ آج آپ کو بھی ایسی ہی صورت حال درپیش ہے۔ فرزند رسول! جس نے عہد و پیمان اور بیعت کو توڑا وہ خسارے میں رہا اور اپنا نقصان آپ کیا۔ لیکن ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ شرق یا غرب جہاں بھی آپ جائیں گے ہم آپ کے ساتھ ہیں۔“

(۳)۔ کر بلا پہنچ کر آپ نے اپنے اہل بیت اور اپنے اصحاب کے خیموں کو نصب کرنے کے لئے کہا۔ آپ نے حضرت ابو الفضل العباسؑ کو حکم دیا کہ اہل بیت اطہار کے خیمے ایک نشیب میں نصب کئے جائیں تاکہ آپ کی حیات میں دشمن کی نظریں ان پر نہ پڑیں یا جنگ کے دوران شہادت کے لحاظ سے مناظر پر آپ کے اہل حرم کی نظریں نہ پڑیں۔

اس کے بعد خیام اہل بیت کے گرد نیم دائرے کی شکل میں بنی ہاشم کے جوانوں کے خیمے نصب کئے اور مرکزی خیمہ تلمہ نبیہ پر نصب کیا۔

بنی ہاشم کے خیموں کے بعد اپنے ان اصحاب کے خیموں کو نصب کیا گیا جو میدان جنگ کے تجربہ کار تھے تاکہ وہ اہل بیت کی حفاظت کر سکیں۔

غرض آپ نے اپنے اہل بیت اپنے اعوان و انصار اور خود اپنا خیمہ اس آیت کی تفسیر کے

تحت نصب فرمائے.....

”واحدینا الی موسیٰ و احمیہ ان توالقوا مکما: مصر بیوتا و اهلوا بیوتکم قبلتہ.....“

(۴)۔ کربلا پہنچتے ہی امام نے ایک خط اپنے بھائی محمد حنفیہ اور دیگر اہل خاندان کے نام تحریر فرمایا جس کا مضمون یہ تھا۔

”دنیا اب ہمارے لئے ختم ہو چکی ہے اور آخرت تیزی کے ساتھ ہماری طرف رخ کئے ہوئے ہے۔“

عریان بن ہشتم سے روایت

عریان بن ہشتم قبیلہ بنی اسد کا ایک فرد تھا وہ کہتا ہے کہ۔

”ہمارا گھر کربلا کے نزدیک تھا، مقتل کی طرف ہماری آمد و رفت رہتی تھی۔ وہاں بنی اسد کا ایک شخص مسلسل مقیم تھا۔ ایک دن میرے باپ نے اس سے پوچھا کہ تم ایک عرصہ سے یہاں مقیم ہو، یہاں کیا کرتے ہو؟ تو اس نے جواب دیا کہ میں نے سنا ہے کہ حسینؑ یہاں شہید ہوں گے، میں ان کا انتظار کر رہا ہوں تاکہ ان کے ساتھ میں بھی شہید ہو جاؤں۔“

چنانچہ یہ اسدی امام کے کربلا پہنچتے ہی ان کے لشکر میں شامل ہو گیا۔

عریان بن ہشتم کہتا ہے کہ۔

”امام حسینؑ کی شہادت کی خبر سننے کے بعد ہم مقتل میں یہ دیکھنے کے لئے گئے کہ وہ اسدی شہید ہوا یا نہیں تو معلوم ہوا کہ وہ شہید ہو چکا تھا۔“

انس بن حریش کا بلی صحابی پیغمبر کی شہادت

انس ابن حریش کا بلی پیغمبر اکرمؐ کے جلیل القدر صحابیوں میں تھے۔ انہوں نے پیغمبر سے یہ حدیث سنی تھی کہ۔

”میرا فرزند حسینؑ کربلا میں شہید ہوگا، تم میں سے جو بھی اسے دیکھے اس کی نصرت کرے۔“

پیغمبرؐ کا یہ جلیل القدر صحابی کربلا میں شہید ہوگا، تم میں سے جو بھی اسے دیکھے اس کی نصرت کرے۔“

پیغمبرؐ کا یہ جلیل القدر صحابی کربلا میں امام کے ساتھ شامل ہوا اور شہادت کی سعادت سے ہمکنار ہوا۔ ہرثمہ بن سلمہ کا فرار

ہرثمہ بن سلمہ عمر سعد کے لشکر میں شامل تھا، لشکر کے ساتھ جب یہ کربلا پہنچا تو بیس سال پہلے جنگ صفین کا ایک واقعہ اسے یاد آیا کہ صفین جاتے ہوئے امیر المؤمنین علیؑ علیہ السلام جب کربلا پہنچے تو آپؑ نے یہاں ایک درخت کے نیچے نماز پڑھی۔ نماز پڑھنے کے بعد ایک مٹھی مٹی آپؑ نے اٹھائی، اسے سوگھا اور فرمایا کہ۔

”اے مٹی! افسوس کہ ایک قوم کے تمام افراد کا خون اس سر زمین پر بہ لایا جائے گا، وہ قتل کر دیئے جائیں گے اور وہ سب کے سب بغیر حساب جنت میں داخل ہوں گے۔“

یہ واقعہ یاد آتے ہی ہرثمہ امام حسینؑ کے قریب آیا اور یہ واقعہ آپؑ کو سنایا۔ امام نے اس سے فرمایا کہ ”اچھا! اب تم بتاؤ کہ تم میرا ساتھ دو گے یا تم میرے خلاف ہو۔“ ہرثمہ نے جواب دیا کہ۔

”میں بچے چھوڑ کر آیا ہوں، میں نہ آپؑ کے ساتھ ہوں اور نہ آپؑ کے خلاف۔“

یہ سن کر امام نے اس کو نصیحت کی کہ۔

”تم جلد سے جلد یہاں سے نکل کر اتنی دور چلے جاؤ کہ میری صدائے استغاثہ تم تک نہ پہنچے۔ ورنہ جو بھی ہمارے استغاثہ کی آواز سنے گا اور ہماری مدد کو نہیں آئے گا خداوند عالم اسے اصل جہنم کرے گا۔“

ہرثمہ یہ سن کر وہاں سے فرار ہو گیا۔ بعد میں اس نے امام کی شہادت کی خبر سنی۔

حبیب ابن مظاہر کی ناکامی

امام حسینؑ کے باوفا شیدائی حبیب ابن مظاہر دیکھ رہے تھے کہ ۶ محرم سے عمر ابن سعد کے لشکر میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ دشمن کے لشکر میں بڑھتی ہوئی تعداد کو دیکھ کر یہ مردِ فقیہ امامؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ:

”اے فرزندِ رسول! یہاں نزدیک میں ہی قبیلہ بنی اسد رہتا ہے اگر آپؑ اجازت دیں تو میں ان کے پاس جا کر آپؑ کے لئے ان سے نصرت طلب کروں شاید وہ آپؑ کی نصرت کے لئے آمادہ ہو جائیں۔“

”میں بھی اسدی ہوں اور میں تمہارے لئے ایک ایسی سعادت کا تحفہ لے کر آیا ہوں جو کسی قبیلہ کا فرد اپنے قبیلے کے لئے لاسکتا ہے۔ میں تمہیں فرزندِ رسول حسینؑ ابن علیؑ کی نصرت کرنے کی دعوت دینے آیا ہوں۔ حسینؑ اس وقت ایک مختصر لیکن ایسے مومنین کے گروہ کے درمیان ہیں کہ جس کا ہر فرد ہزار افراد سے بہتر ہے یہ وہ مومنین ہیں جو ہرگز ہرگز امامؑ کو تنہا اور دشمن کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑیں گے۔ عمر سعد نے حسینؑ کا محاصرہ کیا ہوا ہے۔ تم لوگ میرے قبیلے کے آدمی ہو۔ مجھے امید ہے کہ تم میری دعوت قبول کرتے ہوئے امامؑ کی نصرت کے لئے نکل کھڑے ہو گے۔ اگر تم ان کی نصرت کے لئے نکلے تو دنیا و آخرت کی نیکی اور سعادت سے ہمکنار ہو گے۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ امامؑ کی نصرت میں جو قتل ہوگا وہ نواسہ رسولؐ کے ساتھ خلدِ بریں میں پیغمبرؐ کا ہمسایہ ہوگا۔“

جیسے ہی حبیب ابن مظاہر کا خطبہ ختم ہوا عبداللہ ابن بشر نامی شخص اپنی جگہ سے اٹھا اور کہا کہ:

”سب سے پہلا شخص میں ہوں جو اس دعوت کو قبول کرتا ہوں۔ میری قوم جانتی ہے کہ میں ایک دلیر اور شجاع شخص ہوں اور ایک سوائے ہوئے شیر کی مانند ہوں۔ یاد رکھو! جب بھی کوئی قوم جہاد سے پیچھے ہٹتی ہے تو دشمن اسے آ کر گھیر لیتا ہے۔“

اس کے بعد قبیلہ بنی اسد کے لوگوں نے یکے بعد دیگرے حبیب کی دعوت کو قبول کیا اور اس

طرح نوے (۹۰) افراد امامؑ کی نصرت کے لئے خیام امام حسینؑ کی طرف روانہ ہوئے۔ لیکن اسی وقت اسی قبیلہ کے کسی شخص نے عمر سعد کو اس بات کی اطلاع دے دی۔ چنانچہ اس نے ارزق نامی شخص کی قیادت میں چار سو سواروں کو قبیلہ بنی اسد کی طرف روانہ کیا۔ ہر فرات کے کنارے پر دونوں کا تصادم ہوا۔ حبیب ابن مظاہر نے ارزق کو انکارا اور کہا کہ ”ہمارے راستے سے ہٹ جا اور یہاں سے چلا جا اور اپنی جگہ کسی اور کو مقابلے کے لئے بھیج۔“

لیکن اسی عرصے میں قبیلہ بنی اسد کے لوگ عمر سعد کے لشکر سے خوفزدہ ہو کر اپنے قبیلے کی طرف واپس چلے گئے اور حبیب ابن مظاہر اپنی ناکامی پر افسوس کرتے ہوئے مایوسی کے ساتھ امامؑ کی خدمت میں واپس پلٹ آئے۔

کر بلا میں عمر ابن سعد کا وارو ہونا

عمر ابن سعد ۳۲ یا ۳۳ محرم الحرام ۶۱ھ کو اپنی کمان میں چار ہزار افراد کا لشکر لے کر بلا میں وارد ہوا۔ عمر ابن سعد اس چار ہزار کے لشکر کے علاوہ بعد میں پہنچنے والے تمام لشکروں کا بھی کمانڈر تھا۔ اس کے حسب نسب کے بارے میں جاننے کے لئے پہلے اس کے باپ سعد بن وقاص کی زندگی کا مطالعہ کرنا ضروری ہے اور یہ جاننے کے لئے کہ عمر سعد کو کن خصوصیات کی وجہ سے کر بلا کے خونخوار سانحہ کو وجود میں لانے کے لئے عبید اللہ ابن زیاد نے منتخب کیا۔ عمر سعد کی نفسیات کا مطالعہ کرنا ضروری ہے۔

پیغمبر اکرمؐ اور امیر المومنین حضرت علیؑ نے جب کر بلا کے ولد و زسانحہ کی اپنی حیات مبارکہ میں پیشین گوئی فرما کر اور بتایا کہ اس خونخوار المیہ کو وجود میں لانے والا شخص عمر ابن سعد ہوگا تو اس کے باپ سعد بن وقاص نے اسی وقت عمر سعد کو اپنی وراثت سے عاق کر دیا تھا۔ اس شخص کی ذہنیت شروع ہی سے ہمیشہ یہ رہی کہ یہ مقام و منصب کے حصول کے لئے پست سے پست تر کام کرنے اور حکمرانوں کے سامنے اپنے آپ کو ذلیل و حقیر انسان کی حیثیت سے پیش کرنے میں بھی

عالمسوں نہیں کرتا تھا۔ ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اپنی باطنی خباثت کا اظہار کرنے اور ہر جرم کا ارتکاب کرنے کے لئے اپنی آماجگی دکھانے میں پیش پیش رہتا تھا۔ حکمرانوں کی رضا اور خوشنودی کے لئے اگر اس کو کسی نیک نیک کام سے بھی دستبردار ہونا پڑتا تو یہ اس سے بھی فوری ہاتھ اٹھالیتا تھا تا کہ جرائم پیشہ حکمرانوں کو یہ یقین ہو جائے کہ یہ شخص ہر نیک خصلت سے عاری ہے اور ہر قبیح فعل کے لئے آمادہ رہتا ہے۔ اس کے برخلاف اس کا باپ سعد بن وقاص وہ شخص تھا جو حضرت پر سب و شتم کرنے کی منحوس اور قبیح فعل پر معاویہ کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے اس کی مجلس چھوڑ کر نکل آیا اور کسی قسم کا عہدہ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ لیکن اس کا یہ ماخلف بیٹا عمر سعد وہ شخص ہے جس نے کوفہ کے گورنر نعمان بن بشیر کی شکایت پر بید سے کی کہ اس نے حضرت مسلم بن عقیل کی کوفہ میں سرگرمیوں کے خلاف کوتاہی سستی اور نااہلی کا ثبوت دیا ہے۔ حضرت مسلم بن عقیل کو گرفتار کر کے جب دارالامارہ لایا گیا اور ان کو قتل کرنے کا حکم دیا گیا تو انہوں نے عمر سعد کو قریشی ہونے کے ماتے اور اس سے صلہ رحمی کا پاس رکھنے کی امید میں اس کو وصیت کرنا چاہی تو اس نے ان کی سننے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ جب تک والی کوفہ عبید اللہ ابن زیاد مجھے اجازت نہ دے میں وصیت سننے کے لئے تیار نہیں۔ جب عبید اللہ ابن زیاد نے اس کو حضرت مسلم کی وصیت سننے کی اجازت دی تو اس نے وصیت سننے کے بعد ان کی وصیت کو ابن زیاد کے سامنے فاش کر دیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ شخص تملق، چاپلوسی اور خوشامدی ہونے میں کس قدر آگے بڑھا ہوا تھا۔

عمر سعد کو منتخب کرنے کے اسباب

☆ عمر سعد کی طبیعت میں جاہ و منصب اور اقتدار کی ہوس اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ وہ اقتدار کے حصول کے لئے تمام اقدار اور ہر ارزش کی پامالی کو بیچ سمجھتا تھا۔ عبید اللہ ابن زیاد اس کی جاہ پسندی اور اس کے ہوس اقتدار کی فطرت کو خوب سمجھتا تھا۔ ابن زیاد یہ بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ

کہ عمر سعد اور شمر ذی الجوشن جیسے لعین افراد ہی اس کے لئے کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں جو اقتدار کے حصول کے لئے ہر جرم کا ارتکاب کر سکتے ہیں۔

☆ عمر سعد اس سعد بن وقاص کا بیٹا تھا جو اہل سنت کے بقول عشرہ مبشرہ میں ہونے کا شرف رکھتا تھا۔ خلافت سوم کے انتخاب کے موقع پر حضرت عمر کے تجویز کردہ خلافت کے چھ امیدواروں میں سے ایک امیدوار تھا۔ وہ فاتح عراق تھا اور فاتح عراق ہونے کے لحاظ سے اہل عراق کے نزدیک اس کا ایک نام اور مقام تھا۔ عمر سعد اپنی تمام تر خباثتوں کے باوجود اپنے باپ کے نام اور شہرت کی وجہ سے لوگوں میں ایک جانی پہچانی شخصیت تھا اور اس کے باپ کی خوبیوں کی وجہ سے اسے قدرے اچھی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ لہذا عبید اللہ ابن زیاد قتل حسین جیسے بھیا تک جرم کی سنگینی کو کم کرنے کے لئے اپنے ساتھ ایک ایسے شریک کار کو چاہتا تھا جو خود نہ سہی کم از کم اپنے باپ کے نام اور شہرت کی وجہ سے جانی پہچانی شخصیت ہو۔

☆ قتل حسین جیسے سنگین جرم کی ذمہ داری عبید اللہ ابن زیاد تنہا اپنے کندھوں پر نہیں اٹھانا چاہتا تھا اور اس جرم کے ارتکاب کے لئے ایک شریک جرم کی ضرورت محسوس کرتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ ڈرتا تھا کہ کبھی ایسی نوبت آجائے کہ اس سے اس خونِ ناحق کا انتقام لینے والا پیدا ہو جائے تو تنہا صرف وہ ہی مجرم قرار نہ پائے اس لئے وہ اس جرم کے لئے ایک شریک کار چاہتا تھا۔

چنانچہ اس کام کے لئے جب اس نے کوفہ کی آبادی پر نظر دوڑائی تو اس کی نظر انتخاب عمر سعد پر پڑی۔ لہذا اس نے عمر سعد کو دارالامارہ میں طلب کیا اور اس جرم کے ارتکاب کی ذمہ داری سنبھالنے کے لئے کہا۔ عمر سعد اگرچہ جاہ و منصب کے لالچ میں بڑے سے بڑا جرم کرنے کے لئے آمادہ رہتا تھا لیکن فرزند رسول اور ولید فاطمہ کو قتل کرنے کا جرم اتنا سنگین تھا کہ عمر سعد جیسا شقی بھی ایک مرتبہ بل کر رہ گیا اور پس و پیش کے بعد کہا کہ ”بہتر ہوتا کہ میرے بجائے یہ ذمہ داری آپ کسی اور کو سونپ دیں۔“ عبید اللہ ابن زیاد اس منحوس تجویز کو اس کے سامنے رکھنے کے بعد

بڑے غور سے اس کی حرکات و سکنات اور اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو دیکھ رہا تھا۔ ابن زیاد اس کی نفسیات کو اچھی طرح سمجھتا تھا، اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ عمر سعد کی پس و پیش اسی وقت تک ہے جب تک اس سے اس کے منصب کو چھیننے کی دھمکی نہ دی جائے۔ منصب کو ہاتھ سے نکلتا دیکھ کر وہ اپنی اس پس و پیش میں مستقل مزاجی نہ دکھاسکے گا۔ چنانچہ اس نے عمر سعد سے کہا کہ.....

”میں نے تم سے اس سلسلے میں مشورہ طلب نہیں کیا تھا کہ تم مجھے کسی اور کو ذمہ داری سپرد کرنے کا مشورہ دے رہے ہو۔ مجھے ”ہاں“ یا ”نہیں“ میں تمہارا قطعی فیصلہ چاہئے کہ آیا تم اس ذمہ داری کو سنبھالنے کے لئے تیار ہو یا نہیں؟“

اس پر عمر سعد نے ابن زیاد سے سوچنے کے لئے کچھ وقت اور مہلت طلب کی اور گھر واپس آ کر پہلے تو اپنے اہل خانہ اور عزیز و اقارب سے مشورہ کیا۔ چنانچہ کچھ نے اسے اس سیاہ جرم سے اپنا دامن بچانے کا مشورہ دیا جب کہ بعض نے آئے ہوئے اقتدار کو ہاتھ سے نہ جانے دینے کا مشورہ دیا۔ ان لوگوں سے مشورہ کرنے کے بعد تنہائی میں غور و فکر میں ڈوب گیا۔ ایک طرف اس کا نفس کہتا تھا کہ.....

”یہ موقع بار بار ہاتھ نہیں آئے گا۔ یہ کرسی اقتدار تیری تمام عمر کی آرزوں کا ثمر ہے۔ ابن زیاد کی پیش کش کو مت ٹھکرا اور اس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دے۔“

دوسری طرف اس کا ضمیر اس سے کہتا تھا کہ.....

”اپنے ہاتھوں کو حسین کے خون سے مت رنگ ورنہ تیری آخرت برباد ہو جائے گی، شقاوت ابدی مقدر بن جائے گا اور جہنم ہمیشہ کے لئے تیر ٹھکانہ ہوگا۔“

اس کشمکش اور کافی غور و خوض کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ فی الحال عبید اللہ ابن زیاد کی پیش کش کو قبول کر لیا جائے اور بعد میں کوئی ایسی درمیانی راہ نکالی جائے کہ منصب بھی ہاتھ سے نہ جائے اور خون حسین سے ہاتھ بھی نہ رنگیں۔ اس فیصلہ پر پہنچنے کے بعد وہ عبید اللہ ابن زیاد کے پاس گیا اور

رہی طور پر عہدہ سنبھال کر کربلا روانہ ہوا اور تیسری یا چوتھی محرم ۶۱ھ کو کربلا پہنچا۔

عبید اللہ ابن زیاد کا امام کے نام خط

کربلا پہنچنے کے بعد امام حسین کو عبید اللہ ابن زیاد کا ایک خط ملا جس میں لکھا تھا کہ۔

”مجھے خبر ملی ہے کہ آپ کربلا پہنچے ہیں۔ میرے بڑے بھائی نے مجھے خط لکھا ہے کہ میں اس وقت تک

نہ نرم فرش پر سوؤں گا اور نہ جی بھر کر شراب پیوؤں گا جب تک حسین کو خدائے لطیف و خبیر سے نہ ملا دوں (یعنی جب تک انہیں قتل نہ کر دوں) یا جب تک حسین میری اور میرے والی کی اطاعت تسلیم نہ کر لیں۔“

امام نے یہ خط پڑھ کر حقارت سے اسے زمین پر پھینک دیا اور فرمایا کہ۔ ”وہ قوم کبھی نجات نہیں پائے گی جو خالق کی رضا پر مخلوق کی رضا کو ترجیح دیتی ہے۔“ (حیات امام حسین باقر قرشی۔ ج ۳۔ ص ۱۰۲ نقل از تاریخ ابن عساکر۔ ج ۱۳۔ ص ۷۷، مقتل الحسین تالیف از محمد تقی بحر العلوم۔ ص ۲۶۵، مقتل خوارزمی، مقتل عوالم، لوائح الاشجان از سید محسن الامینی)

صلح کی کوشش

تاریخ، سیرت اور مقال کی کتابوں میں لکھا ہے کہ عمر سعد کے کربلا پہنچنے کے بعد ۷ محرم تک کبھی عمر سعد کی خواہش پر اور کبھی امام حسین کی دعوت پر صلح کے لئے مذاکرات کا سلسلہ جاری رہا۔ امام حسین کی طرف سے صلح کی کوشش کی منطق یہ تھی کہ مکہ سے نکلنے کے بعد یہاں پہنچنے تک عمر سعد کے لشکر کی کربلا آمد اور آپ کے محاصرے میں گھر جانے کے بعد کسی کامیابی کے حصول کے تمام امکانات اور احتمالات ختم ہو گئے تھے اس لئے آپ نے اسلام اور مسلمین کا مفاد اسی میں دیکھا کہ فی الحال تمام تر کوشش یہ کی جائے کہ کسی جنگی تصادم سے بچتے ہوئے خود کو اس محاصرے سے نکالا جائے اور پھر بعد میں نئے سرے سے کوئی لائحہ عمل تیار کیا جائے۔ اس مقصد کو مد نظر رکھتے ہوئے آپ نے عمر سعد کو مذاکرات کی میز پر آنے کی دعوت دی۔

جہاں تک عمر سعد کا تعلق ہے کہ وہ تو جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے چاہتا ہی یہ تھا کہ کوئی ایسی درمیانی راہ نکل آئے کہ منصب بھی اس کے ہاتھ سے نہ نکلے اور خونِ حسینؑ میں بھی اسے اپنے ہاتھ رنگنے نہ پڑیں۔ لہذا کربلا پہنچتے ہی اس نے مذاکرات کی راہ ہموار کرنے کی غرض سے اپنے لشکر کی کچھ ممتاز شخصیات کو امام حسینؑ سے باز پرس کے لئے مامور کیا۔ کچھ لوگوں نے عمر سعد کے اس حکم کی تعمیل کرنے سے یہ کہہ کر انکار کیا کہ ہمیں شرم دامن گیر ہے اور ہم حسینؑ سے یہ نہیں پوچھ سکتے کہ وہ یہاں کیوں آئے ہیں؟ کیونکہ ہم ہی ان کو یہاں بلانے والے ہیں۔ لیکن اس کے لشکر میں سے ایسے شقی افراد بھی باہر نکل کر سامنے آئے جنہوں نے اس ذمہ داری کو انجام دیا۔

بہر حال مذاکرات کا سلسلہ شروع ہوا اور عمر سعد کی طرف سے وہ خود اس کا بیٹا اور اس کا غلام تین افراد مذاکرات کے لئے نکلے۔ دہرا امام حسینؑ کی طرف سے خود امام قمر بنی ہاشم ابو الفضل العباسؑ اور حضرت علی اکبرؑ مذاکرات میں شریک ہوئے۔ مذاکرات کی ان چند نشستوں سے پہلی نشست کا ایجنڈا امام حسینؑ کی طرف سے تھا اور وہ یہ کہ آپ نے عمر سعد کو دعوت دی کہ۔

”عمر سعد! ان کو چھوڑ دو اور میرے ساتھ شامل ہو جاؤ۔“

امامؑ کی اس دعوت کے جواب میں عمر سعد نے کہا:

”کوفہ میں میرا گھر ہے وہ برباد ہو جائے گا۔“

امامؑ نے فرمایا:

”اس کے بدلے میں تمہیں گھر دوں گا۔“

اس نے کہا:

میری جائیداد ضبط ہو جائے گی۔“

امامؑ نے فرمایا:

”اس کا بدلہ بھی میں تمہیں دے دوں گا۔“

پھر اس نے کہا:

”میرے بال بچے کوفہ میں ہیں ان کی جان کے لئے خطرہ ہے۔“

اس پر امامؑ نے کچھ دیر خاموشی اختیار فرمائی اور پھر ناراضگی کے عالم میں کہا کہ۔۔۔۔۔

عمر سعد! تمہیں رے کی گندم کھانا نصیب نہیں ہوگا۔“

اس پر عمر سعد نے کہا کہ۔۔۔۔۔

میں جو پراکتفا کروں گا۔“

اس کے ساتھ ہی مذاکرات کی یہ نشست برخواست ہو گئی۔

اس کے بعد مذاکرات کی چند نشستیں اور ہوئیں جن کی رپورٹ عمر سعد نے عبید اللہ ابن زیاد کو روانہ کی۔ اپنی اس رپورٹ میں اس نے اپنی طرف سے کچھ تحریف اور اضافہ بھی کیا تا کہ قتلِ حسینؑ کے بھیا تک جرم سے بچنے کی کوئی درمیانی راہ نکل آئے۔ اس کی یہ رپورٹ تین نکات پر مشتمل تھی۔

اس نے لکھا کہ امام حسینؑ سے یہ طے پایا ہے کہ۔۔۔۔۔

☆ وہ کوفہ میں داخل نہیں ہوں گے، جنگ نہیں کریں گے اور واپس لوٹ جائیں گے۔

☆ حسینؑ اس بات پر رضامند ہو گئے ہیں کہ وہ یہاں سے کسی دوسرے علاقے میں چلے جائیں گے، وہاں سکونت اختیار کریں گے، بنی امیہ کی حکومت کے خلاف کوئی مزاحمت نہیں کریں گے اور رعایا کے ایک عام فرد کی حیثیت سے خاموش زندگی گزاریں گے۔

☆ حسینؑ اس بات پر آمادہ ہیں کہ وہ سیدھے یزید کے پاس جائیں اور اس کے ہاتھ پر بیعت کریں۔

عمر سعد کی رپورٹ کی دوسری اور تیسری شق اس کی خود اپنی اختراع تھی اور امام حسینؑ جیسی شخصیت کبھی ان دونوں شرائط کے لئے آمادہ نہیں ہو سکتی تھی۔

دوسری شق تو امام کے لئے اس لئے قابل قبول نہیں ہو سکتی تھی کہ یہ شق نہ صرف اصل تصور امامت کے خلاف ہے بلکہ بہت سی روایات اور قرآنی آیات کے بھی منافی ہے جن میں ظالمین کے ظلم پر سکوت اختیار کرنے والوں کی مذمت کی گئی ہے۔

اسی طرح تیسری شق عمر سعد نے اپنی طرف سے اضافہ کر کے لکھی تھی اور اس کا ثبوت امام حسین کے وہ کلمات اور آپ کے وہ خطبات ہیں جن میں آپ نے یہ فرمایا کہ.....

”ظالم کے ہاتھ پر بیعت کی ذلت اٹھانا ان ہستیوں کے لئے کسی صورت گوارا نہیں ہو سکتا جنہوں نے پاک و پاکیزہ جموں اور طاہر و مطہر صلبوں میں پرورش پائی ہو۔“

اس کے علاوہ شمر لعین نے عمر سعد کی امام حسین سے صلح کی تمام تجویزوں کو جب ابن زیاد سے مسترد کروا دیا تو عمر سعد نے شمر سے کہا کہ.....

”حسین کی رگوں میں علی کا خون ہے وہ ہرگز یزید کی بیعت نہیں کریں گے۔“

عمر سعد کا یہ جملہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ امام ہرگز اس شق پر رضامند نہیں ہو سکتے کہ وہ یزید کی بیعت کر لیں گے۔

البتہ عمر سعد کی رپورٹ کی یہ شق کہ ”حسین کو فنی میں داخل نہیں ہوں گے، جنگ نہیں کریں گے اور واپس لوٹ جائیں گے۔“ اپنی جگہ صحیح ہے اور اس کی تائید تو شقیہ زہیر ابن قین بریر ہمدانی، حبیب ابن مظاہر اور خود امام کے ان خطبات سے ہوتی ہے جو انہوں نے صبح عاشورا سے عصر عاشورا تک دینیچے اور لشکر عمر سعد کو مخاطب کر کے فرمایا کہ:

”اگر ہماری آمد سے تم لوگ خوش نہیں تو ہم یہاں سے واپس جانے کو تیار ہیں۔“

امام حسین کا تصادم سے گریز اور واپس لوٹ جانے پر آمادگی کا اظہار امیر المومنین حضرت علی اور امام حسن کی سیرت طیبہ کے عین مطابق ہے کہ انصار و اعوان کی ضروری تعداد اگر میسر نہ ہو تو جنگ اور تصادم سے گریز کرنا چاہئے۔

ہو سکتا ہے کہ عمر سعد نے اپنی رپورٹ میں یہ تحریف اور اضافہ خون حسین کے جرم سے اپنا دامن بچانے اور مسئلہ کے حل کے لئے ایک درمیانی راہ نکالنے کی غرض سے کیا ہوتا کہ اپنے اقتدار سے محروم ہونے سے بھی وہ بچ جائے۔

صلح کو ناکام بنانے میں شمر کا کردار

قریب تھا کہ عبید اللہ ابن زیاد اس رپورٹ کی روشنی میں عمر سعد کی پیش کردہ تجویز سے اتفاق کر لیتا اور عمر سعد اپنے مشن میں کامیاب ہو جاتا لیکن شمر لعین آڑے آیا اور اس نے اپنی جگہ سے اٹھ کر عبید اللہ ابن زیاد کے سامنے ان مذاکرات کے نتائج پر کھلی تنقید کی اور کہا کہ ”ہاتھ میں آئے ہوئے شکار کو چھوڑ دینا حماقت ہے۔“

شمر کون تھا؟

عمر سعد کی آرزوں پر پانی پھیرنے والے شمر کا کربلا کے خون المیہ میں کردار بیان کرنے سے پہلے ہم یہ بتانا چاہیں گے کہ یہ شمر کون تھا؟

اس کا اصل نام مشرجیل اور کنیت ابو سائبہ ہے۔ یہ بنی کلاب سے تعلق رکھتا تھا اور قبیلہ ہوازن کے رؤسا میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ ”دائرة المعارف فرید“، ”مستدرک سفینہ“، ”فرہنگ معین“ وغیرہ میں لکھا کہ ہے کہ یہ شخص مبروص تھا نہایت بد صورت اور بد سیرت شخص تھا۔ کوفہ میں اس کو بہادر اور جنگجو سمجھا جاتا تھا۔ اس کا باپ ذی الجوشن بھی بہادر اور جنگجو شخص تھا۔ اس کی جنگجویی اور بہادری ہی کی بنا پر فارس کے بادشاہ نے اس کو ایک سپر اعزاز میں دی تھی جس کی وجہ سے اسے ذی الجوشن (یعنی صاحب سپر) کہا جاتا تھا۔

ایک مرتبہ ذی الجوشن کی بیوی (یعنی شمر کی ماں) اپنے گھر سے بنی کندہ کی طرف نکلی راستے میں اس کو پیاس لگی تو ایک چرواہے سے اس نے پانی مانگا۔ چرواہا اس شرط پر اسے پانی پلانے پر آمادہ ہوا کہ وہ اس کی جنسی خواہش کو پورا کرے۔ ذی الجوشن کی بیوی نے پیاس پر غلبہ نہ پا کر خود کو اس

کے حوالے کر دیا۔ اس چہرہ کے فعل حرام کے نتیجے میں اس کے نطفے سے شہر لعین کا حمل اس کے رحم میں قرار پایا۔ عاشوراء کے دن امام حسین علیہ السلام اور زہیرا بن قین نے اسے مخاطب کر کے فرمایا کہ۔

”اے اس جانور کے بیٹے جو اپنے پیچھے کی جانب پیشاب کرتا ہے (یعنی چہرہ کی اولاد) تو اس قابل نہیں کہ تجھ سے بات کی جائے تو جہنم میں جلنے کا زیادہ مزا دار ہے۔“

شہر جنگ صفین میں حضرت علیؑ کے لشکر میں شامل تھا۔ اس جنگ میں اس نے بہادری بھی دکھائی اور کارنامے بھی انجام دیئے۔ جنگ صفین کے بعد وہ حضرت علیؑ سے منحرف ہو گیا۔ حجر بن عدی جیسے صحابی جلیل کے خلاف ان کے مفسد ہونے کی جن لوگوں نے گواہی دی ان میں شہر ابن ذی الجوشن بھی شامل تھا اس طرح حجر بن عدی کا پا ک اور طیب خون بہانے میں اس کا بھی ہاتھ تھا۔ کوفہ میں حضرت مسلم بن عقیل نے جب عبید اللہ ابن زیا د کا دارالامارہ میں محاصرہ کیا تو دارالامارہ کے اندر حضرت مسلم اور ان کی حسینی تحریک کے خلاف مہم چلانے والوں میں یہ پیش پیش تھا۔

کربلا میں عمر ابن سعد اور امام حسینؑ کے درمیان مذاکرات کے بعد جب عمر سعد نے اپنی رپورٹ اور صلح کی تجویز ابن زیا د کو بھیجی تو وہ اس کی تجویز پر عمل کرنے کے لئے تقریباً آمادہ ہو گیا تھا جس کے نتیجے میں جنگ کے شعلے سرد پڑنے کے قریب تھے کہ شہر لعین نے اس کی تجویز پر تنقید کرتے ہوئے اپنی ابلسی پھونکوں سے جنگ کے ان شعلوں کو پھر سے بھڑکا دیا اور ابن زیا د کو امام حسینؑ کے خلاف ایک ایسی فیصلہ کن جنگ کرنے کا مشورہ دیا جس کے نتیجے میں یا تو امام یزید کے سامنے سر تسلیم خم کر کے اس کی بیعت پر مجبور ہو جائیں یا آپؑ کا سر مقدس تن اطہر سے جدا ہو جائے۔ ابن زیا د نے اس معین کی تجویز پر عمل کرتے ہوئے چار ہزار کا لشکر اس کی کمان میں دے کر عمر سعد کے نام ایک خط دے کر کربلا روانہ کیا جس میں لکھا کہ ”یا تو حسینؑ کے ساتھ ایک فیصلہ کن جنگ کرو ورنہ لشکر اور اس کی کمان شہر کے حوالے کر دو۔“

شہر ۹ محرم ۶۱ھ کو کربلا پہنچا اور ابن زیا د کا خط عمر سعد کو دیا۔ عمر سعد نے خط پڑھ کر شہر سے مخاطب ہو کر کہا کہ.....

”خبیث انسان! یہ تو ہی ہے جس نے ابن زیا د کو میری تجویز پر عمل کرنے سے روکا ہے۔ لیکن یاد رکھو! حسینؑ کی رگوں میں علیؑ کا خون ہے وہ کبھی سر تسلیم خم نہیں کریں گے۔“

جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا عمر سعد کا یہ جملہ واضح کرتا ہے کہ اس نے اپنی رپورٹ میں یہ شق اپنی طرف سے اضافہ کر کے ابن زیا د کو روانہ کی تھی کہ ”حسینؑ یزید کے پاس خود جا کر بیعت کرنے کو تیار ہیں۔“ ورنہ امام حسینؑ کبھی بھی اس شرط کو قبول کرنے پر رضامند نہیں ہوئے۔

غرض شہر کے کربلا پہنچنے کے بعد اور اس کے ابلسی کارنامے کی وجہ سے صلح کی تمام امیدوں پر پانی پھر کیا صلح و مذاکرات کی کاوشیں دم توڑ گئیں اور نوبت ایک فیصلہ کن جنگ تک آ پہنچی۔ عمر سعد آخر کار کرسی اقتدار کے بت کے سامنے اپنی ازلی فطرت کی وجہ سے سجدہ ریز ہو گیا اور اعلان کیا کہ.....

”عبید اللہ ابن زیا د کے سامنے تم سب گواہ رہنا کہ فرزند رسول کو قتل کرنے اور اہل بیتؑ پتھر گھاگھرتاہ ویران کرنے والا پہلا شخص میں..... عمر ابن سعد بن وقاص ہوں۔“

خداوند عالم نے کائنات کی ہر چیز کی تخلیق پانی سے فرمائی۔ لیکن وہ کون سا پانی تھا یہ ایک الگ اور تحقیق طلب مسئلہ ہے۔ لیکن ہر ذی حیات کی تخلیق اور اس کی بقا و دوام کا دار و مدار پانی پر ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے کہ۔

”وَجعلنا من الماء کل شیء حی“

”ہم نے ہر چیز کو پانی سے حیات دی۔“ (سورہ انبیاء۔ آیت ۳۰)

نعمت الہی میں پانی ایک عظیم نعمت ہے ہر چیز کی بقا و دوام میں پانی مرکزی کردار رکھتا ہے۔

ہم اس عظیم نعمت کی فراوانی کی وجہ سے اس کا احساس نہیں رکھتے۔ اس نعمتِ خداوندی کی قدر و قیمت افاذیت اور اہمیت ان صحرائیوں اور خانہ بدوشوں سے پوچھنا چاہئے جو اس نعمت کی تلاش میں آئے دن اپنا مسکن بدلتے رہتے ہیں اور اس کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔

ایک مشہور واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ بادشاہِ روم نے معاویہ کے دورِ خلافت میں اس کو اپنے خط کے ساتھ ایک شیشی بھیجی اور اس سے فرانس کی کہ دنیا کی ہر چیز اس شیشی میں بند کر کے اسے روانہ کرے۔ معاویہ اس عجیب و غریب فرمائش پر حیران و پریشان ہو گیا۔ آخر کار اس معمر کے حل کے لئے یکا یک اس کے ذہن میں حلال مشکلات علی ابن ابی طالب کے شاگرد حضرت عبداللہ ابن عباس کا نام آیا۔ چنانچہ اس نے اس معمر کو ابن عباس کے سامنے رکھا۔ انہوں نے معاویہ کو جواب دیا کہ شیشی میں پانی بھر کر بھیج دو۔

حضرت امام صادق علیہ السلام سے کسی نے پوچھا کہ ”پانی میں کیا مزہ ہے؟“ آپ نے فرمایا کہ ”پانی میں لذتِ حیات ہے۔“ چنانچہ روایات میں ہے کہ بہترین عمل کسی کو پانی فراہم کرنا اور پانی پلانا ہے۔ اور چونکہ کسی کو پانی پیش کرنا احسان ہے اس لئے روایت میں ہے کہ اگر کوئی پانی پیش کرے تو اسے قبول کرنا چاہئے چاہے ایک ہی گھونٹ اپنے کیوں کہ احسان کو رد کرنا گدھے کی خصوصیات میں سے ہے۔“ قرآن کریم میں حاجیوں کو پانی پلانے کی فضیلت کا ذکر ہے۔

جنگِ صفین میں معاویہ کے لشکر نے جب فرات پر قبضہ کر لیا تو معاویہ نے حضرت علی کے لشکر پر پانی بند کر دیا۔ میرالمؤمنین امام علی نے اپنے لشکر سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ ”اگر تم باعزت اور بافضیلت زندگی چاہتے ہو اور پانی سے سیراب ہونا چاہتے ہو تو پہلے اپنی تلواروں کو دشمن کے خون سے سیراب کر لو۔“ اس طرح آپ نے پانی کے حصول کے لئے جنگ کو ایک بافضیلت جنگ قرار دیا ہے جس سے پانی کی اہمیت اور افاذیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ لیکن جب جناب امیر نے صفین کی جنگ میں فرات پر قبضہ کر لیا اور آپ کے لشکر نے معاویہ کے لشکر پر پانی

بند کرنے کا مشورہ دیا تو آپ نے اس تجویز کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ.....

”خداوند عالم کی یہ نعمت تمام مخلوقات مومن و منافق، مسلم و کافر سب کے لئے مباح ہے اور اس پر بلا تفریق و امتیاز سب کا حق ہے۔“

چنانچہ خداوند عالم کی اس عظیم نعمت پر ہر ذی حیات کے مساوی حقوق ہیں۔ اگر کوئی شخص کسی کو اس حق سے محروم کرے یا اس سے یہ حق چھینے تو وہ نہ صرف شریعتِ اسلام سے بلکہ دائرہٴ انسانیت سے بھی خارج ہے۔ چاہے وہ عالم ہو، عارف ہو، زاہد ہو یا کسی بڑی سے بڑی شخصیت کا مالک حتیٰ خلیفہ مسلمین کا لقب رکھنے والا ہی کیوں نہ ہو۔

پانی اور کربلا

چنانچہ بنی امیہ عبید اللہ ابن زیاد و عمر سعد اور اس کے لشکر کی شقاوتِ قلبی کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ انہوں نے کافر نہیں، مشرک نہیں، منافق نہیں، عام انسان نہیں بلکہ اس ”حسین“ پر پانی بند کیا جو جگر گوشہ بتول اور فرزندِ رسول ہے۔ وہ حسین کہ جس کی عظمت اور جس کی مادر گرامی کی عظمت کے اصحابِ رسول ہی نہیں بلکہ وہ لوگ بھی قائل تھے جو ان کو اور ان کے اصحابِ با وفا کو قتل کرنے کے لئے کربلا میں اکھٹا ہوئے تھے۔

فرزندِ پیغمبر اور ان کے اہل بیت اور احوان و انصار پر پانی بند کرنا تاریخِ انسانیت میں بنی امیہ کا ایسا گھاؤنا جرم ہے جس کی جتنی مذمت کی جائے اور اس سے جتنی نفرت اور بیزاری کی جائے کم ہے۔ چنانچہ ائمہ اطہار نے ”حسین“ کی حقانیت اور مظلومیت کو زندہ رکھنے کے لئے اپنے شیعوں کو ناکید فرمائی کہ جب بھی پانی پیتو ”حسین“ کی پیاس کو یاد رکھنا کہ جہاں عالمِ مظلومیت میں قیام و انقلاب حسین کی یاد تازہ ہو جائے وہاں ساتھ ساتھ بنی امیہ کے اس مکروہ عمل سے نفرت و بیزاری کا بھی کھل کر اظہار ہوتا کہ آئندہ آنے والی نسلیں پانی جیسی نعمت سے بنی نوع انسان کو محروم کرنے کے گھناؤنے جرم سے اپنے دامن کو بچائیں۔

امام حسینؑ اور آپ کے اہل بیت اور نصراء و اعدا پر یزیدی لشکر کے پانی بند کرنے کے جرم کو تمام تاریخ اور مقال نے ذکر کیا ہے اور معتبر اسناد سے نقل کیا ہے۔ کسی کو بھی اس سے انکار نہیں اگرچہ واقعہ کی کیفیت اور پانی بند کرنے کی تاریخ کے آغاز میں اختلاف ہے۔ تاریخ و مقال کے اس اختلاف کو زندہ بھی رہنا چاہئے تاکہ اس پر بحث و تحقیق کا دروازہ کھلا رہے۔ تاریخ و مقال کے ان اختلافات کو علمی اور سائنسی بنیادوں پر حل کرنا چاہئے۔

کربلا میں پانی کے مسئلہ کو افراط و تفریط اور غلو کی نذر کرنے کی بجائے اس مسئلہ پر تاریخ و مقال کے اختلافات کو علمی اور سائنسی بنیادوں پر حل کرنا چاہئے اس لئے ضروری ہے کہ واقعات کی تحلیل و تفسیر کو ان پڑھ عوام کے تسلط سے نکال کر دانشور، مفکرین، مفسرین اور علماء کے حوالے کیا جائے تاکہ دیگر اجتماعی، سیاسی، سائنسی، اخلاقی، عقیدتی اور فقہی مسائل کی طرح تحلیل و تحقیق کے بعد حقیقت تک پہنچا جا سکے واقعہ کربلا اور امام حسینؑ کا قیام مقدس اپنی گیرائی اور گہرائی کے لحاظ سے ایک ہمہ گیر مسئلہ ہے اور دین کی بقا کا ضامن ہے۔ اس کے مسائل کو ان پڑھ عوام یا ان نام نہاد دانشوروں کے حوالے کرنا خطرے سے خالی نہیں جو عوامی مرجعیت کے مقلد اور معتقد ہیں جن میں فاسق، ہمارے مخلص مومنین اور عاشقانِ امام حسینؑ اپنی سادگی اور کم علمی کی وجہ سے ان مفاد پرستوں کے جال میں آجاتے ہیں اور ان کے باطنی عزائم تک پہنچنے سے عاجز اور قاصر ہیں۔ علمی، فقہی، تاریخی اور عقیدتی مسائل کو ان دنیا پرست اور زر پرست خود ساختہ دانشوروں کے رحم و کرم پر چھوڑنا خطرے سے خالی نہیں کیونکہ یہ اپنے مخصوص عزائم رکھتے ہیں۔

یوم غدیر کہ جس دن پیغمبر اکرمؐ نے عالم انسانیت کی فلاح و نجات اور اس کے بقاء و دوام کے لئے ایک لائحہ عمل دیا تھا، آئندہ آنے والی نسلوں کی رہنمائی کے لئے ان کے ہاتھوں میں ایک روشن مشعل یہ کہہ کر دی تھی کہ ”دیکھو! جس طرح میری قیادت تمہاری فلاح و بہبود کی ضامن ہے اسی طرح میرے بعد اس ”علیؑ“ کی قیادت تمہیں کامرانی و کامیابی کے ساحلوں سے ہمکنار کرے

گی۔

”من کنت مولا فہذا علی مولا“

لیکن پیغمبرؐ کی اس روشن مشعل کو اہل ستیفہ نے تو پس پشت ڈالا ہی لیکن آج ہمارے یہ کم علم لوگ بھی علیؑ کی شان میں ترنم سے قصائد پڑھنے میں لگن ہیں اور غدیر میں پیغمبرؐ کی چھوڑی ہوئی مشعل کو پھر سے روشن کرنے کی بجائے اصل روح غدیر کو شعر و شاعری اور فنِ سخنوری کے لئے تختہ مشق بنائے ہوئے ہیں۔ آج روح غدیر کو زندہ کرنے کی ضرورت ہے یا قصائد اور ان کے ترنم کی ایون میں قوم کو سلا دینے کی؟ یہی وجہ ہے کہ کسی نے یوم غدیر پر معصوم کو مبارکباد پیش کی تو معصوم نے فرمایا کہ۔

”کیا عاشورا کی بعد بھی ہمارے لئے کوئی عید رہ گئی ہے۔“

آج ”دارش غدیر (عج)“ ہماری نگاہوں سے اور جھل ہے۔ نہیں معلوم زہراءؑ کا یہ دل بند کن

بیانوں میں ہمارے حال پر نوحہ کناں ہے؟

یہ مفاد پرست وہی لوگ تو ہیں کہ جنہوں نے فدک کے غصب کئے جانے ہی کو زہراءؑ مرضیہ سلام اللہ علیہا کی مظلومیت کا محور بنا کر معصوم کے اصل ہدف یعنی غصبِ خلافت کے خلاف ان کے احتجاج کو پس پشت ڈال دیا۔ ورنہ مطالبہ ”فدک“ تو اہل ستیفہ کی اس سازش کو بے نقاب کرنے کا ایک بہانہ اور وسیلہ تھا جو انہوں نے پیغمبرؐ کی وصیت کی صریحی خلاف ورزی کرتے ہوئے خلافت کا رخ اس کے صحیح مرکز سے موڑ کر اہل قیادت کی طرف کر کے امتِ مسلمہ کو ایسے مصائب سے دوچار کر دیا جس کا خمیازہ آج تک امت بھگت رہی ہے۔ اہل ستیفہ کا ابو الحسنؑ سے منہ موڑ کر غلط اور نا اہل ہاتھوں میں قیادت دینا کل ایک سازش تھی اور زہراءؑ مرضیہ کی اصل مصیبت کو درک نہ کرنا اور غصبِ فدک ہی کو ان کی مصیبت کا اصل مرکز و محور بنانا بھی آج ایک سازش ہے جس کا شکار ہمارے سادہ لوح عوام بن رہے ہیں۔ بالکل اسی طرح یزید اور بنی امیہ

کے تمام جرائم کو پس پشت ڈال کر پانی ہی کے مسئلہ کو مرکز و محور بنانا اور اس میں افراط و تفریط سے کام لینا ان کے جرائم پر پردہ ڈالنا ایک اور سازش ہے۔

امام حسینؑ کی اصل مصیبت بھوک و پیاس نہیں بلکہ اسلام کی قیادت کا فاسد ہاتھوں میں جانا اور خلافت کو موڑی بنا نا ہے۔ پانی کی قلت یا تین دن تک اہل بیتؑ اور انصارِ حسینؑ کی مسلسل تشنگی سے حسینؑ اگر آپ کو اور آپ کے انصار و اعوان کو دافرقتدار میں پانی فراہم کر دیتے تب بھی ان کے جرم و جنایت پر کوئی پردہ نہیں پڑ سکتا۔ اگر وہ پوری ہر فرات کو بھی آپ کے حوالے کر دیتے تب بھی امام اپنے قیام و انقلاب اور مبارزے سے دستبردار نہیں ہوتے۔

کر بلا میں پانی کی موجودگی یا عدم موجودگی یا کمیابی کے سلسلے میں ہم یہاں ایک تاریخی جائزہ پیش کرنا چاہیں گے۔

اس سلسلے میں دو حقیقتیں اپنی جگہ مسلم ہیں جن سے کسی کو انکار نہیں۔ تاریخ اور مقابل بھی قدیم دور سے لے کر آج تک ان دونوں حقیقتوں کی تائید کرتے ہیں۔

پہلی حقیقت

پہلی حقیقت یہ کہ امام حسینؑ اور ان کے انصار و اعوان پر یزیدی لشکر نے پانی بند کیا۔ چنانچہ۔

☆ پہلے ہی ان سے عبید اللہ ابن زیاد نے اپنے لشکر کے ہراول دستے کے قائد حرا بن یزید ریاحی کو حکم دیا اور خط لکھا کہ۔

”حسینؑ ابن علیؑ کا ایک ایسی جگہ محاصرہ کرو جو بے آب و گیاہ ہو جہاں نہ سبزہ ہو اور نہ پانی۔“

☆ دوسرا حکم نامہ اس نے عمر سعد کے نام اس وقت روانہ کیا جب اس نے سنا کہ امام حسینؑ کے اصحاب مشکوں کے ذریعہ ہر فرات سے با آسانی پانی لے جاتے ہیں۔ یہ حکم نامہ عمر سعد کو ۷ محرم ۶۰ھ کو ملا اور اس میں لکھا تھا کہ۔

”جب میرا یہ خط تمہیں ملے تو حسینؑ سے کہنا کہ وہ ہماری حکومت کو تسلیم کریں ورنہ ان پر فرات

کا پانی بند کر دو۔ بالتحقیق یہ پانی میں یہود و نصاریٰ کے لئے حلال قرار دیتا ہوں اور حسینؑ پر حرام۔“  
یہ حکم نامہ ملتے ہی عمر ابن سعد نے چار ہزار کا لشکر عمر ابن حجاج یا حجاج بن ابجر کی قیادت میں فرات پر متعین کیا اور امام حسینؑ پر پانی بند کیا۔

دوسری حقیقت بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ صبح عاشوراء سے امام حسینؑ کی شہادت تک آپ کے تمام ساتھی، چھوٹے بڑے، جوان بوڑھے، مرد و عورتیں سب کے سب تشنگی کے عالم سے گزرے۔ اس روز کی تشنگی کا اندازہ ان خصوصیات سے لگایا جاسکتا ہے جو غور طلب ہیں۔

☆ پانی کا کلی فقدان بذات خود تشنگی میں اضافے کا سبب بنتا ہے۔

☆ موسم گرما کی چلچلاتی دھوپ اس تشنگی میں مزید اضافہ کرتی ہے۔

☆ اس پیاس کے عالم سے اگر چھوٹے بچے خصوصاً طفل شیر خوار بھی گزر رہے ہوں تو یہ مصیبت قیامت برپا کر دیتی ہے کیونکہ بوڑھے اور عمر رسیدہ کتنے ہی پیاسے ہوں وہ پھر اپنی پیاس پر صبر کر سکتے ہیں خصوصاً چھوٹے بچوں کی پیاس دیکھ کر وہ اپنی پیاس بھول جاتے ہیں اور اپنی پیاس کا اظہار نہیں کرتے۔

☆ لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ مسلمہ کہ کر بلا کے میدان میں بچوں سے زیادہ بڑوں پر تشنگی کا غلبہ تھا کیونکہ بچے پھر خیمہ کے سایوں میں تھے جب کہ بڑوں کو دھوپ کی تپش کا بھی سامنا تھا۔ اس کے علاوہ ان کے جسم تیر، تلو اور نیزوں سے زخمی تھے اور زخموں سے خون نکلنے کی وجہ سے ان کی پیاس میں مزید شدت ہو گئی تھی۔ اس عالم میں پیاس کی شدت کا اندازہ وہ لگا سکتے ہیں جنہوں نے قریب سے حسینؑ کے ۲۷-۲۶ سال جوان فرزند محمد بن یحییٰ علی اکبر کی پیاس کو دیکھا ہو اور اس عالم میں دیکھا ہو کہ حسینؑ کا یہ جوان رشید زخموں سے چور ہو کر باپ کی خدمت میں پلٹتا ہے اور باپ سے ایک قطرہ آب کا سوال کرتا ہے۔

☆ اس روز کی تشنگی کا اندازہ اگر لگانا ہو تو زین العابدین سید الساجدین امام علی ابن الحسینؑ کے

مسلسل چالیس سالہ احتجاج پر نظر ڈالیں کہ کس طرح ہر موقع پر آپ نے اپنے پدربزرگوار کی پیاس کو اجاگر کیا اور فرمایا کہ۔

”قتل ابی عطشانا“

بہر حال عبید اللہ ابن زیا وکامام اور ان کے اصحاب پر پانی بند کرنا اور امام اور ان کے انصار کا پیاس کے عالم میں شہید ہونا دونوں اپنی جگہ مسلمہ حقیقتیں ہیں۔ لیکن ان دونوں حقیقتوں کے درمیان کچھ اور بھی حقائق ہیں جو تاریخ میں ہیں اور مقابل میں نقل ہوئے ہیں اور ان حقائق کو نہ تو یکسر نظر انداز کیا جاسکتا ہے اور نہ انہیں تاریخ اور مقابل سے نکالا جاسکتا ہے۔ واقعات کر بلاتا تاریخ کی روشنی میں تجزیہ و تحلیل کرنا اس لئے ضروری ہے کہ امام حسینؑ کا یہ مقدس قیام بقائے دین کی ضمانت ہے اور اسے افراط و تفریط محفوظ رکھنا چاہئے۔

چنانچہ مندرجہ ذیل حقائق بھی تاریخ کا ایک حصہ ہیں۔

☆ ساتویں محرم کو ہر فرات پر دشمن کا لشکر متعین ہونے کے بعد جب اصحاب حسینؑ کے لئے فرات سے پانی حاصل کرنا مشکل ہو گیا اور امام حسینؑ اور ان کے اہل بیتؑ پر تشنگی کی شدت بڑھ گئی تو انہوں نے خیام اہل بیتؑ سے قبلہ کی طرف انیس قدم کے فاصلے پر ایک کنواں کھودا اور اس سے ٹٹھا پانی برآمد ہوا جس سے امام حسینؑ اور ان کے اہل بیتؑ اپنی پانی کی ضروریات پوری کرتے تھے۔ البتہ یہ پانی کب تک چلا اور کنواں کب خشک ہو گیا اس کا ذکر تاریخ میں نہیں ملتا۔ (حیات امام حسینؑ باقر قرشی۔ ج ۳۔ ص ۴۰ نقل از مقتل خوارزمی غنوة البلدان بعیة النبلاء، مقتل الحسین بحر العلوم۔ ص ۲۳ نقل از مقتل کوارزمی، مقتل عوالم بحار الانوار۔ ج ۴۴۔ ص ۳۳۸)

☆ ۷ محرم سے ۱۰ محرم تک تین دن کی درمیانی راتوں میں ایک مرتبہ یا چند مرتبہ حضرت ابوالفضل العباسؑ کی معیت میں تیس جاٹا ران حسینؑ مشک لے کر نہر علقمہ پر گئے ان میں سے ایک گروہ نہر پر متعین لشکر سے نبرد آ رہا ہوا اور دوسرے گروہ نے مشکوں میں پانی بھرا اور یہ سب کے سب پانی

لے کر صحیح و سالم خمیوں تک واپس آئے۔ اسی وجہ سے حضرت عباسؑ کو سقہ کا لقب ملا کہ وہ اپنی جان کی بازی لگا کر اہل بیتؑ کے لئے پانی لایا کرتے تھے ورنہ عام حالات میں پانی لانا حضرت عباسؑ کے لئے اس لقب کا سبب نہیں بنتا، عاشورا کے دن آپؑ پانی نہ لاسکے یہ بات مسلم ہے لہذا حضرت عباسؑ کو سقہ کا لقب دینا بتاتا ہے کہ آپؑ غیر معمولی حالات میں پانی لائے۔

☆ شب عاشورا امام حسینؑ اور آپؑ کے چند اصحاب نے غسل شہادت کیا۔ (حیات امام حسینؑ باقر قرشی۔ ج ۳۔ ص ۸ نقل از انساب الاشراف)

☆ امام حسینؑ علیہ السلام نے عقیلہ قریش حضرت زینب کبریٰؑ کو جب آنے والے دنوں کے حالات اور مصیبت سے آگاہ کیا اور اپنی شہادت اور اہل بیتؑ کی اسیری پر صبر کرنے کی تلقین فرمائی تو زینب سلام اللہ علیہا غش ہو کر گر گئیں تو امامؑ نے ان کے چہرہ پر پانی چھڑکا۔

☆ بعض مقابل کے مطابق شب عاشور حضرت عباسؑ اور بعض کے مطابق حضرت علی اکبرؑ پانی لائے (مقتل بحر العلوم۔ ص ۲۸۳ مالی شیخ صدوق)

بحر حال ان تین دنوں میں کنویں کھودنا اور ہر فرات سے پانی لانا تاریخ و مقابل میں نقل ہوا ہے۔ ان حقائق سے انکار کر کے پانی کی یکسر قلت یا تین دن تک امام حسینؑ علیہ السلام اور ان کے اہل بیتؑ کی مسلسل پیاس کا میسر ہونا ثابت ہونے سے بنی امیہ کے جرم و جنایت میں کوئی کمی آجاتی ہے۔ امام حسینؑ علیہ السلام اور ان کے انصار بھوک و پیاس کے عالم میں نہیں، سیرابی کے عالم میں بھی اگر شہید ہوئے ہوتے تب بھی ان کی شہادت کی عظمت میں ذرہ بھر کمی نہیں آتی۔

پانی بند کرنے کی وجہ

عمر ابن سعد کے لشکر نے یوں تو امام حسینؑ کا چاروں طرف سے محاصرہ کیا ہوا تھا تا کہ نہ تو باہر سے آپؑ کو کوئی مدد پہنچ سکے اور نہ ہی آپؑ کا کوئی قاصد خیام حسینی سے کوئی پیغام لے کر باہر جاسکے۔ پھر بھی دشمن کو یہ خطرہ تھا کہ ہر فرات کی طرف سے کوئی شخص امام حسینؑ سے آ کر نمل جائے۔ چنانچہ

آپ کے کچھ جانثار اسی راستے سے فرات عبور کر کے آپ کے لشکر میں شامل ہوئے۔ اس کے علاوہ بھی آپ پر اور آپ کے اہل بیت اور انصار و اعوان پر پانی بند کرنے کے پیچھے یزیدی لشکر کے کچھ اہم مقاصد تھے۔

☆ وہ چاہتے تھے کہ پانی بند کر کے وہ امام حسین اور ان کے لشکر کو تاختہ اور جنگ کر دیں کہ ان کی مقابلہ اور مزاحمت کی طاقت ہی ختم ہو جائے اور اگر وہ جنگ لڑیں بھی تو خشکی اور افسردگی کے عالم میں جنگ لڑیں تاکہ ابن زیاد کے لشکر کا نقصان کم ہو۔

☆ پانی بند کرنے کا دوسرا مقصد جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا یہ تھا کہ امام حسین تک باہر سے کسی کی مدد پہنچنے اور امام کی طرف سے کسی قاصد اور پیام کے باہر جانے کے راستوں کو روک دیا جائے۔

☆ تیسری وجہ یہ تھی کہ ابن زیاد سمجھتا تھا کہ امام حسین کا محاصرہ کرنے اور ان پر پانی بند کرنے کے بعد جنگ کی نوبت آنے سے پہلے ہی وہ بنی امیہ کی حکومت کو تسلیم کر لیں گے۔

☆ ابن زیاد سمجھتا تھا کہ پانی بند کرنے کے بعد مردوں سے پہلے چھوٹے بچے پیاس کی سکت نہ لاکر فریاد بلند کریں گے اور بچوں کی فریاد امام حسین کے عزم و ارادے کو پست کرنے میں اہم کردار ادا کرے گی۔

☆ ابن زیاد اس حد تک شقاوت کا مظاہرہ کر کے بنی امیہ اور یزید کی قربت حاصل کرنا چاہتا تھا اور انہیں اپنی وفاداری کا یقین دلانا چاہتا تھا کہ اس نے بنی امیہ اور یزید کی خاطر حضرت عثمان کے پیاسا قتل ہونے کا انتظام اولادِ علی سے لے لیا۔

واقعات شب عاشورا

۹ محرم ۶۱ ہجری کو عصر کے بعد امام حسین علیہ السلام کے وفد اور عمر سعد کے درمیان امام حسین کو ایک شب کی مہلت دینے پر اتفاق رائے ہونے کے بعد امام نے نمازِ مغربین کے بعد انصار اور بنی ہاشم کے تمام مردوں اور جوانوں کو ایک خیمے جمع کیا اور درپیش مسائل مصائب اور مشکلات

پر خداوند متعال کی رضا کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہوئے فرمایا کہ:

”اے ربِّ جلیل تمام حمد تیری ذات کے لئے کہ تو نے ہمیں نبوت و رسالت سے نوازا، ہمیں قرآن کی تعلیم دی، دین میں ہمیں فقیہ بنایا، چشم و گوش کی بصیرت عطا فرمائی، حقائق کو درک کرنے کے لئے قلبِ سلیم عطا کیا، ان نعمتوں کے لئے تو ہمیں شکر گزاروں میں قرار دے۔

اس کے بعد آپ نے اپنے اصحاب سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ: ”میں نہیں جانتا کہ میرے نیک سیرت اور با وفا اصحاب جیسے اصحاب کسی اور کو ملے ہوں اور میرے نیک خصلت، ہمدرد، مشفق و ہر بان اہل بیت جیسے اہل بیت کسی اور کو ملے ہوں، خداوند عالم تم سب کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ ممکن ہے کہ تمہارے علم میں ہو اور اگر تمہارے علم میں نہیں ہے تو جان لو کہ ہمیں آج ان لوگوں کا سامنا ہے، یہ لوگ صرف میرے خون کے پیاسے ہیں، میرے علاوہ یہ کسی اور کے درپے نہیں۔ میں تم سب کو چلے جانے کی اجازت دیتا ہوں اور اپنی بیعت سے تمہیں آزاد کرتا ہوں، اس رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہاں سے نکل جاؤ، میرا ہر صحابی میرے اہل بیت میں سے ایک ایک کا ہاتھ پکڑ کر اس شب کی تاریکی میں یہاں سے چلا جائے اور مجھے اس قوم سے مقابلہ کرنے کے لئے تنہا چھوڑ دے۔“

آپ نے خاص طور پر فرزندِ ان مسلم بن عقیل سے فرمایا کہ:

”تم اپنی قربانی دے چکے ہو، تمہارے لئے کافی ہے اب تم لوگ یہاں سے کسی طرح نکل جاؤ۔“

امام حسین علیہ السلام کے خطبے کے اسرار و رموز

امام حسین علیہ السلام کہ جن کی نشو و نما رسول اکرم کے لعابِ دہن اور زہراء مرضیہ سلام اللہ علیہا کے شیر سے ہوئی، جنہوں نے صاحبِ سلوئی کے دامن میں تربیت پائی، حسین کہ جو خود آیاتِ قرآن کی مجسم تفسیر و تاویل ہوان کے خطبات اور کلمات کی تہہ تک پہنچنا اور ان کے اسرار

ورموز کو سمجھنا ہم جیسے انسانوں کی قدرت سے باہر ہے کہ جن کا علم محدود اور مختصر ہو۔ لیکن اپنی کم علمی اور کم مائیگی کو بہانہ بنا کر امام کے کلمات میں غور و فکر کرنے ہی سے دامن بچانا اور اس سے صرف نظر کر لینا جمود و رکود کی علامت ہے۔ قرآن کریم ہمیں بار بار تفکر اور تعقل کا حکم دیتا ہے۔ پیغمبر اکرمؐ اور اہل بیت علیہم السلام کی زندگی کے تمام پہلوؤں میں ہمیں ان تاسی کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ معصومین کی زندگی کے پہلوؤں کی تاسی کرنے کے لئے ان کی سیرت، کردار اور گفتار پر غور و فکر کرنا ضروری ہے۔ لہذا یہ ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ اپنی صلاحیت اور استعداد کے تحت حتی المقدور امام کے کردار اور گفتار کو سمجھنے کی سعی اور جہد و جہد کرے۔

☆ ہم جب امام کے اس خطبے پر غور کرتے ہیں تو بہت سے نکات واضح ہو کر سامنے آتے ہیں۔ امام کے اس خطبے سے یہ نکتہ واضح ہوتا ہے کہ انسان کو ہر صورت میں چاہے کامیابی و کامرانی ہو یا شکست و ناکامی، مسرت و خوشی ہو یا غم و مصیبت ہر حال میں خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے۔ پیش آمدہ ناگوار اور ناپسندیدہ حالات میں ان گزشتہ نعمتوں اور احسانات کو یاد کرنا چاہئے جن سے خداوند عالم نے اسے نوازا خدا سے یہ شکوہ کرنا کہ اس نے غم و مصیبت کے موقع پر ہمیں تنہا چھوڑا ہے کفر کے مترادف ہے۔ یہ پیش آمدہ مصیبت و آلام بھی خدا کی طرف سے آزمائش و امتحان ہے اور رحمت ہے جس طرح گزشتہ آسائشوں کا میسر ہونا ایک نعمت تھا اور باعثِ رحمت تھا۔

☆ اس خطبے میں امام نے پیش آمدہ مصائب و حوادث پر خداوندِ رؤف و مہربان کے ان بے کراں الطاف و عنایات کفر و اموش نہیں بلکہ ان نعمتوں کا ذکر کیا جن سے خداوند عالم نے آپ کے پاکیزہ گھر کو نوازا۔ آپ نے فرمایا کہ دنیا کی تمام نعمتیں ان نعمتوں کے مقابلے میں بیچ اور بے قیمت ہیں جن سے خداوند عالم نے اہل بیت کو نوازا۔ آپ نے اس خطبے میں خدا کی جن نعمتوں کو یاد فرمایا ہے وہ نعمت رسالت و نبوت ہے، وہ نعمت، نعمت امامت ہے، علم قرآن اور فہم قرآن کی نعمت ہے، حقائق کے علم اور دین کی آگاہی کی نعمت ہے۔

☆ امام کے اس خطبے سے واضح ہوتا ہے کہ آپ اپنے اصحاب و انصار اور اپنے اہل بیت کو کسی بھی مرحلہ پر تاریکی میں نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ حالانکہ طول تاریخ میں دنیا کے سیاستدانوں کی ہمیشہ یہ پالیسی رہی ہے کہ وہ اپنے عوام کو اندھیرا اور غفلت میں رکھتے ہیں، تحریر و تقریر کے سحر سے لوگوں کو مسحور کرتے ہیں، حقائق پر لفاظی کا پردہ ڈالتے ہیں یہاں تک کہ بعض دینی سربراہان بھی اس سے مبرا نہیں اور وہ بھی مصلحتوں کے تحت عوام کو اندھیر میں رکھنا جائز سمجھتے ہیں لیکن امام حسینؑ جیسی شخصیت کہ جن کی زندگی ہی الہی اور قرآنی سیاست کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے اس سوچ اور طرز فکر کو صالح قیادت اور رہبری کے منافی سمجھتے ہیں۔ چنانچہ آپ نے اپنے انصار و اہل بیت کو کبھی اندھیرے میں نہیں رکھا بلکہ جو کچھ اس وقت پیش آمدہ مسائل تھے یا جو حالات آئندہ پیش آنے والے تھے ان سے ان کو آگاہ رکھنا کہ ہر شخص امام کی اطاعت و وقت کی مجبوری کے تحت نہیں بلکہ اس سے ہٹ کر اپنے جذبہ ایمانی، روشن ضمیری، علم و آگاہی اور اپنے شعور کی بیداری کے ساتھ اپنی راہ آپ متعین کرے۔

☆ امام کے اس خطبے سے جہاں مندرجہ بالا نکات سامنے آتے ہیں وہاں چند سوالات اور اشکالات بھی ذہن میں ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ امام حسینؑ کے خطبے کا درج ذیل حصہ بڑا عجیب اور متحیر کرنے والا ہے اور ذہن میں بہت سے سوالات پیدا کرتا ہے۔ آپ نے اپنے اصحاب سے فرمایا کہ:

”ہماری زندگی میں بس کل کا دن باقی ہے، دشمن کا لشکر ہمارا محاصرہ کئے ہوئے ہے۔ نیچنے کی کوئی امید نظر نہیں آتی، یہ لوگ صرف میرے خون کے پیاسے ہیں ان کو مجھے قتل کرنے کا موقع مل جائے تو یہ تم سے کوئی سروکار نہیں رکھیں گے۔ اس لئے میں تمہیں اجازت دیتا ہوں کہ تم مجھے اس میدان میں تنہا چھوڑ کر اس رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہاں سے نکل جاؤ۔ میں سب کی قدر دانی کرتا ہوں، تم نے اس طویل سفر کی زحمات اور مشقتیں برداشت کی ہیں، میرے

لئے تمہارے دلوں میں جو شفقت اور محبت ہے اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا بلکہ مجھے اس پر فخر ہے۔ لیکن اب جب مجھے شہید ہونا ہی ہے تو میں اپنی بیعت تمہاری گردنوں سے اٹھاتا ہوں کیونکہ اب اس بیعت کا مقصد ہی ختم ہو چکا ہے اس لئے تم سب یہاں سے رات کی تاریکی میں نکل جاؤ اور جاتے جاتے مجھ پر ایک احسان یہ بھی کرتے جاؤ کہ میرے اہل بیت میں سے ایک ایک کا ہاتھ پکڑ کر یہاں سے لے جاؤ۔“

امام کا اپنے اصحاب کو واپس چلے جانے کی اجازت دینا ہم جیسے سطحی نظر رکھنے والوں کے لئے بہت سے شرعی اصول و ضوابط سے متصادم نظر آتا ہے مثلاً:

☆ متعدد احادیث میں وارد ہوا ہے کہ جس شخص کی گردن پر امام وقت کی بیعت نہ ہو اس کی موت جاہلیت کی موت ہوتی ہے اور جاہلیت کی موت شرک کی موت ہے۔ اس لحاظ سے امام کا یہ فرمانا کہ ”میں تمہاری گردن سے اپنی بیعت اٹھاتا ہوں۔“ کے معنی یہ ہوئے کہ معاذ اللہ میں تمہیں جاہلیت اور شرک کی موت کے حوالے کرتا ہوں۔ یہ امام کی شان کے بھی خلاف ہے اور آپ کے اصحاب کی قدر وانی کے منافی بھی۔ پھر امام کیوں ان کی گردن سے اپنی بیعت اٹھا کر انہیں سعادت سے محروم کر رہے ہیں؟

☆ میدان جنگ و جہاد کہ جہاں حق و باطل اور کفر و اسلام کے درمیان مقابلہ ہو اس جہاد سے حق و اسلام کے کسی داعی کا فرار کرنا گناہ کبیرہ ہے۔ پھر امام کیوں کر اپنے پاکباز اور پاک طینت اہل بیت اور انصار کو اس گناہ کبیرہ کی دعوت دے رہے ہیں؟

☆ کسی مسلمان کی جان بچانا اہم ترین واجبات میں سے ہے یہاں تک کہ ضرورت پڑنے پر نماز جیسی اہم عبادت کو بھی توڑ کر کسی مسلمان اور کلمہ گو کی جان بچانا واجب ہے چہ جائیکہ امام وقت کی جان بچانا امام حسین علیہ السلام اس وقت لشکر اعداء کے محاصرے میں تھے اور یہ یقینی تھا کہ کل دشمن آپ کو شہید کر دیں گے جیسا کہ واضح طور پر آپ نے فرمایا کہ ”یہ سب میرے خون کے

پیاسے ہیں اور ہر صورت میں مجھے قتل کر کے رہیں گے۔“ ایسے حالات میں امام کیوں اپنے صالح ترین اصحاب کو ان کے واجب فریضہ سے محروم کر رہے ہیں؟

☆ ظالمین اور جاہلین سے ایک لمحہ کے لئے بھی تعاون کرنا یا ان کی مدد کرنا صریح آیات قرآنی اور روایات کی رو سے حرام فعل ہے۔ امام علیہ السلام کو لشکر عمر سعد کے زغے میں تنہا چھوڑنا اموی طاغوتی لشکر کے حوصلے بلند کرنے اور ان سے تعاون کرنے کے مترادف ہے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ امام اپنے اصحاب کو ان کو تنہا چھوڑ کر چلے جانے کی اجازت دے کر کیوں ظالموں اور جاہلوں کے حوصلے بلند ہونے کا سبب بن رہے ہیں؟

☆ امام نے اپنے قیام و انقلاب کے لئے اپنے وفا اور مخلص ترین اصحاب کو دعوت دی۔ اب اس مشکل ترین مرحلہ پر ایسے حالات میں ان انصار و اعوان اور اہل بیت کا امام کو تنہا چھوڑ کر جانا آپ کے موقف کو مشکوک بناتا ہے اور دشمن کو پروپیگنڈہ کرنے کا موقع اور عبید اللہ ابن زبیر اور لشکر اموی کو آپ کو قتل کرنے کا جواز فراہم کرتا ہے۔ دشمن کر سکتا ہے کہ اگر امام کا موقف صحیح ہوتا تو ان کے اصحاب ان کو تنہا چھوڑ کر نہیں جاتے۔ امام کیوں کر ایسا موقع دشمنوں کو فراہم کرنے کا سبب بن سکتے ہیں؟

☆ امام حسین علیہ السلام اپنے قیام و انقلاب کے آغاز سے ہی ایسے مخلص افراد کو اپنے گرد اکٹھا کر رہے تھے جو مستقل مزاج ہوں اور ثابت قدمی کا مظاہرہ کر سکیں اور ایسے افراد کو اپنی دعوت میں شریک کرنے سے احتراز فرماتے تھے جو استقامت نہ دکھا سکیں۔ چنانچہ آپ ہر موقع پر اپنے مستقبل اور آئندہ پیش آنے والے حالات سے اپنے ساتھیوں کو آگاہ فرماتے رہے تاکہ آپ کی رکاب میں صرف جائز و جانفروش اور مخلص ترین افراد آپ کے ہمراہ تھے وہ مخلص ترین لوگ تھے جس کا خود آپ نے اعتراف فرمایا۔ اس یقین کے باوجود کہ یہ لوگ مخلص ترین لوگ ہیں آپ اس موقع پر ان کو آپ کو تنہا چھوڑ کر چلے جانے کی اجازت دے رہے ہیں؟

یہ ہیں وہ اشکالات اور سوالات جو ہم جیسا دینی طالب علم کے ذہن میں امام کے اس خطبے کے مطالعے کے بعد پیدا ہوتے ہیں اور ہو سکتا ہے حقیقت کے متلاشی دوسرے لوگوں کے ذہن میں بھی پیدا ہوتے ہوں۔ اس لئے ان اشکالات پر تحقیق کرنا اور ان پر ایک سیر حاصل بحث کرنا ضروری ہے۔ ہمارے ذہن میں ان سوالات اور اشکالات کے جو جوابات ہیں وہ ہم قارئین کی خدمت میں اس امید کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ وہ بھی اس سلسلے میں جستجو اور فکر کریں گے۔

پہلا جواب

فقہ اسلامی میں بیعت ایک وسیع باب ہے جس میں بیعت کی انواع و اقسام کا ذکر ہے۔ ان میں سے بیعت کی ایک قسم وہ ہے جو لوگ کسی نبی یا امام سے اس کو اپنا قائد و رہبر تسلیم کرنے کے لئے کرتے ہیں جس کے ذریعے وہ اس کے احکامات اور ہدایات کی تعمیل اور فرمانبرداری کرنے کا عہد اور اعلان کرتے ہیں۔ اس بیعت سے روگردانی کرنے اور منہ موڑنے کے معنی ہدایت کی طرف سے منہ موڑ کر ضلالت اور گمراہی کی طرف رخ کرنا ہے۔ ایسا شخص مرنے پر جاہلیت اور شرک کی موت مرتا ہے۔

بیعت کی دوسری قسم وہ بیعت ہے جو کوئی معتقد اپنے قائد و رہبر سے ہنگامی حالات میں کرنا ہے۔ مثلاً جنگ و جہاد کے موقع پر ایک معتقد اپنے قائد و رہبر سے یہ بیعت اور عہد کرتا ہے کہ وہ جنگ و جہاد کے موقع پر اپنے قائد و رہبر کے دشمن کے خلاف جنگ کرنے کے لئے ہمہ وقت تن و من سے آمادہ ہے۔ یہ بیعت وقتی اور ہنگامی ہوتی ہے اور دوران جنگ تک محدود ہوتی ہے۔ جنگ کے خاتمے یا جنگ کے معطل ہونے کے بعد اگلے مرحلے کے لئے پھر سے نئی بیعت کی ضرورت پیش آتی ہے۔

امام حسینؑ نے کربلا میں جس بیعت کو اپنے انصار و اعدا کی گردنوں سے اٹھایا تھا وہ با زیابی خلافت کے لئے جنگ و جہاد کی بیعت تھی۔ اب چونکہ جنگ کا وہ مقصد جیسا کہ خود امام نے تصریح

فرمائی ختم ہو چکا تھا اور اب زندہ بچنے کی کوئی امید ہی باقی نہیں رہی تھی اس لئے آپؑ نے اپنی یہ بیعت ان کی گردنوں سے اٹھالی۔

دوسرا جواب

زندگی الہی امانت ہے اور اس کو الہی مقصد ہی کے لئے قربان کیا جاسکتا ہے۔ جب مقصد اور ہدف کا حصول ممکن نہ ہو تو اللہ کی اس امانت کا بچانا واجب ہے۔ امام حسین علیہ السلام نے جب یہ دیکھا کہ جس مقصد اور ہدف کے لئے آپؑ اٹھے تھے اس کا حصول اب ممکن نہیں رہا تو آپؑ نے اپنے اصحاب با وفا کی جان کا تحفظ ضروری سمجھا۔ چنانچہ پیغمبرؐ کی رحلت کے بعد امیر المؤمنین امام علی علیہ السلام نے خلاف غصب کرنے والوں کے خلاف جنگ و جہاد سے ہاتھ اٹھانے کی حکمت اور علت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ:

”میں نے جب اپنے گرد و نواح میں دیکھا تو مجھے اپنے مخصوص اہل بیت اور چند افراد کے علاوہ کوئی نظر نہ آیا تو میں نے ان کو موت کے منہ میں دھکیلنے سے بچل کیا۔“

امام حسن علیہ السلام کی معاد یہ سے صلح کے موقع پر کچھ لوگوں نے سوال کے طور پر اور کچھ نے آپؑ کو موروثی بنانا کر صلح کے اسباب کے بارے میں پوچھا تو آپؑ نے فرمایا کہ:

”تمہاری جان اور تمہارا خون بچانے کے لئے مجھے صلح کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔“

چنانچہ اپنے اہل بیت اور اپنے با وفا انصار و اعدا کی جان اور خون کا تحفظ اپنے پد ریز رگوار اور اپنے برادر عزیز کی سیرت سے علیحدہ کوئی سیرت نہیں تھی۔ لہذا جب آپؑ نے دیکھا کہ مقصد و ہدف کا حصول ممکن نہیں رہا تو آپؑ نے ان کی جان کے تحفظ کی فکر کی۔

تیسرا جواب

امام حسینؑ دشمن کے ایک کثیر لشکر کے محاصرے میں تھے جس کے مقابل امام کے اپنے لشکر کی تعداد کسی شمار و قطار میں نہیں آتی تھی۔ اپنے لشکر کی تعداد میں اضافہ کی بھی کوئی امید باقی نہیں تھی۔

سامان جنگ کے وسائل و ذرائع کی بھی کوئی آس باقی نہ تھی۔ صرف ایک طریقہ تھا کہ امام اپنے لشکر کی معنوی قوت کو بڑھائیں۔ کوئی بھی فوج جب جنگ کے لئے میدان میں آتی ہے تو اس کے بہت سے عوامل ہوتے ہیں۔ کبھی اس کی جنگ رضا و رغبت کے تحت ہو سکتی ہے اور کبھی جبر و تشدد کی وجہ سے دلہڑنے پر مجبور ہوتا ہے۔ رضا و رغبت کے تحت جب کوئی شخص میدان جنگ میں اترتا ہے تو اس کے پیش نظر کبھی مالی غنیمت کی طمع دلاچ ہو سکتی ہے اور کبھی عزت، شہرت اور جاہ و منصب کا حصول، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ جنگ کسی کی رضا و خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ہو چاہے کسی طاقت کی رضا و خوشنودی مقصود ہو یا رضائے الہی مطلوب ہو۔ لیکن کسی بھی جنگ کے لئے جو چیز بہر حال ضروری ہے وہ طاقت و قوت کا میسر ہونا ہے۔ چاہے افرادی طاقت و قوت ہو یا وسائل و ذرائع کی قوت۔ اس کے علاوہ اگر کوئی قوت ہو سکتی ہے تو وہ مقصدیت کی قوت ہے۔ امام علیہ السلام کے پاس بس یہی طریقہ تھا کہ وہ اپنی اس قلیل اور مختصر فوج میں مقصدیت کی قوت کی روح کو پھونک دیں۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب امام کا ہر سپاہی شعور و آگاہی کے ساتھ اپنا پاکیزہ مقصد و ہدف درک کر لے۔ اس اور اک کے بعد پھر سپاہی کسی کمان کا محتاج نہیں ہوتا بلکہ اس کی اصل قوت اس کا تہرک ہدف ہوتی ہے، وہ جنگ میں فتح کے نتائج اور فوائد سے آگاہی رکھتا ہے اور شکست کے نتائج کا بھی شعور و ادراک رکھتا ہے۔ امام حسینؑ نہیں چاہتے تھے کہ ان کے اعوان و انصار میں کوئی شخص اطاعت امام کے جذبے کے تحت یا امام سے اپنی بے پناہ دلا اور محبت کے تحت دشمن سے نبرد آزما ہو بلکہ اس کے برعکس جو بھی دشمن کے مقابلے میں جانا چاہے وہ فہم و شعور و آگاہی سے مالا مال ہو اور اپنے ہدف کا اسی طرح ادراک رکھتا ہو جس طرح خود امام اپنے ہدف سے آگاہی اور عشق رکھتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جائے تو شاید غلط نہ ہو کہ ہر شخص ”حسینؑ“ بن کر میدان جہاد میں جائے۔ امام اپنے اس مقصد میں کامیاب رہے۔ چنانچہ مقابلے میں ہے کہ امام کے انصار جس جذبے سے کربلا میں لڑے اس کی کوئی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔

چوتھا جواب

امام کا اپنے انصار و اعوان کو چلے جانے کی اجازت دینے کا ایک مقصد یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حق و حقانیت کو جاگرا اور ثابت کرنے والے لوگ باقی رہیں اگر کربلا میں سب کے سب شہید ہو جاتے تو حق کی آواز کو بلند کرنے والا اور امام کے ہدف و مقصد کو زندہ رکھنے والا کوئی باقی نہ رہتا۔ امام حسینؑ کی یہ سوچ ان کے بھائی امام حسنؑ کی سیرت سے عین مطابقت رکھتی ہے۔ چنانچہ امام حسنؑ سے خلوت میں جب ان کے مخلص اصحاب نے یہ پوچھا کہ آپ نے معاویہ سے کیوں صلح کی تو آپ نے فرمایا کہ ”میں نے اس لئے صلح کی تاکہ حق کی دعوت دینے والے زندہ رہیں۔“

پانچواں جواب

امام حسینؑ اپنے انقلاب کو دشمن کے غلط پروپیگنڈے سے محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ حالات جب اس نوبت پر پہنچے کہ بچنے کی تمام راہیں مسدود ہو گئیں تو امام نے اپنے دینی وظیفے اور غیرت دینی کو باقی رکھنے کے لئے شہادت کو ترجیح دی۔ اب اگر آپ اپنے ساتھ اپنے انصار کی شہادت کو بھی لازمی قرار دیتے تو ہو سکتا تھا کہ دشمن پروپیگنڈہ کرتا اور کہتا کہ ”حسینؑ خود موت کے لئے تیار ہو جاتے لیکن دوسروں کو موت کے منہ میں دھکیلنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ ان کے ساتھی تو جنگ سے بچنا چاہتے تھے لیکن اپنے امام کی محبت و مروت اور دباؤ کی وجہ انہوں نے جنگ سے کنارہ کشی اختیار نہیں کی۔“ چنانچہ امام حسینؑ نے اس زہریلے پروپیگنڈے کی جڑ کاٹنے کے لئے اپنے اصحاب کو چلے جانے کی اجازت دے دی۔

واقعاتِ عاشورا

۲ محرم الحرام ۶۱ھ سے لے کر صبح عاشورا تک جو لشکر امام حسین علیہ السلام کے رکاب میں شامل ہوا اور اس کے مقابلے میں عمر سعد کے لشکر کی تعداد جو کربلا میں جمع ہوا اس کی تفصیل یوں ہے۔

کربلا میں حسین علیہ السلام کے اصحاب کی تعداد

حضرت امام حسین علیہ السلام کے اصحاب کی تعداد کا دشمن کے لشکر کی تعداد کے مقابلے میں قلت و کثرت کا کوئی تناسب نہیں ہے۔ اس کی صحیح تعداد کے بارے میں مورخین میں اختلاف ہے۔

ہم یہاں پر تاریخ و سیرت نگاروں کے حوالے سے ان اعداد و شمار کو نقل کرتے ہیں۔

☆ صاحب بدایہ و نہایہ نے اپنی کتاب کی جلد ہشتم صفحہ نمبر ۹۷ پر امامؑ کے لشکر کی تعداد پینتالیس سوار اور ایک سو پیاوہ بیان کی ہے۔

☆ مسعودی نے پانچ سو سوار ایک سو پیاوہ کل مجموعی تعداد چھ سو (۶۰۰) بتائی ہے۔

☆ ابن شہر آشوب نے مناقب سے کل تعداد پینتالیس بتائی ہے اور کہا ہے کہ اس میں سے بیس سوار تھے۔

☆ تہذیب المعتمد جلد اول صفحہ ۱۵۶ کے مطابق اولاد علیؑ میں سے پانچ یا سات بنی ہاشم سے آٹھ اور مجموعی طور پر کل لشکر کی تعداد ایک سو بتائی ہے۔

☆ ابن کثیر نے بیس سوار چالیس پیاوہ بتائی ہے۔ ابن مرجانہ کے پاس جو سر ہائے مقدس بھیجے گئے ان کی تعداد اسی ہے۔

یہاں ہم ان باوفا افراد کی حسینؑ لشکر میں شمولیت کی مختصر روداد بیان کرنا چاہیں گے۔

اصحاب حسینؑ کی لشکر حسینؑ میں شمولیت کی روداد

حضرت مسلم بن عقیل، ہانی بن عروہ اور دیگر بعض جاٹاروں کی شہادت کے بعد عبید اللہ ابن زیاد کی کوفہ پر گرفت مستحکم ہو گئی۔ اس کے بعد اس کا اگلا قدم یہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح امام حسین علیہ السلام کے تمام معروف اصحاب اور عقیدت مندوں کو گرفتار کیا جائے اور شہر کی پوری طرح ناکہ بندی کر دی جائے تاکہ امام علیہ السلام کی نصرت کے لئے نہ کوئی کوفہ سے باہر جاسکے اور نہ ہی آپؑ کا کوئی قاصد کوفہ میں داخل ہو سکے۔ ساتھ ہی امامؑ کا داخلہ سختی کے ساتھ مسدود کر دیا جائے۔ اس کے علاوہ کوفہ میں ایک عمومی سپاہ بنانے کا اعلان کیا گیا اور دعوت دی گئی کہ تمام افراد حسینؑ سے جنگ کے لئے نکل آئیں۔ کوفہ میں شہر کی سخت ناکہ بندی کے باوجود امام حسین علیہ السلام کے انصار و یاران کی جانفشانی، ایثار اور امامؑ کی رکاب

میں شہادت کے شوق و جذبے کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے کس کس طرح اپنے آپ کو کربلا تک پہنچایا۔ ہم یہاں امام حسینؑ علیہ السلام کے لشکر میں ان کے باوفا انصار و اعوان کی شمولیت کی کیفیت بیان کریں گے کہ ان پاک ذوات نے کس طرح خود کو امام حسینؑ کے لشکر میں پہنچایا۔

جو افراد امام حسینؑ کے ساتھ ساتھ تھے ان کے علاوہ بعد میں جن افراد نے خود کو امامؑ کے لشکر میں شامل ہونے کے لئے خود کو امامؑ کی خدمت میں پہنچایا ان کی تفصیل یوں ہے۔

(۱)۔ وہ گروہ جس نے امام حسینؑ کے عشق و محبت میں عبید اللہ ابن زیاد کی تمام تر رکاوٹوں اور مشکلات کو کسی نہ کسی طرح عبور کیا اور کوفہ سے نکل کھڑے ہوا اور خود کو امامؑ کی خدمت میں پہنچایا ان کے اسماء گرامی یہ ہیں۔

حبیب ابن مظاہر، قاسط ابن زہیر، تھعلبی، کرموس، تھعلبی، کنانہ بن عقیق، تھعلبی، مسلم بن کثیر، عارج، حنظلہ بن اسور، اشیامی، جبلیہ بن علی شیبانی، سالم بن عمرو، مولیٰ بنی المدینہ، کلبی، سوار بن منعم بن حابس، ہدائی، عمر بن عبد اللہ، جندعی، عبد الرحمن ارجی، یزید ابن حصین، شرقی، انیس بن معقل، اصحی، عبد اللہ اور عبد الرحمن۔ یہ سب کے سب ایک ایک دو دو یا زیادہ سے زیادہ تین تین کی تعداد میں نکلے اور اپنے آپ کو کربلا تک پہنچایا۔

(۲)۔ وہ افراد جن کی امام حسینؑ کے لشکر میں شمولیت کی تفصیل اور وضاحت تاریخ میں نہیں ملتی کہ وہ کب اور کیسے امام حسینؑ تک پہنچے ان کے اسماء گرامی یہ ہیں۔

ابو ثمامہ صیداوی، عمرو بن جندب، حضرمی، جندب بن حیر، خولانی اور ابو شعثا کندی۔

(۳)۔ وہ حضرات جو تمام دشواریوں کے باوجود نہ صرف خود بلکہ اپنے ساتھ اپنے اہل و عیال کو بھی لے کر نکلے اور امام حسینؑ کے رکاب میں پہنچے یہ ہیں۔

مسلم ابن عوجہ، اسدی، عبد اللہ ابن عمیر، کلبی اپنے بیٹے کے ساتھ، جندبہ بن حارث، انصاری، وہب، کلبی اور اس کی والدہ۔

(۴)۔ کچھ وہ پاک ذوات بھی ہیں جن کو امام حسین علیہ السلام کے کربلا پہنچنے کی خبر جب ملی تو وہ پریشان

ہو گئے کہ کس طرح خود کو امام کی رکاب تک پہنچائیں۔ انہوں نے یہ تدبیر اختیار کی کہ وہ عمر سعد کے لشکر ساتھ مل کر کوفہ سے نکلے اور کربلا پہنچ کر عمر سعد کی فوج سے نکل کر امام حسین تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے ان کے نام یہ ہیں۔

ضرغامہ بن مالک، قاسم بن حبیب ازدی، نعمان بن عمرو، راسی، حلاس، راسی، مالک، عبد بن سرلیج، جامی، سیف بن حارث بن سرلیج، جامی، مسعود بن حجاج، عبدالرحمن بن مسعود اور عمار بن ابی سلمہ والانی۔

(۵)۔ اس کے علاوہ کچھ افراد ایسے بھی تھے جو اموی لشکر میں تھے اور امام حسین کے خلاف جنگ کرنے کے لئے نکلے تھے لیکن جب ان پر امام حسین کی حقانیت منکشف ہو گئی تو عمر سعد کے لشکر سے نکل کر امام کے ساتھ شامل ہو گئے مثلاً۔

☆ حرا بن یزید ریاحی جو ایک لشکر لے کر امام حسین کو گرفتار کر کے کوفہ لے جانے کے لئے یا ان کو محاصرے میں رکھنے کے لئے نکلے تھے اور وہ ہی آپ کو کربلا لانے کا سبب بنے۔ شب عاشور تمام رات ان کا ضمیر حق و باطل کے درمیان ایک طویل کشمکش کے بعد حق کی طرف مائل ہوا اور صبح عاشور وہ اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ اپنے سابقہ گناہوں پر پشیمان ہو کر امام کی رکاب میں شامل ہو گئے اور ہمیشہ کے لئے خود کو سعادت آبادی سے ہمکنار کر لیا۔

☆ شب عاشور تیس افراد امام حسین کی حقانیت در کرنے کے بعد عمر سعد کے لشکر سے نکل کر امام کے لشکر میں شامل ہوئے۔

اموی لشکر کی تعداد

تاریخ واقعات کو کبھی بھی مبالغہ اور افراط و تفریط کا شکار نہیں ہونے دینا چاہئے۔ مبالغہ آرائی نہ صرف تاریخ حقائق کو سخ کر دیتی ہے بلکہ المیہ کربلا جیسے اہم واقعہ کو ایک طلسمی کہانی بنا کر واقعہ کی اہمیت اور امام حسین کے مقصد اور ہدف کو پس پردہ لے جانے کا سبب بنتی ہے اور حق و حقیقت کا متلاشی کسی طلسماتی کہانی

کی بھول بھلیوں میں بھٹک کر رہ جاتا ہے۔ مثلاً ”اسرار الشہادۃ“ اور ”روضۃ الشہداء“ وغیرہ میں کہا گیا ہے کہ کربلا میں امام حسین کے خلاف دشمن کے لشکر کی تعداد ۵۱ لاکھ تھی جو نہ صرف مبالغہ آمیز ہے بلکہ مضحکہ خیز بھی ہے۔ تاریخ اور مقاتل سے اس تعداد کی کوئی سند نہیں ملتی۔

ائمہ اطہار علیہم السلام سے مروی روایات کے مطابق امام کے خلاف جمع ہونے والے لشکر کی تعداد زیادہ سے زیادہ تیس ہزار بیان کی گئی ہے۔

تاریخ اور کتب مقاتل میں کربلا میں امام کے خلاف جمع ہونے والے لشکر کی تعداد ۲۵ ہزار لکھی گئی ہے جس کی تفصیل یوں ہے۔

(۱)۔ حرا بن یزید ریاحی کی قیادت میں منزلی نبالہ سے امام کی نگرانی کرتا ہوا جو لشکر کربلا پہنچا اس کی تعداد ایک ہزار۔

(۲)۔ کعب بن ظہر کی قیادت میں کربلا آنے والے لشکر کی تعداد تین ہزار۔

(۳)۔ عمر ابن سعد کی قیادت میں کربلا پہنچنے والے لشکر کی تعداد چار ہزار۔

(۴)۔ شمر ابی ذی الجوشن سلولی کی قیادت میں کربلا پہنچنے والے لشکر کی تعداد جس میں کوفہ کے علاوہ شامی فوجی بھی تھے چار ہزار۔

(۵)۔ یزید بن رکاب کلبی کی قیادت میں آنے والے لشکر کی تعداد دو ہزار۔

(۶)۔ حصین ابن نمیر سکونی کی قیادت میں آنے والے لشکر کی تعداد چار ہزار۔

(۷)۔ مضر ابن رعیہ المازنی کی قیادت میں آنے والے لشکر کی تعداد تین ہزار۔

(۸)۔ نصر بن خرشہ کی قیادت میں آنے والے لشکر کی تعداد دو ہزار۔

(۹)۔ شبث ابن ربیع کی قیادت میں آنے والے لشکر کی تعداد ایک ہزار۔

(۱۰)۔ حجاج ابن ابجر کی قیادت میں آنے والے لشکر کی تعداد ایک ہزار۔

کل تعداد: پچیس ہزار۔

صبح عاشورا

امام حسین علیہ السلام نے نماز فجر ادا کرنے کے بعد اپنے اصحاب سے خطاب کیا خدا کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا کہ:

”خداوند عالم نے مجھے اور تم لوگوں کو اجازت دی ہے کہ ہم (اس کی راہ میں) قتل ہو جائیں۔

ہمیں اب صبر و استقامت کے ساتھ دشمن سے نبرد آزمانی کے لئے تیار ہو جانا چاہئے۔“

یہ فرما کر اپنے اصحاب کی نہایت قلیل اور مختصر فوج کو اسی انداز سے منظم کیا جس طرح ایک بڑے لشکر کو منظم کیا جاتا ہے۔ لشکر کے دائیں جانب کی قیادت زہیر ابن قین کو دی جائیں جانب کی کمان حبیب ابن مظاہر کے سپرد کی اور پورے لشکر کا قائد قمر بنی ہاشم حضرت ابوالفضل العباس کو مقرر کیا۔ خود کو اور اپنے اہل بیت کو وسط لشکر میں رکھا۔ ایک مرتبہ امامؑ نے اپنے لشکر پر نظر ڈالی کہ جس کی تعداد سو تک بھی نہیں پہنچتی تھی جب کہ دوسری طرف مقابل میں دشمن کے لشکر کا جم غفیر تھا۔ اپنے انصار کی قلت اور دشمن کی کثرت پر امامؑ کے قلب پر رقت طاری ہوئی۔ اس بے کسی کے عالم میں امامؑ نے درگاہ خداوندی میں اپنے ہاتھ بلند کئے اور دعا کی کہ:

”خداوند! ہر مشکل اور ہر مصیبت میں ہمیشہ میں نے تیری ہی ذات پر بھروسہ کیا میری تمام

امیدیں تیری ہی ذات سے وابستہ ہیں۔ تمام چارہ جوئی ختم ہونے، دوستوں کے ساتھ چھوڑ جانے اور دشمن کے ثبات کرنے پر ہم نے ہمیشہ اپنی مصیبت کو تیرے ہی حضور میں پیش کیا میں نے اپنی شکایت تیری ہی بارگاہ میں پیش کی تیری ذات کے علاوہ میں کبھی کسی کے سامنے نہیں جھکا۔ یہ تو ہی ہے جس نے ہمیشہ میری مشکل کشائی کی اور میری پریشانیوں کو دور کیا۔ ہر نیکی اور ہر نعمت تیری ذات سے ہے ہر کسی کی امیدیں تجھ ہی سے وابستہ ہیں۔“

امام حسینؑ اور ان کے باوفا اصحاب کے خطبات کے نکات

روز عاشورا کے اہم واقعات میں سے ایک اہم واقعہ امام حسینؑ کے باوفا انصار زہیر ابن قین حبیب

ابن مظاہر مسلم ابن عوسجہ اور زہیر ہمدانی جیسی مذہبی و سماجی شخصیات اور خود امامؑ کے انسان اور انسانیت کو بیدار کرنے والے وہ خطبات ہیں جو انہوں نے عمر سعد کے لشکر کو مخاطب کرتے ہوئے کربلا کے میدان میں دیئے۔ ان خطبات میں امام حسینؑ اور ان کے اصحاب نے جن نکات کی طرف اس گمراہ لشکر کی توجہ دلانا چاہی تھی وہ یہ ہیں۔

☆ انہوں نے بتایا کہ جس ہستی اور جس ذات کو قتل کرنے پر تم لوگ متحد ہوئے ہو اور جس کا خون بہانے پر تم تلے ہوئے ہو وہ حسین ابن علیؑ کی ذات ہے، وہ حسینؑ جو تمہارے پیغمبرؐ کا فرزند، فاطمہ زہراءؑ کا ولید اور اس علیؑ کا بیٹا ہے جو تمہارے امیر المؤمنین تھے۔ امام حسینؑ اور ان کے باوفا اصحاب نے اپنے خطبات میں نہایت واضح اور روشن طریقے سے کما حقہ طور پر لشکر عمر سعد سے اپنا تعارف کرایا تا کہ کل کوئی یہ نہ کہہ سکتے کہ ”ہمیں تو معلوم ہی نہیں تھا کہ ہم کس کے خلاف جنگ کرنے نکلے ہیں۔“

☆ دوسرا نکتہ جو ان خطبات میں واضح اور روشن کیا گیا وہ یہ ہے کہ حسینؑ کی آمد خود اپنی طرف سے نہیں بلکہ وہ اہل کوفہ کے پیہم اصرار اور ان کی دعوت پر یہاں آئے ہیں۔

☆ ان خطبات میں اہل کوفہ کو ایک مرتبہ پھر دعوت دی گئی کہ وہ سوچیں اور غور کریں اور اس غور و فکر کے بعد بھی وہاں گریہ سمجھتے ہیں کہ امامؑ کو یہاں بلا کر ان سے کوئی غلطی ہوئی ہے یا وہ امامؑ کی آمد سے اگر خوش نہیں ہیں اور ان کا ساتھ دینے سے معذور ہیں تو وہ ”حسینؑ“ کو یہاں سے واپس جانے دیں۔

☆ ان خطبات کا چوتھا نکتہ یہ ہے کہ لشکر عمر سعد کے پاس ”حسینؑ“ کو قتل کرنے کا نہ کوئی شرعی جواز ہے اور نہ عقلی۔ امامؑ نے فرمایا کہ..... ”نہ میں نے شریعت میں کوئی تبدیلی اور تحریف کی ہے نہ تمہارے کسی فرد کو میں نے قتل کیا ہے اور نہ ہی میں نے کسی کا حق چھینا ہے کہ تم مجھ سے اس کا انتقام لو۔“

لیکن ان تمام خطبات اور کوہر بار و حکمت آمیز کلمات کا کہ جو آپؑ نے قرآنی آیات اور پیغمبرؐ کی روایات سے استدلال کرتے ہوئے بیان فرمائے اس قوم اشقیاء پر کوئی اثر نہ ہوا جیسا کہ خود امام حسینؑ نے فرمایا کہ..... ”ان پر شیطان غالب آچکا ہے اور ان کے دلوں پر مہر لگ چکی ہے۔“

واقعات روز عاشورا

عاشور کی صبح عمر ابن سعد اپنے لشکر کے ساتھ خیام امام حسین کی طرف بڑھا اپنے غلام درید کو پکار کر کہا کہ پرچم لے کر آگے بڑھے۔ اس کے بعد اس نے ایک تیرا کمان میں رکھا اور لشکر امام کی طرف پھینک کر کہا کہ:

”کوہ رہنا کہ میں وہ شخص ہوں جس نے حسین کو قتل کرنے کے لئے پہلا تیرا کی طرف پھینکا۔“

عمر سعد کے تیر پھینکتے ہی اس کے تمام لشکر نے امام کے لشکر کی طرف تیروں سے زخمی نہ ہوا ہو عمر سعد اور اس کے لشکر کی طرف سے مجرمانہ جنگ کا آغاز ہونے کے بعد امام نے اپنے اصحاب سے فرمایا کہ:

”دشمن نے تیروں کی بارش کر کے اپنے جرم و جنایت کا آغاز کر دیا ہے اٹھو اور اپنے دفاع اور موت کے استقبال کے لئے تیار ہو جاؤ خدا تمہاری نص فرمائے۔“

امام کے اصحاب بھی اپنے دفاع کے لئے آگے بڑھے اور ایک خوفناک جنگ شروع ہو گئی۔ گھوڑوں کی ٹاپوں سے اٹھنے والے گردوغبار کے بادل سے سورج چھپ کر رہ گیا۔ جب گردوغبار چھٹا اور امام نے دیکھا تو آپ کے پچاس کے قریب جاٹا رخا کدو خون میں غلطاں ہو چکے تھے۔ اس حملہ امام کے لشکر میں سے شہید ہونے والوں کے اسماء گرامی جو کتب مقاتل میں نقل ہوئے ہیں وہ یوں ہیں۔

(۱)۔ لا وہم بن امیہ عبدی بصری: یہ بصرہ سے آ کر کربلا میں امام کے لشکر میں شامل ہوئے۔

(۲)۔ امیہ بن سعد طائی: یہ امیر المؤمنین حضرت علی کے اصحاب میں سے تھے اور ایام ہمدنہ میں کوفہ سے آئے تھے۔

(۳)۔ جابر بن الحجاج مولیٰ عامر بن ہشک تمیمی: یہ کربلا میں امام سے آ کرے اور آپ کے لشکر میں شامل ہوئے۔

(۴)۔ جبلة بن علی شیبانی۔

(۵)۔ جوین بن مالک بن قیس بن ثعلبہ تمیمی نصیبی: یہ عمر سعد کے لشکر میں تھے کربلا میں عمر سعد کے لشکر سے

نکل کر امام کے لشکر سے آئے۔

(۶)۔ جندب بن ححیر کندی خولانی: یہ امیر المؤمنین حضرت کے اصحاب میں سے تھے۔

(۷)۔ جنادہ بن کعب بن حرث انصاری خزرجی: یہ مکہ سے امام کے ساتھ تھے اور اپنے اہل و عیال کو بھی ساتھ لائے تھے۔

(۸)۔ حباب بن حارث سلمانی ازدی: یہ کوفہ کے ممتاز شیعوں میں سے تھے حضرت مسلم کے ساتھ رہے ان کی شہادت کے بعد امام حسین سے آ کر مل گئے۔

(۹)۔ ہرث یا حارث بن امری قیس کندی: یہ عمر ابن سعد کے ساتھ تھے بعد میں امام حسین سے آ کر مل گئے۔

(۱۰)۔ حرث بن نبھان مولیٰ حمزہ بن عبدالمطلب: یہ مدینہ سے امام حسین کے ساتھ نکلے تھے۔

(۱۱)۔ حلاس بن عمرو ازدی راسی: یہ امیر المؤمنین حضرت علی کے محافظین میں سے تھے کوفہ سے عمر سعد کے ساتھ آئے تھے بعد میں امام حسین کے لشکر سے آئے۔

(۱۲)۔ حنظلہ بن عمرو شیبانی۔

(۱۳)۔ زاہر مولیٰ عمرو بن حنیف کندی خزاعی۔

(۱۴)۔ زہیر بن بشیر شعمی۔

(۱۵)۔ زہیر بن سلیم ازدی۔

(۱۶)۔ سالم بن عمرو مولیٰ بنی مدینہ کلبی: یہ ایام ہمدنہ میں امام سے آئے۔

(۱۷)۔ سعد بن حرث: یہ حضرت کے غلاموں میں تھے مدینہ سے امام کے ساتھ تھے۔

(۱۸)۔ سوار بن منعم بن حابس بن ابی عمیر بن ہمدانی: یہ ایام ہمدنہ میں کوفہ سے آئے تھے اور امام سے آئے۔

(۱۹)۔ سیف بن مالک عبدی نمیری۔

(۲۰) - ضرغامہ بن مالک: ی ہ حضرت مسلمؑ کی شہادت کے بعد عمر سعد کے ساتھ کوفہ سے نکلے اور کربلا میں امامؑ سے آ ملے۔

(۲۱) - عامر بن مسلم عبدی بصری۔

(۲۲) - سالم مولیٰ عامر: یہ بصرہ سے آئے تھے۔

(۲۳) - عبد اللہ بن بشر بن ربیعہ بن عمرو: یہ عمر سعد کے لشکر سے نکل کر امامؑ سے آ ملے۔

(۲۴) - عبد اللہ بن عمیر بن عباس بن قیس بن علیم بن کلبی: یہ اپنی بیوی ام وہب کے ہمراہ نکلے تھے اور امامؑ سے ملحق ہوئے۔

(۲۵) - عبد اللہ بن یزید بن شیبیط یا شیبیط: یہ دونوں یزید عبدی بصری کے بیٹے تھے۔

(۲۶) - عبید اللہ بن یزید بن شیبیط یا شیبیط: یہ تینوں باپ بیٹے بصرہ سے امامؑ کی نصرت کے لئے آئے تھے۔

(۲۷) - عمار بن حسان بن شریح بن سعد بن حارثہ: مکہ سے امامؑ کے ساتھ ساتھ تھے۔

(۲۸) - عمار بن ابی سلامہ۔

(۲۹) - عمرو بن جندب حضرمی کوفی: حضرت مسلمؑ کی شہادت کے بعد کوفہ سے نکلے اور راستے میں امامؑ سے مل گئے۔

(۳۰) - عمرا بن ضبیعہ بن قیس بن ثعلبہ ضبعی تمیمی: یہ عمر سعد کے ساتھ نکلے تھے اور ۱۰ محرم سے پہلے امامؑ سے آ ملے۔

(۳۱) - عمرو بن عبد اللہ ہمدانی جندی: یہ ایام ہد نہ میں امامؑ سے ملحق ہوئے۔

(۳۲) - عمران بن کعب بن حارث اشجعی۔

(۳۳) - عبد الرحمن بن عبد اللہ بن کدن بن ارحب: کربلا میں امامؑ سے ملے۔

(۳۴) - قارب بن عبد اللہ الدولی: یہ امام حسینؑ کے غلاموں میں تھے۔

ان کی والدہ امامؑ کی کنیز تھیں۔ امامؑ نے ان کو عبد اللہ الدولی عقد میں دیا جس سے قارب پیدا ہوئے۔ یہ

مدینہ سے امامؑ کے ساتھ نکلے تھے۔

(۳۵) - قاسط بن زہیر بن حرث تغلیسی: یہ امیر المؤمنین حضرت علیؑ کے اصحاب میں سے تھے۔ کوفہ سے نکلے

اور امامؑ سے جا ملے۔

(۳۶) - مقسط بن زہیر بن حرث تغلیسی:

(۳۷) - کر دوس بن زہیر بن حرث تغلیسی:

(۳۸) - کنانہ بن عقیق تغلیسی: یہ کوفہ نکلے اور امامؑ سے جا ملے۔

(۳۹) - قاسم بن حبیب بن ابی بشر الازدی: یہ کوفہ کے شجاعوں میں سے تھے عمر سعد کے ساتھ نکلے اور

بعد میں ایام ہد نہ میں امامؑ سے آ ملے۔

(۴۰) - مجمع بن عبد اللہ عائدی المزجعی: یہ امیر المؤمنین حضرت علیؑ کے اصحاب میں سے تھے اپنے بیٹے

عائز اور عمرو بن خالد صیداوی اور نافع بن ہلال کے ساتھ امامؑ سے راستے میں ملے تھے۔

(۴۱) - عائد بن مجمع بن عبد اللہ عائد المزجعی۔

(۴۲) - مسعود بن حجاج تمیمی: یہ معروف شیعوں میں سے تھے عمر سعد کے لشکر میں تھے اور بعد میں امامؑ سے

جا ملے۔

(۴۳) - عبد الرحمن بن مسعود بن حجاج تمیمی:

(۴۴) - مسلم بن کثیر عارج ازدی کوفی: ی ہ حضرت علیؑ کے شیعوں میں سے تھے۔

(۴۵) - شیبیط مولیٰ الحرث بن سرلیج ہمدانی جامری۔

(۴۶) - شیبیط بن عبد اللہ ہشلمی بصری: یہ مدینہ سے امام حسینؑ کے ساتھ آئے تھے۔

(۴۷) - نعم عجلان انصاری۔

(۴۸) - نعمان بن عمرو راسبی۔

یزدلوں کا شہسواروں سے مقابلہ

بزدلی اور شہ سواری دو اصطلاحیں ہیں جو عام طور پر جنگ میں استعمال ہوتی ہیں۔ جنگی اصطلاحات کی رو سے یہ نہیں کہا جاتا کہ جو مر گئے وہ بزدل تھے اور جو زندہ رہے وہ شہسوار ہیں بلکہ جو موت سے ڈرتے ہیں دنیاوی زندگی کو دل و جان سے چاہتے ہیں اور موقع محل پاتے ہی راہ فرار اختیار کرتے ہیں وہ بزدل ہوتے ہیں اس کے برعکس جو سکون کے ساتھ دشمن پر ٹوٹ پڑتے ہیں، موت کو حیات پر ترجیح دیتے ہیں، فرار کا موقع ملنے کے باوجود راہ فرار نہیں اختیار کرتے، جنہیں اپنی زندگی سے زیادہ اپنے اہداف و مقاصد عزیز ہوتے ہیں، اپنے ہدف و مقصد کے حصول کے لئے جان دیتے ہیں انہیں شہسوار اور میدان اور شجاع کہا جاتا ہے۔

امام حسین علیہ السلام کے لشکر کے ادنیٰ سے ادنیٰ مجاہد نے بھی شجاعت، شہامت اور شہسواری کے میدان میں آئندہ آنے والوں کے لئے ایک ناقابل شکست نظیر چھوڑی ہے۔ یہ بات ہم امام حسینؑ کے عقیدت مند ہونے کی وجہ سے نہیں کہتے بلکہ اس جنگ سے متعلق لکھے گئے حقائق تاریخ کی کتب میں نمایاں طور پر موجود ہیں۔ ان جانبا زوں کی شجاعت اور لیرانہ مقابلوں اور مبارزوں کا اعتراف خود دشمنوں نے بھی کیا ہے۔ چنانچہ عمر ابن سعد کے لشکر کی امام حسینؑ کے لشکر کے بارے میں کہتے ہیں کہ یا ران حسینؑ حسینؑ ایک ایسے گروہ و جماعت سے تھے کہ جن کے ہاتھوں میں تلواروں کے قبضے ہوتے تھے وہ شیر کی مانند ہمارے لشکر میں کود کر دائیں بائیں حملہ کرتے تھے وہ خود ہمارے لشکر پر اس طرح کود کرتے تھے جیسے وہ کسی طرح کی امان کے کواہاں نہیں بلکہ موت کے علاوہ کسی اور چیز کے طلبگار نہیں۔

کعب بن جابر ازوی امام حسینؑ کے لشکر کی صفت بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ:

”ہم نے جتنی شجاعت، قوت، ارادی، استقامت اور بے جگری حسینؑ کے لشکر میں دیکھی کہیں اور نہیں دیکھی۔“

عمر ابن حجاج جو عمر ابن سعد کے لشکر کے سرداروں میں سے تھا وہ اپنے لشکر کے افراد کو مخاطب کر کے کہتا ہے۔

”تم جانتے ہو کہ تم کس کے مقابل ہو؟ پاد رکھو! تم ایسے شجاع اور بصیرت و آگاہی رکھنے والے لوگوں کے مقابلے میں ہو جو موت کو اپنا ہدف بنا چکے ہیں۔ تم ایک ایک کر کے ان سے مقابلے کے لئے نہ جاؤ ورنہ قتل ہو جاؤ گے۔“

عباس محمود عقاد کہتا ہے کہ حسینؑ کے ساتھ ایک ایسا منتخب شدہ گروہ تھا جو شجاعت اور جرات مندی میں منفرد تھا اور جنگ کے آداب و رسومات سے پوری طرح آگاہ تھا۔ وہ اپنی جنگ کے صلہ میں کسی قسم کے دنیاوی اہداف و مقاصد نہیں رکھتا تھا۔ حسینی لشکر کا ہر فرد میدان جنگ میں جا کر اپنا حسب و نسب اور اپنا ہدف و مقصد بیان کر کے دشمن سے مبارزہ کرتا اور جب وہ میدان میں کودتا تو دشمن کا لشکر خوف کے مارے پیچھے ہٹتا تھا۔ ان کی شجاعت، بہادری اور اپنے قیام و تحریک پر یقین محکم کی دلیل یہ ہے کہ ان میں سے ایک بھی فرد میدان جنگ سے فرار کر کے خیمہ میں نہیں آیا اور تاریخ اس کی گواہ ہے۔ اس کے برعکس عمر سعد کے لشکر کی طرف سے مقابلے میں آنے والے رجز نہیں پڑھتے تھے۔ اہل عرب کے نزدیک رجز ایک جنگی اصول ہے اور جنگ کے موقع پر رجز نہ پڑھنا جنگ سے فرار کی علامت سمجھا جاتا تھا اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ مقابلے پر آنے والا سپاہی اضطراب اور پریشانی کا شکار ہے۔

لشکر حسینؑ کے مقابل آ کر دشمن کا رجز نہ پڑھنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اپنے قبیلہ و خاندان کے سامنے اپنے ننگ و عار کا خطرہ محسوس کرتا تھا۔

غرض پہلے حملے کے بعد جب ایک مقابلے میں ایک کا مقابلہ شروع ہوا اور حسینی لشکر کے افراد یکے بعد دیگرے میدان میں جانے کے لئے ایک دوسرے پر سبقت کرنے لگے تو وہ ایک دوسرے کو اسلام اور وقت کا دفاع کرنے کی وصیت کرتے تھے۔ انصار و اصحاب کے بعد نوبت بنی ہاشم تک پہنچی اور یکے بعد دیگرے جو ان بنی ہاشم کے مبارزہ، مقابلہ اور شہادت کا سلسلہ اس وقت اپنے اختتام کو پہنچا جب لشکر حسینی کا علم بردار اور اہل بیت حسینؑ کا آخری سہارا قمر بنی ہاشم نے نبرہ علقمہ کے کنارے اپنے آقا و مولیٰ حسینؑ پر اپنی جان نچھاور کر دی۔

روح خدا کی واپسی

قرآن کریم انسانی نفس کی وابستگیوں کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ کچھ ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں جو دنیا کی تمام لذتوں سے کٹ کر حتیٰ اپنی عزیز اور قریب ترین شخصیتوں کی محبتوں کو بھی خیر باد کہہ کر اپنی تمام تر وابستگیوں کو خداوند متعال کی ذات میں ضم کر دیتے ہیں۔ عشق الہی کی ایسی ہی ایک اعلیٰ ترین مثال کربلا کے میدان میں ۶۱ ہجری کی شب عاشور کے وہ آخری لمحات ہیں کہ جب اپنے رب سے شوق ملاقات میں سہرتا پاؤں ہوا ایک انسان اپنے شیدائیوں، جانثاروں حتیٰ اپنے عزیز ترین اہل بیت کو بھی یہ تلقین کر رہا ہے کہ.....

”تم اپنی ذمہ داریاں پوری کر چکے۔ تم سب نے اپنے وفاداریوں اور محبت کی وہ ارفع ترین مثال قائم کر دی ہے جس پر تاریخ کو بھی ہمیشہ زبر ہے گا۔ مجھے اپنے رب سے ملاقات کے لئے تنہا چھوڑ دو، میں اپنی بیعت کو تمہاری گردنوں سے اٹھاتا ہوں۔“

حسینؑ کیوں آج اپنے جانثاروں، شیدائیوں اور اپنے اہلبیت کو یہ تلقین کر رہے ہیں کہ وہ حسینؑ کو تنہا چھوڑ کر چلے جائیں؟

اس لئے.....

حسینؑ کے کانوں میں ایک صدا گونج رہی ہے.....

”یا ایہ نفس المطمئنه ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ“

لیکن.....

حسینؑ کے یہ جانثار حسینؑ کو چھوڑ کر جانے پر آمادہ نہیں۔ انہوں نے بھی تو اپنے پاکیزہ نفوس کو خدا کی راہ میں حسینؑ ہی کی ذات سے وابستہ کیا ہوا ہے۔ اپنے ماویٰ و ملجا اپنے آقا و مولیٰ کو کربلا کے میدان میں تنہا چھوڑ کر بھلا کیسے جاسکتے ہیں؟

اور آخر کار.....

روز عاشورا ان پاک نفسوں نے خود کو حسینؑ پر قربان کر دیا۔ یہ اپنی جانیں حسینؑ پر نثار کر چکے۔ تا دم آخر حسینؑ سے وابستگی کی شرط بہ کمال احسن اپنے اختتام کو پہنچ چکی۔

لیکن.....

حسینؑ اور اہل بیت حسینؑ کی باہم وابستگی ابھی باقی ہے، یہ وابستگی کوئی عام اور معمولی وابستگی نہیں ہے، یہ ایک بھائی کی اپنی بہن اور ایک بن کی اپنے بھائی سے وابستگی ہے، یہ کوئی عام بھائی اور بہن نہیں ہیں، ایک طرف حسینؑ جیسا بھائی ہے جو اپنے جد پیغمبرؐ کی ہو، بہو تصویر ہے،

دوسری طرف زینبؑ جیسی بہن ہے جو اپنی ماں زہراءؑ مرضیہؑ کی مکمل شبیہ ہے،

ابھی بھائی کو بہن سے جدا ہونا ہے،

ابھی حسینؑ کو اپنی بہن زینبؑ کو اس فراق و جدائی کے لئے آمادہ کرنا ہے، بھائی نے بہن کو لقاء اللہ اور سفر الی اللہ کی خاطر اس جدائی کے لئے آمادہ کر لیا،

بھائی اور بہن دونوں لقاء اللہ اور خدا سے اپنی انتہائی وابستگی کی مثال قائم کرنے پر متفق و متحد اور آمادہ ہیں۔

اب.....

حسینؑ زینبؑ کو چھوڑ کر میدان میں جائیں گے،

اور ادھر کچھ دیر بعد.....

زینبؑ بغیر حسینؑ کے بازار کو فوشام میں جائیں گی،

بھائی اور بہن دونوں لقاء الہی کی خاطر اپنے اپنے مشن پر آمادہ ہیں، زینبؑ اسیری کے لئے آمادہ، حسینؑ

شہادت کے لئے،

حسینؑ خیمہ سے نکل رہے ہیں، ساکنانِ ملاءِ اعلیٰ حیرت و تعجب سے انگشت بدنداں ہیں،

تین دن کا پیاسا حسینؑ میدان میں پہنچا، ادھر خون حسینؑ کا پیاسا دشمن کا لشکر حرکت میں آیا۔ حسینؑ

”نفس مطمئنه“ کی کامل تصویر بن کر میدان میں وارد ہوا، ادھر بزدل دشمن خوف سے لرزاں ہے، آگے

بڑھنے اور رتلوار اور ریزہ استعمال کرنے کی دشمن ہمت نہیں دشمن نے دور ہی سے اس تین دن کے پیاسے حسینؑ پر تیروں اور پتھروں کی بارش کر دی اور آخر کار رزخموں سے چور ہو کر لقاء الہی کا یہ عاشق گھوڑے سے گر کر کربلا کے ریگ زار پر اپنے رب کے حضور سجدہ ریز ہوا اور اپنے خالق کی آواز ”ارجعی الی ربک راصیۃ مرضیۃ“ پر لبیک کہتا ہوا اس کے حضور جا پہنچا۔

اور یوں.....

طاقت و قدرت کے غلبہ کیا اصول اور قانون توازن و معادلہ کے تحت تیس ہزار کا لشکر بہتر کے لشکر پر غلبہ حاصل کرنے میں آخر کار کامیاب ہو گیا۔

تیس ہزار کے لشکر کا بہتر پر غلبہ

صبح عاشور سے عصر عاشور تک ۱۴ یا ۱۵ گھنٹے کی مدت میں کربلا میں عمر سعد کے تیس ہزار فوج کے لشکر نے امام حسینؑ کے ۷۲ یا کچھ زائد افراد کے لشکر پر آخر کار فتح حاصل کر لیا اور اس ۷۲ افراد کی فوج کو (اگر اسے فوج کہا جائے تو) خاک و خون میں نہلا کر فتح و کامرانی کے شادیاں بجا لے۔

ایک طرف عمر سعد کی فوج کے غلغلوں اور نعروں سے کربلا کا میدان کونج رہا تھا دوسری طرف خانوادہ عترت و طہارتؑ اور اولاد پیغمبرؐ اور اولاد علیؑ و فاطمہؑ کے و احسینا و روحا کی دلدوز صداؤں سے آسمان کا سینہ شق تھا۔ ملائے علیؑ میں ایک کہرام مچا تھا ان دلدوز صداؤں پیغمبرؐ و بتولؑ، علیؑ و حسنؑ کو خلد بڑیں چھوڑ کر بے تابانہ کربلا کے میدان میں آنے پر مجبور کر دیا تھا۔

مردان الہی اپنا فریضہ اور وظیفہ بہ کمال احسن انجام دے کر ”فزت برب الکعبۃ“ کی صدائیں بلند کرتے ہوئے بہشت بڑیوں کی طرف سدھار چکے تھے۔ ادھر لشکر ابلیس اپنی فتح و کامرانی پر نازاں شیطانی قبضہ بلند کر رہا تھا اس لئے کہ اس عسکری فتح حاصل ہوئی تھی۔ یہ ایک طبعی قانون ہے کہ ہمیشہ جنگ میں غلبہ عسکری طاقت و قوت کے تناسب سے ہوتا ہے لہذا تیس ہزار کے لشکر کا ۷۲ افراد پر غلبہ اس طبعی قانون کے تحت یقینی تھا۔ لیکن ہمیں اموی لشکر کی فتح اور حسینؑ کی شکست کے پس منظر میں یہ دیکھنا ہے یہ

دونوں لشکر اور دونوں فریق آخر کیا چاہتے تھے؟

یزید کیا چاہتا تھا؟

اور حسینؑ کیا؟

یزید نے اپنی اس فتح سے کیا حاصل کیا؟

اور حسینؑ نے اس شکست کے نتیجے میں کیا کھویا؟

کیا یزید کا ہدف حسینؑ کو قتل کرنا تھا؟ یقیناً اس کا ہدف و مقصد حسینؑ کو قتل کرنا نہیں بلکہ اپنی حکومت کو ایک ایسا استحکام اور دوام بخشنا تھا کہ جہاں وہ اطمینان و سکون سے بلا روک ٹوک اپنی حکومت چلا سکے۔ حسینؑ کو قتل تو وہ صرف اس لئے کرنا چاہتا تھا کہ حسینؑ اس کے اس مقصد کی راہ میں حائل تھے۔ وہ اس رکاوٹ کو اپنی راہ سے ہٹانا چاہتا تھا۔ یقیناً وہ اس رکاوٹ کو ہٹانے میں کامیاب ہو گیا لیکن اپنا ہدف اور مقصد حاصل کرنے میں اسے نہ صرف ناکامی ہوئی بلکہ اس کے برعکس اس کی مشکلات اور پریشانیوں میں اضافہ ہو گیا۔

ادھر ہم جب یہ تجزیہ کرتے ہیں کہ حسینؑ نے اپنی شکست کے نتیجے میں کیا کھویا تو ہم دیکھتے ہیں کہ ابو عبد اللہ حسینؑ نے عسکری لحاظ سے ضرور شکست کھائی لیکن وہ اپنے اہداف میں بلاشبہ کامیاب رہے۔

حسینی اہداف و مقاصد کیا تھے؟

جب ہم ان مقدس اہداف و مقاصد پر نظر ڈالنا چاہتے ہیں تو افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ وہ اب اتنے دھندلا چکے ہیں کہ اب ہم ان کا تعین نہیں کر پاتے۔ اس لئے کہ وہ اہداف ہمارے محترم عزاداروں کی رسوم عزاداری کی نذر رہ چکے انہوں نے امامؑ کے اصل اہداف کو پس پشت ڈال کر اپنے ان خود ساختہ اہداف کو امامؑ کے اہداف قرار دے ڈالا جو کسی طرح ان کے اہداف سے میل نہیں کھاتے۔ تاہم ہمارے علماء اور مفکرین اصل اہداف و مقاصد کو جا کر کرنے اور سامنے لانے کی کاوشوں میں مصروف ہیں اور اپنا فریضہ انجام دینے میں کوشاں ہیں لیکن ابھی تک کسی اتفاقی نقطہ پر نہیں پہنچ سکے ہیں۔ غیر مربوط

اور ذیلی اہداف سے صرف نظر کرتے ہوئے ہم یہاں مندرجہ ذیل اہداف پر روشنی ڈالیں گے جو علماء و مفکرین کے زیر بحث ہیں۔

(۱) شہادت۔

(۲) مسئولیت اور ماموریت کی انجام دہی۔

(۳) حکومت کا قیام اور با زیابی خلافت۔

امام حسین علیہ السلام کے اہداف کی ان عنوانات پر ہم اپنی گزارشات اس امید کے ساتھ قارئین خصوصاً اہل فکر کی خدمت میں پیش کرنے کی جسارت کر رہے ہیں کہ وہ اپنی آراء اور تنقید و تبصرے سے ہماری اصطلاح فرمائیں گے۔

(۱)۔ شہادت

کیا آپ کا ہدف و مقصد شہادت تھا جس کی پیشین گوئی آپ نے بارہا یہ کہہ کر کی کہ.....

”یہ لوگ ہمیں شہید کریں گے۔“ یا

”ہم شہادت کی طرف بڑھ رہے ہیں۔“

کبھی فرمایا کہ.....

”ہم شہادت کو گلے لگانے کے متمنی ہیں۔“

آپ کے ان کلمات کو ایک خبر اور پیشین گوئی تو کہا جاسکتا ہے جو آنے اپنے اسلاف کے توسط سے بیان فرمائی یا اسے حالات کے منطقی تحلیل و تجزیے کا نتیجہ قرار دیا جاسکتا ہے، لیکن ان کلمات سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ آپ کا مطلوب و مقصود ہی شہادت ہے کسی طرح درست نہیں۔

اگر یہ مان لیا جائے کہ آپ کا ہدف و مقصد ہی شہادت تھا تو شہادت کے حصول میں کون سا امر مانع تھا؟ یا کون سا گروہ آپ کی اس راہ میں رکاوٹ تھا؟

کیا یزید بن عبد اللہ ابن زیاد اور لشکر عمر سعد آپ کو شہید ہونے سے روک رہے تھے؟

ایسا نہیں ہے بلکہ آپ کے شہید ہونے پر تو یہ لوگ الٹا خوش ہوتے کیونکہ اس صورت میں آپ کو شہید کرنے کی زحمت اور مشکلات سے یہ بچ جاتے اور آپ کو شہید کرنے کی بدنامی اور اس کے سنگین نتائج کا سامنا بھی انہیں نہ کرنا پڑتا لہذا یہ لوگ تو شہادت کی راہ میں رکاوٹ نہیں کہے جاسکتے۔

پھر کیا جو ان بنی ہاشم شہادت کی راہ میں رکاوٹ تھے جو یہ کہتے تھے کہ جب تک ہم زندہ ہیں آپ کو شہید ہونے نہیں دیں گے؟

اگر ایسا ہے تو پھر امام کو ایسے افراد کی تعداد میں اضافہ کرنے کی کوشش نہیں کرنا چاہئے تھی۔

لہذا آپ کا مطلوب و مقصود شہادت نہیں تھا۔ شہادت بذات خود کبھی ہدف قرار نہیں پاسکتی کیونکہ وہ تو ہدف کے حصول کا ذریعہ اور وسیلہ ہے۔ چنانچہ قرآن میں ”قتل فی سبیل اللہ“ اور قتل فی سبیل المستضعفین“ کا بیان آیا ہے۔ اس لئے شہادت بذات خود وسیلہ اور ذریعہ ہے ہدف نہیں۔

(۲)۔ مسئولیت اور ماموریت کی انجام دہی

بعض مفکرین اور علماء کے نزدیک امام حسین علیہ السلام کا ہدف اپنے وظیفہ اور اپنی مسئولیت کی انجام دہی تھا۔ ان کے نقطہ نظر کے مطابق قیام حکومت اور با زیابی خلافت کا عمل کتنی ہی اہمیت کا حامل کیوں نہ ہو۔ اس ہدف کے حصول کے لئے کچھ مقدمات و وسائل و ذرائع کا موجود ہونا ضروری ہے ورنہ بغیر وسائل و ذرائع کے اس ہدف تک پہنچنا ایسا ہی ہے جیسے سیڑھی یا لفٹ کے بغیر چھت پر پہنچنا۔ چونکہ ایسے وسائل اور ذرائع امام کی میسر نہیں تھے لہذا وہ کہتے ہیں کہ قیام حکومت اور با زیابی خلافت کو آپ کا ہدف قرار دینا بعید نظر آتا ہے۔

چنانچہ دو روضہ عظیم رہبر حضرت آیت اللہ العظمی سید علی خامنہ ای دام ظلہ نے بھی اپنے تاریخی خطاب میں اسی نظریے کو ترجیح دی ہے۔ (ملاحظہ فرمائیں کتاب فلسفہ عزاداری اور قیام امام حسینؑ) لیکن ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے مؤدبانہ ہم ایک سوال کرنا چاہیں گے اور وہ یہ کہ..... اگر امام کا ہدف مسئولیت اور ماموریت کی انجام دہی تھا تو وہ وظیفہ اور مسئولیت کیا تھا؟

کیونکہ ہر وظیفہ اور مسئولیت کا تعلق اور ربط کسی چیز سے ہوتا ہے ہم یہ معلوم کرنا چاہیں گے کہ امام نے کون سا وظیفہ انجام دیا؟ آپ نے کس مسئولیت اور ماموریت کو انجام دیا؟ مثلاً..... کسی مالی معاونت میں اپنی مسئولیت ادا کی؟ حقوق والدین کے سلسلے میں اپنا وظیفہ انجام دیا؟ یا تبلیغ احکام کے سلسلے میں اپنا فریضہ ادا کیا؟ اگر نہیں تو پھر۔

وہ تمام اقدامات جو امام نے کئے اور جو فریضہ انجام دیا کیا وہ سب حکومت اسلام کے قیام اور خلافت اسلامیہ کی بازیابی کے لئے نہیں تھا؟  
وہ مقامات  
جہاں سے امام حسینؑ نہیں گزرے

جیسا کہ پہلے بیان کر چکے ہیں ہر تحریک اور قیام کی کامیابی اور ناکامی میں مکان و زمان کا دخل ہوتا ہے۔ ہر آگاہ و آشنا ہر اپنی تحریک کے آغاز سے پہلے مناسب زمان و مکان کی تلاش و جستجو کرتا ہے۔ قیام مقدس امام حسینؑ کے لئے بھی یہ دو عوامل ناگزیر تھے۔ چونکہ اس موضوع پر کوئی کتاب یا مقالہ ہماری نظر سے نہیں گزرا ہم نے اپنی استطاعت اور استعداد کے مطابق قیام مقدس امام حسینؑ میں جغرافیہ کی اہمیت کے موضوع پر اس کتاب کی ترتیب و تنظیم کی کوشش کی ہے۔ اب تک ہم نے ان مقامات کا ذکر کیا ہے جہاں سے امام حسینؑ نے اپنے قیام و انقلاب کا آغاز کیا یا اپنی تحریک کے دوران وہاں سے گزرے اور جہاں یہ قیام اپنے اختتام کو پہنچا۔ کچھ مقامات ایسے بھی ہیں جن کا ذکر اس قیام سے مربوط کتب تاریخ، سیرت اور مقاتل میں آیا ہے لیکن امامؑ کا وہاں سے گزرنے کا ہوا۔ اس باب میں ہم ان مقامات کا ذکر کرنا چاہتے ہیں۔

شام

امام حسین علیہ السلام کے مقدس قیام کے سلسلے میں شام کا ذکر کافی تکرار کے ساتھ آتا ہے۔ آپ

کے قیام کا نقطہ آغاز ہی وہ حکم نامہ بنا جو یزید کی طرف سے بنی امیہ کے دارالخلافہ ”شام“ سے صادر ہوا تھا اور جس میں آپ سے اس کی بیعت کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ امام حسین علیہ السلام کے قیام و انقلاب کے بارے میں آپ کی تمام نقل و حرکت پر نظر رکھنے اور آپ کو گرفتار یا قتل کرنے کے تمام احکام شام ہی سے صادر ہوتے تھے۔ کربلا میں آپ کی اور آپ کے انصار و اعموان کی شہادت کے بعد شہداء کے سر ہائے مقدس اور اہل بیت رسولؐ کو اسیر کر کے ”شام“ ہی میں یزید کے دربار میں لایا گیا۔ عقیلہ قریش زینب کبریٰ سلام اللہ علیہا اور سید سجاد امام زین العابدین علیہ السلام نے اسیری کے عالم میں یزید کے دربار میں جو تاریخی خطبات دیئے وہ اسی ”شام“ میں دیئے۔ یہ وہی شام ہے۔ جہاں اسیران اہل بیت پر مظالم کی انتہا کی گئی۔ اس لحاظ سے قیام امام حسینؑ کی جغرافیائی حیثیت میں شام کا ذکر مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ امام حسینؑ کے قیام و انقلاب کے اہداف کا مرکزی نقطہ ہی شام کی اس غاصب، غیر مشروع اور ناجائز حکومت کے تسلط سے دین و ملت کو آزاد کرانا تھا۔

کہتے ہیں کہ کنعان بن حام کی قوم سے ایک قوم نکلی۔ اس قوم میں جب اختلاف اور افتراق ہوا تو ان میں سے ایک گروہ نے شمال یعنی بانیس طرف رخ کیا۔ چونکہ بانیس طرف کو فال بد اور بد شگونئی سمجھا جاتا ہے اس لئے بد شگونئی کی علامت کے طور پر اسے ”شام“ کہا گیا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ سام بن نوح پہلا شخص تھا جو یہاں وارد ہوا اور اس کے نام پر ”شام“ کے بجائے (سین کی جگہ شین لگا کر) اس کا نام ”شام“ پڑا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ سلیمان ابن داؤد کی وفات کے بعد بنی اسرائیل کے بارہ اسباط میں سے ڈھائی اسباط نے بیت المقدس میں قیام کیا اور ساڑھے نو اسباط نے ایک شہر میں قیام کیا جسے ”شامین“ کہا جاتا تھا، اس لحاظ سے ارض فلسطین کو ”شام“ کہا گیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ شام قبلہ کی بانیس جانب ہے اس لئے اسے شام کہتے ہیں لیکن اس نظریے کو رد کیا گیا ہے۔

اس وقت فلسطین، اردن اور لبنان کے تمام علاقوں کو ملا کر شام یا شامات کہا جاتا تھا۔ یہ اس وقت روم کی امپیریلٹ (Imperialist) حکومت کے جنوب کا حصہ تھا۔

ایک حدیث میں ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا کہ ”یہ بہترین جگہوں میں سے ایک جگہ ہے یہاں خیرات زیادہ ہے۔“ اس کے علاوہ یہ انبیاء کا مرکز ہے۔

سوریہ

پہلے شام کو ”سوریہ“ کہتے تھے۔ آج کل بھی اس کو ”شام“ کہتے ہیں اور ”سوریہ“ زیادہ کہا جاتا ہے۔ سوریہ دراصل ”شام“ میں ”خناصرہ“ اور سلیمیہ کے درمیان ایک جگہ کا نام ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ”سوریہ“ کے گرد چاروں طرف ایک دیوار تھی جو چھ میٹر سے زیادہ اونچی تھی اس لئے ”سوریہ“ میں اس دیوار کو رسی کے ذریعہ عبور کر کے آنا پڑتا تھا۔

### دمشق

”دمشق“ ایک جگہ کا نام ہے۔ دنیا کی سات اقلیموں میں سے اس کا شمار تیسری اقلیم میں ہوتا ہے۔ ”دمشق“ کو ”دمشق“ اس لئے کہتے ہیں کہ اس کو ”دمشق“ بن قانی بن ارفحہد بن سام بن نوح نے آباد کیا اس لئے اس کے نام پر اس کا نام ”دمشق“ پڑا۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ اس کو نیوراسف نے آباد کیا۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اس شہر کے وجود میں آنے کے پانچ سال بعد پیدا ہوئے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس کو حیرون بن سعد بن عاد بن ارم بن سام بن نوح نے آباد کیا۔ بعض نے اسے دمشق بن عمرو بن کنعان سے نسبت دی ہے۔ کہتے ہیں کہ سورہ مومنون کی آیت نمبر ۵ ”واذبحنہما الی ربوۃ ذات قرارو معین“ میں ”ربوہ“ سورہ تین میں ”زیتون“ اور ”طور سینین“ اور سورہ فجر میں ”ارم ذات العماذ“ یہ سب تفسیریں دمشق کے بارے میں ہیں۔ اس کو دنیا کی جنت کہا جاتا ہے۔ یہ علاقہ سرسبز و شاداب ہے یہاں نہریں جاری ہیں ہر قسم کے میوہ جات یہاں ملتے ہیں۔ یہاں انبیاء نے نزول فرمایا پناہ لی اور نماز پڑھی۔ حضرت آدم صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی اتارے حضرت نوح علیہ السلام کا گھر یہیں پر تھا اور کشتی نوح یہیں سے روانہ ہوئی۔

اسلامی افواج نے ایک سال تک ”دمشق“ کو محاصرے میں رکھا اس کے ”باب جابیہ“ پر ابو عبیدہ

جراح ”باب شرقی“ پر خالد بن ولید ”باب توما“ پر عمرو بن عاص اور ”باب صغیر“ پر یزید ابن ابی سفیان تھا۔ ایک سال کے محاصرے کے بعد یہاں پر محصور لوگ صلح پر مجبور ہوئے اور انہوں نے ابو عبیدہ جراح کو لکھا کہ ہم صلح کے لئے آمادہ ہیں اس طرح رجب ۱۲ ہجری میں یہ صلح ہوئی۔

### شام کی اسلامی تاریخ

پیغمبر اکرمؐ نے حارث ابن عمیر ازدی کو اپنا نمائندہ بنا کر ہرقل بادشاہ روم کی طرف بھیجا۔ آپ کے اس نمائندے کو عمر غسانی نے قتل کر دیا۔ اپنے اس نمائندے کا قتل پیغمبرؐ پر بہت شاق گزرا۔ آپ نے تین ہزار افراد پر مشتمل ایک اسلامی لشکر زید ابن حارثہ کی قیادت میں قصاص لینے کے لئے روانہ کیا اور ہمدان کی قیادت میں اس لشکر کی قیادت میں قتل ہو جائیں تو جعفر ابن ابی طالب لشکر کی قیادت سنبھالیں اور اگر وہ بھی قتل ہو جائیں تو عبد اللہ بن رواحہ اسلامی افواج کی قیادت کریں۔

مسلمانوں کے لشکر کو خبر ملی کہ ہرقل بلقاسے ایک لاکھ رومی فوج کے ساتھ نکلا ہے اور شام سے بھی اتنی ہی تعداد میں اسے مزید لشکر مل گیا ہے۔ مسلمانوں کی اس قلیل فوج نے ”موتہ“ نامی ایک جگہ پناہ لی جو بلقاسے نزدیک تھی۔ یہاں جنگ چھڑی اور پیغمبر اکرمؐ کے متعین کردہ اسلامی افواج کے تینوں سربراہ اپنی فوج کے بہت سے افراد کے ساتھ شہید ہو گئے۔ باقی ماندہ لشکر خالد بن ولید کی قیادت میں واپس مدینہ پہنچا۔

۹ ہجری میں پیغمبر اکرمؐ نے مدینہ میں تمام مسلمانوں کو رومیوں سے جنگ کرنے کے لئے متحد ہونے کی دعوت دی اور ایک عظیم اسلامی لشکر لے کر تبوک کی طرف روانہ ہوئے جو شام ہی کا ایک حصہ تھا۔ یہ لشکر ”جیش عسره“ کے نام سے مشہور ہوا کیونکہ یہ ایک سخت جنگ تھی، فصل کاٹنے کا زمانہ تھا، گرمی کا موسم تھا، فاصلہ بہت طویل تھا اور مقابلہ ایک بڑی طاقت سے تھا۔ پیغمبرؐ جب تبوک پہنچے تو صحابہ بن رویہ صاحب ایلا آپ کے پاس آیا اور مصالحت کرنے اور جزیہ دینے پر آمادہ ہوا۔

پیغمبر اکرمؐ نے اپنی حیات مبارکہ میں ایک لشکر ترتیب دیا اور اسے اسامہ بن زید کی قیادت میں روانہ

کرنا چاہا لیکن لشکر کی روانگی سے قبل ہی پیغمبر رحلت فرما گئے۔

اس کے بعد ۱۲ ہجری میں حضرت ابو بکر نے روم سے جنگ کرنے کے لئے چار لشکر تیار کئے۔ ان لشکروں میں سے ایک کی قیادت عمرو بن عاص کو دی اور اس کو فلسطین روانہ کیا، دوسرے لشکر کی قیادت یزید ابن ابی سفیان کو دی اسے دمشق بھیجا اور تیسرا لشکر شرجیل ابن حسنہ کی قیادت میں اردن روانہ کیا۔ اس کے علاوہ ان لشکروں کا سربراہ پہلے خالد بن سعید بن عاص کو بنایا لیکن ان کی روانگی سے پہلے حضرت عمر کے کہنے پر خالد بن سعید کو معزول کر کے خالد بن ولید کو ان لشکروں کا سربراہ بنایا۔ ان کو معزول کرنے کی وجہ شاید یہ ہو کہ وہ حضرت علی کے حامیوں میں سے تھے۔ یہ تمام لشکر تیس ہزار فوجیوں پر مشتمل تھے۔ یہ خبر جب ہرقل کو ملی کہ مسلمانوں کا لشکر چار سو سالاروں پر مشتمل ہے اور مختلف سمتوں سے حملہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے تو اس نے ہر لشکر کے مقابلے میں اس سے دو گنی فوج کے ساتھ مقابلہ کرنے کا ارادہ کیا اور حمص کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنایا۔ مسلمان فوجوں نے اس کی اطلاع عمرو بن عاص کو دی۔ اس نے مشورہ دیا کہ بہتر یہ ہے کہ ہم سب یرموک میں جمع ہو جائیں۔ یرموک ایک وادی ہے جو اردن کے قریب ہے۔ ادھر ہر قبل کو جب مسلمان فوجوں کے یرموک میں جمع ہونے کی خبر ملی تو اس نے اپنی فوجوں کو بھی یرموک میں جمع ہونے کا حکم دیا۔ اس جنگ کے دوران حضرت ابو بکر وفات پا گئے اور حضرت عمر خلیفہ بنے جنہوں نے خالد بن ولید کو ہٹا کر ابو عبیدہ جراح کو رئیس لشکر بنایا جن کے ہاتھوں شام فتح ہوا۔

ابو عبیدہ جراح کی وفات کے بعد حضرت عمر نے یزید ابن ابی سفیان کو پورے علاقے کا گورنر بنایا۔ یزید ابن ابی سفیان نے حضرت عمر کے دور ہی میں وفات پائی۔ اس کی جگہ اس کے بھائی معاویہ ابن ابی سفیان کو شام کا گورنر بنایا گیا۔ معاویہ نے حضرت عمر کے آخری دور اور حضرت عثمان کے پورے دور خلافت میں مرکزی خلیفہ کے نمائندے اور امیر شام کے نام سے شام پر حکومت کی۔

حضرت علی کے خلیفہ بننے کے بعد معاویہ نے آپ کی خلافت کو قبول کرنے سے انکار کیا اور آپ کی شرعی اور جمہوری خلافت کے خلاف بغاوت کی۔ ایک طرف تو وہ بالواسطہ طور پر جنگ جمل کی تحریک

کا محرک ہے جب کو دوسری طرف بلا واسطہ بذات خود ایک بڑا لشکر لے کر صفین میں علی کے خلاف جنگ کے لئے نکلے۔ صفین کی طویل جنگ میں حضرت علی کی واضح فتح عمرو بن عاص کے مکر و فریب کے نتیجے میں شکست میں تبدیل ہو گئی۔ بعد میں حکیم کے نام سے معاویہ نے اپنی غاصب حکومت کو قانونی بنانے کی مذموم کوشش کی۔

حضرت علی کی شہادت کے بعد معاویہ ابن ابی سفیان مکر و فریب کے ساتھ ایک ہاتھ میں صلح کا پرچم اور دوسرے میں تلوار لے کر امام حسن کے خلاف نبرد آزما ہوا اور آخر کار اپنی اس مکر و چالوسی کے نتیجے میں اپنے مذموم عزائم میں کامیاب ہوا۔ اس طرح تیس سال کے عرصے کی یہ نیم خود مختار حکومت امارت سے خلافت میں تبدیل ہو گئی اور معاویہ ابن ابی سفیان جو اب تک امیر شام کے نام سے شام پر مسلط تھے اب مملکت اسلامیہ کا خلیفہ بن بیٹھا۔ اس کے بعد اسلام ناب محمدی کے خلاف آخری تیر جو معاویہ کے ترکش سے نکلا وہ اپنے فاسق و فاجر بیٹے کے سر پر خلافت کا تاج رکھنا تھا۔ چنانچہ خلافت کو ہمیشہ کے لئے اموی خاندان میں منتقل کرنے کی غرض سے اس نے یزید جیسے ما اہل اور اسلام ناشناس شخص کو اپنا جانشین اور والی عہد قرار دے دیا۔ جس نے تخت خلافت پر بیٹھتے ہی نواسہ رسول کے قتل پر کمر باندھ کر اپنی اسلام دشمنی کا ثبوت دیا اور بالآخر اس گھناؤنے جرم کا ارتکاب کر کے ہی دم لیا۔

شام کے رہنے والے زیادہ تر لوگ نصرانی رومی تھے۔ مسلمان ہونے کے بعد کلمہ پڑھ کر آغوش اسلام میں آنکھ کھولتے ہی انہوں نے ابو سفیان جیسے دشمن اسلام کی اولاد کو اسلام اور رسول اسلام کے بہروپ میں دیکھا اور بد قسمتی سے انہیں کو اسلام اور پیغمبر اسلام کا نمائندہ سمجھا۔ فرزند ابی سفیان نے اسلام کی غلط تصویر تفسیر پیش کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ علی اور اولاد علی پر سب و شتم کی منحوس رسم ڈالی۔ چنانچہ شام علی اور اولاد علی کے خلاف غلط اور گمراہ کن تبلیغاتی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کے لوگ اہل بیت سے مانوس نہ تھے۔

امام حسین علیہ السلام کے مقدس قیام کی جغرافیائی حیثیت کا مطالعہ کرتے وقت ایک مقام جس کا خاص اہمیت کے ساتھ ذکر آتا ہے وہ بصرہ کا شہر ہے۔ اس شہر کے ذکر کی وجوہات اور اس شہر سے مربوط دیگر واقعات اور مسائل پر گفتگو سے پہلے ہم بصرہ کراہیکہ خا کہ پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

سرزمین عرب میں بصرہ نام کے دو شہر ہیں۔ ایک عراق میں اور دوسرا مغرب میں۔ لہذا بصرہ کو تثنیہ کے صیغہ میں بصرتان بھی کہتے ہیں۔ تثنیہ کے صیغہ میں جب بصرتان کہتے ہیں تو اس سے مراد بصرہ عراق اور بصرہ مغرب ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ بصرتان سے مراد کوفہ و بصرہ بھی ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ والی بصرہ کچھ بصرہ میں رہتا تھا اور کوفہ میں۔

ابن انبار لکھتے ہیں کہ عربی لغت میں بصرہ اس سخت غلیظ زمین کو کہتے ہیں جس کے پتھر چوپایوں کے سم کوڑنے کا سبب بنتے ہیں۔ بعض کے نزدیک بصرہ اس نرم زمین کو کہتے ہیں جس میں سیاہ پتھر ہوں لیکن ابن اعرابی نے پہلی توجیہ کو ترجیح دی ہے کہ بصرہ سخت غلیظ پتھر کو کہتے ہیں۔ شرقی ابن قظامی نے اس شہر کو بصرہ کہنے کی توجیہ یوں بیان کی ہے۔

”جب مسلمان اس شہر میں وارد ہوئے اور ان کی نظر یہاں پتھروں پر پڑی تو انہوں نے بے ساختہ کہا کہ ارض بصرہ ہے۔“

صاحب منجد نے لکھا ہے کہ بصرہ شط العرب پر واقع ہے جو فرات اور جہ سے مل کر بنا ہے۔ یہ سمندر کے کنارے پر واقع ہے۔ جنگ جمل جو امیر المومنین امام علی علیہ السلام اور ام المومنین حضرت عائشہ کے درمیان لڑی گئی۔ یہیں پر واقع ہوئی تھی۔

اہل بصرہ کے متعلق جو کلمات مولیٰ امیر المومنین امام علی علیہ السلام کی زبان مبارک سے صادر ہوئے ان کو سید رضی نے نہج البلاغہ کے خطبہ نمبر ۱۳ میں یوں بیان فرمایا ہے۔

”(اے اہل بصرہ) تمہارا اخلاق پست ہے، عہد شکنی تمہارا شیوہ ہے تمہارا دین منافقت پر مبنی ہے، تمہارا پانی شور ہے، تمہارے درمیان زندگی گناہ کا سبب ہے تمہاری سرزمین خدا کی سرزمین میں غلیظ

ترین جگہ ہے۔ یہ پانی سے بہت نزدیک اور آسمان سے بہت دور ہے۔ یہاں شر تو گنا ہے۔“

اسی طرح خطبہ نمبر ۱۴ میں ہے کہ۔

”تمہاری سرزمین پانی سے نزدیک اور آسمان سے دور ہے تمہاری عقل خفیف اور علم کمزور اور سفاہت پر مبنی ہے۔ تم تیرا مارنے والوں کے لئے ہدف شکاری کے لئے شکار اور کھانے والوں کے لئے ترلقمہ ہو۔“

یہاں کے لوگ عموماً حضرت علیؑ سے عناد رکھتے تھے۔ تاریخ نگاروں نے لکھا ہے کہ اہل بصرہ کی غالب اکثریت عثمانی العقیدہ تھی۔ یہ تجزیہ اس لحاظ سے صحیح نظر آتا ہے کہ جب طلحہ اور زبیر نے حضرت علیؑ کے خلاف محاذ قائم کرنے کا ارادہ کیا تو انہوں نے اسی شہر کا انتخاب کیا۔

امام حسین علیہ السلام کے مقدس قیام و انقلاب کے لئے بصرہ کا کیوں انتخاب نہیں کیا اور اس کو کیوں نظر انداز کیا۔ اس کی دو بڑی وجوہ ہیں۔

(الف) ایک وجہ تو یہ تھی کہ بصرہ کے لوگ جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا اہل بیتؑ سے چنداں مانوس نہ تھے لہذا امام حسینؑ کو وہاں عوامی تائید حاصل نہیں تھی۔

(ب) دوسری وجہ یہ تھی کہ یہاں عبید اللہ ابن زبیر جیسا شقی انسان مسلط تھا اور بصرہ پر اس کا کنٹرول تھا۔

☆ آپ کے قیام و انقلاب کے سلسلے میں اس شہر کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ وہی شہر ہے جس کے رؤسا میں سے پانچ بڑی شخصیات مالک بن مسمع، بکری، اصف بن قیس، قیس بن عیشم، منذر ابن جارد اور ریزید ابن مسعود ثقیلی کے نام امام نام مکہ سے خط لکھا جس کا مضمون یوں ہے۔

”معبود نے محمدؐ کو اپنی مخلوق میں منتخب فرمایا اور نبوت و رسالت کا درجہ تفویض کیا اور جب وہ انسانوں کی ہدایت اور اپنے فریضہ منصبی کو انجام دے چکے تو پھر انہیں اپنی بارگاہ میں بلا لیا۔ ہم ان کے اہل بیتؑ ولی وصی اور وارث ہیں، ہم طپوری ملت میں قیادت و رہبری کے دوسروں سے زیادہ اہل ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ایک گروہ ہم پر سبقت لے گیا اور ہمیں ہمارے حق سے محروم کر دیا۔ ہم لوگوں نے بھی

اپنی عظمت و منزلت، علم و آگہی کے باوجود خاموشی اختیار کر لی تاکہ ملتِ اسلامیہ اختلاف و انتشار سے بچ سکے اور اسلام کا شیرازہ بکھرنے سے رہ جائے، میں نے مسلمانوں کے آرام و اطمینان کو اپنے حقوق پر مقدم رکھا۔ ہمارا قصد تمہارے سامنے ہے..... میں تمہیں کتابِ خدا و سنتِ رسولؐ کی طرف دعوت دے رہا ہوں۔ تحقیق سنتِ مٹ چکی ہے اور بدعتِ زندہ ہو چکی ہے۔ اگر تم میری بات کو قبول کرو گے اور میری اطاعت کرو گے تو میں تمہیں رشد و ہدایت کی طرف لے جاؤں گا۔“

امام علیہ السلام نے اپنے اس خط کے ذریعے اہل بصرہ کے ذمہ دار افراد پر مندرجہ ذیل نکات کو واضح اور روشن کیا ہے۔

☆ خلافت اور حکومت میں اہل بیتِ اطہار کا مقام۔

☆ شریعت کی بقاء اور امت کی وحدت کے لئے خاندانِ رسالت کی قربانیاں۔

☆ اس وقت امت کا کردار اور ذمہ داری۔

☆ وہ مسئولیت اور ذمہ داری جس کے بار سنگین کو آپؐ نے اپنے دوش مبارک پر اٹھایا ہے۔

☆ آپؐ کے قیام و انقلاب کے سلسلے میں بصرہ کی اہمیت ان شہداء اور ان کی قربانیوں کی وجہ سے بھی نمایاں ہے جو اس شہر نے امامؑ کی نصرت و مدد میں پیش کیں۔

بصرہ میں لوگوں نے یزید بن مسعود شہلی اور دیگر ذرائع سے جب یہ سنا کہ امامؑ ہمیں اپنی نصرت کے لئے بلا رہے ہیں تو وہ لوگ کہ جو اپنے دل میں اہل بیتِ علیہم السلام کے لئے عشق و محبت رکھتے تھے ان کے دل امامؑ کی نصرت کے لئے تڑپ اٹھے۔ ان جاٹار ان امامؑ میں سے ایک شخص یزید بن حبیب العبدی ہے

یہ دیگر دو ستار ان اہل بیت کے ہمراہ ماریہ بنتِ مقدامی ایک مومنہ کے گھر جمع ہوئے۔ حبیب العبدی اہل بیتِ اطہار سے انتہائی عشق و ولا رکھتے تھے۔ ان کے دس بچے تھے۔ انہوں نے اپنی اولاد میں سے دو

لڑکوں عبداللہ اور عبید اللہ کو امامؑ کی نصرت پر آمادہ کیا اور اس مومنہ ماریہ بنتِ مقدامی کے گھر میں موجود لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ میں تو امامؑ کی نصرت کے لئے نکل رہا ہوں، تم میں سے کون میرے ساتھ

چلنے کو تیار ہے، حبیب العبدی کو بھی اپنے اس ارادے سے باز آنے کا مشورہ دیا۔ لیکن وہ کسی نا کہ بندی اور خوف دہرا اس کی پروا کئے بغیر اپنے مصمم عزم و ارادے پر قائم رہے۔ جن لوگوں نے امامؑ کی نصرت میں نکلنے میں حبیب العبدی کا ساتھ دیا ان میں اس کے دو بیٹوں عبداللہ اور عبید اللہ کے علاوہ عامر بن مسلم عبدی، موسیٰ عامر، سیف بن ماک عبدی اور اوس بن امیہ عبدی شامل ہیں جو تمام مشکلات کے باوجود نا کہ بندی توڑ کر بصرہ سے نکلنے میں کامیاب ہوئے اور یزید بن مسعود شہلی اور دوسرے رؤساء قبائل کو بصرہ میں تیار یوں میں مصروف چھوڑ کر خود کو امامؑ کی خدمت میں پہنچایا۔ جوں ہی انہوں نے اپنے آقا اور مولیٰ امام حسین علیہ السلام کو دیکھا تو خوشی کے مارے قرآن کی یہ آیت ان کی زبان پر جاری ہوئی۔

”قل بفضل اللہ و برحمۃ فبذا لک فلیفرحوا“

”خدا کے فضل و رحمت سے ہمیں یہ سعادت نصیب ہوئی پس ہمیں ایسی سعادت پر خوش ہونا چاہئے

۔“ (سورہ یونس - آیت ۵۸)

یمن

یمن کا پرانا نام ”سبا“ ہے جہاں ملکہ بلقیس کی حکمرانی تھی۔ یہ شہر کعبہ کے دائیں جانب واقع ہے جب کہ شام بائیں جانب۔ کہتے ہیں کہ جب مکہ میں قبائل کا اٹھوٹا بڑھ گیا تو کعبہ کے دائیں جانب رہنے والے وہاں سے کوچ یعنی زمین کے مرکز میں ہے اور اس کے جوانب میں داخل پایا نہیں کا تصور نہیں سے بلکہ سورج کے دائیں طرف واقع ہے۔ کعبہ کے چار گوشے ہیں جس میں ایک گوشہ کا نام رکنِ یمانی ہے۔ یہ ایک مجرہ مستجاب الدعاء رکن سمجھا جاتا ہے۔

امام حسینؑ کے قیام و انقلاب کے سلسلے میں ”یمن“ کا ذکر دو حوالوں سے آتا ہے۔

☆ ایک یہ کہ جب آپؐ نے مکہ چھوڑ کر کوفہ کا ارادہ کیا تو محمد حنفیہ اور عبداللہ ابن عباس نے مشورہ دیا کہ آپؐ کوفہ کی بجائے یمن چلے جائیں کو وہاں آپؐ کے پدربزرگوار کے شیعہ موجود ہیں اور وہاں آپؐ کے لئے محفوظ مقامات ہیں۔ یہ وہ وقت تھا جب عام انسان تو ایک طرف بڑی بڑی شخصیات تک امام

حسین علیہ السلام کے لئے یزید کی حکومت کی طرف سے خطرہ محسوس کر رہی تھیں اور وہ لوگ آپؑ کو کسی ایسے محفوظ مقام پر جانے کا مشورہ دیتے تھے جہاں یزید کی رسائی ممکن نہ ہو۔ لیکن اس کے برخلاف امام حسین علیہ السلام اپنی ذات سے زیادہ اسلام اور شریعت کے لئے خطرہ دیکھ رہے تھے اس لئے آپؑ اپنی ذات کو چھوڑ کر اسلام اور شریعت کو بچانے کی فکر میں تھے۔

☆ اس کے علاوہ امام حسینؑ کے قیام و انقلاب کے سلسلے میں یمن کا ذکر اس حوالے سے آتا ہے کہ جب آپؑ وادی معجم پہنچے تو آپؑ نے دیکھا کہ اسی یمن سے ایک قافلہ اونٹوں پر لدے ہوئے تحفہ و تحائف یزید کے لئے لے کر شام جا رہا تھا تو آپؑ نے ان تحائف کو اپنے قبضہ میں لیا اور قافلہ والوں سے کہا کہ تم میں سے جو واپس جانا چاہتا ہے واپس جاسکتا ہے ہم اسے یہاں تک کی اجرت دیں گے اور جو ہمارے ساتھ چلنا چاہتا ہے ہم انہیں کا حق دیں گے۔

جامر یا جابلص

یہ ایک شہر ہے جو شرق کی آخری حدوں میں واقع ہے۔ یہودیوں کا کہنا ہے کہ طالوت اور جالوت کی جنگ کے موقع پر حضرت موسیٰؑ کی کچھ اولاد بخت نصر سے فرار ہو کر یہاں پہنچی تاکہ ان کی دستبرد سے محفوظ رہ سکیں۔ وہ دن رات سفر کرتے ہوئے یہاں پہنچے اور پھر یہیں انہوں نے سکونت اختیار کر لی۔ ان کی صحیح تعداد کا کسی کو علم نہیں۔ یہودیوں میں کوئی اگر ادھر جائے تو یہ لوگ اسے قتل کر دیں۔

یہ لوگ بندگان خدا ہیں۔ غیر یہودیوں کا کہنا ہے کہ یہ لوگ قوم ثمود کے بچے ہوئے افراد ہیں۔

جابلق

زحاک نے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ جابلق ایک شہر ہے جو مغرب کی آخری حدوں میں واقع ہے یہاں بسنے والے قوم عاد کے بچے ہوئے لوگ ہیں۔

جامر اور جابلق دونوں وہ مقامات ہیں جن کا ذکر امام حسین علیہ السلام نے معاویہ کے سامنے اپنے خطبے میں کیا۔ اپنے کربلا کے خطبے میں امام نے فرمایا کہ تم جامر سے لے کر جابلق تک اگر تلاش کرو

تو تمہیں دختر پنجبیرگی اولاد میں میرے اور میرے بھائی کے سوا دوسرا کوئی نظر نہیں آئے گا۔ اس کے علاوہ امام حسنؑ نے بھی اپنے دو رخلافت میں معاویہ کے سامنے یہی بات کہی تھی۔

آخر میں ہم ائمہ سے مروی اس دعا پر کتاب کا اختتام کرتے ہیں کہ خدایا ہمیں ہر اس چیز میں شامل فرما جس میں تو نے آل محمدؑ کو شام کیا ہے اور ہر اس چیز سے دو فرما جس سے تو نے آل محمدؑ کو دور رکھا ہے۔ اگر تو زندگی عنایت کرے تو زندگی آل محمدؑ عنایت فرما، اگر موت دے تو ممات آل محمدؑ عنایت فرما، ہمارے صحیح کلمات کے صلے میں ہمیں دین مقدس اسلام، مکتب اہل بیت اور راہ حسینؑ کی خدمت کی توفیق عطا فرما اور جو غلطیاں، خطائیں، لغزشیں ہم سے سرزد ہوئی ہوں انہیں اپنے قلم عنفوسے محو فرما دے۔ آمین۔

مصادر و مواخذ کتب

(۱)۔ قرآن وحدیث

قرآن کریم

معجم الفاظ قرآنی

نہج البلاغہ

معجم الفاظ نہج البلاغہ

شرح نہج البلاغہ ابن الحدید

الحج فی القرآن

وسائل الشیعہ

میزان الحکمہ

خطبہ حسین ابن علیؑ درمنی

الدین و تاریخ الحرمین الشریفین

الحج

محمد صادق نجفی

الحاج عباس کرارہ

ڈاکٹر عبداللہ بن محمد بن احمد اللیاری

مجموعہ مقالات فی الحج	اوقاف حج و زیارات ایران	علامہ راغب الاصفہانی	مفردات الفاظ القرآن
الحاج ہکیمہ و رموز	ظفر الاسلام خان	الحاج شیخ علی نمازی الشاہرودی	المنجد فی الاعلام
مکہ	ڈاکٹر شیخ محمد ہادی امینی	محمد علی شرقی	متدرک سعیدۃ البحار
الحج فی الکتاب والسنة	اوقاف حج و زیارات ایران	جواد محدثی	قاموس نہج البلاغہ
الحج فی القرآن	اوقاف حج و زیارات ایران	سید علی اکبر قرشی	فرہنگ عاشورا
حج الانبیاء والائمة	اوقاف حج و زیارات ایران	ڈاکٹر محمد قریب	قاموس قرآن
الکعبہ والحج	ابوالقاسم زین العابدین	(۳)۔ کتب تاریخ	فرہنگ لغات قرآن
کتاب الايضاح فی مناسک الحج والعمرة	عبدالفتاح حسین	تاریخ طبری	مروج الذهب
تفصیل الشریعہ (کتاب الحج)	آیت اللہ محمد فاضل لنکرانی	تاریخ دمشق	تاریخ یعقوبی
مناسک حج مراجع عظام	(۲)۔ قاموس معاجم اور لغت	تاریخ اسلام	تاریخ الکوفہ
قاموس الرجال	آیت اللہ العظمیٰ شیخ محمد تقی التستری	سیمائی کوفہ	تاریخ الکوفہ
تاج العروس من جواهر القاموس	سید محمد تقی الحسینی الزبیدی	تاریخ الدولة الامویہ	تاریخ الکوفہ
لسان العرب	ابن منظور	الامامہ والسیاسہ	جولہ تاریخیہ فی عصر اخفاء الراشدین
معجم مقاییس اللغة لابن الحصین	احمد بن فارس بن زکریا	جولہ تاریخیہ فی عصر اخفاء الراشدین	الهدی والتاریخ
دائرة معارف القرآن العشرین	محمد فرید وجدی	تذکرۃ النخواس	تذکرۃ النخواس
معجم ما استعجم من اسما على بلاد و الموضع	عبداللہ بن عبدالعزیز البکری اندلسی		
مختار الصحاح	محمود خاطر		
معجم قبائل العرب القديمة والحديثة	عمر رضا کمالہ		
معجم البلدان	الشیخ الامام شہاب الدین ابی عبداللہ		
		تالیف غلام رضا گل زوارہ	
		السید حسین بن السید احمد البراتی النجفی	
		شیخ محمد الخضر بیگ	
		ابن قتیبہ الدینوری	
		ڈاکٹر محمد سید وکیل	
		مطہر بن طاہر مقدسی	
		سیط ابن جوزی	

مقاتل الامویین  
 دول الاسلام  
 تجارب لامم  
 تراث کربلا  
 اخبار مکہ  
 اخبار مدینہ  
 حیات اجتماعی مدینہ منورہ  
 اکامل لابن الاثیر  
 تاریخ الاسلام  
 تاریخ الاسلام  
 تذکرۃ الخواص  
 کتاب تہذیب التہذیب  
 وفيات الاعیان  
 اسد الغابہ  
 جرح و تعدیل  
 تہذیب المقال  
 قاموس الرجال  
 معجم الرجال الحدیث  
 البدایہ و النہایہ  
 سیر اعلام النبلاء

محمد الحسینی

حافظ شمس الدین ابی عبداللہ ذہبی

ڈاکٹر ابوالقاسم امامی

سلمان ہادی الطعمہ

ابن الولید محمد بن عبداللہ بن احمد زرقي

ابن الولید محمد بن عبداللہ بن احمد زرقي

السید یاسین احمد یاسین الخیارى

شمس الدین محمد بن احمد بن عثمان الذہبی

الدکتور حسن ابراہیم حسن

ابن جوزی

ابن حجر عسقلانی

ابن خلکان

ابن الاثیر

شیخ الاسلام رازی

سید محمد علی موحد الطحی

شیخ محمد تقی تستری

آیت اللہ الخوئی

ابن کثیر

امام شمس الدین محمد بن احمد عثمان الذہبی

وسیلہ الدارین فی انصار الحسینؑ

واقعة الطف ابی محنف

موسوعة کلمات الامام الحسینؑ

تاریخ زندگی امام حسینؑ (دو جلدیں)

مقتل الحسینؑ لابن جہف

بطل العتقی (تین جلدیں)

حسینؑ فی فکر المسیحی

مبعوث الحسینؑ

الامام الحسینؑ کا اللہ

عاشورا چند اہم الحریکۃ الانبیاء

مقتل الحسینؑ

مہضت الحسینؑ

کتاب عاشورا

ادب الحسینؑ حماسۃ

المواکب الحسینیہ

محاظرات فی الثورة الحسینیہ

علی بن الحسین الاکبر

الامام الحسین الحسین بن علیؑ الشہید

(۴)۔ کتب مقاتل

آیت اللہ سید ابراہیم موسوی زنجانی

تحقیق شیخ محمد ہادی یوسفی غروی

مرکزی تحقیقات باقر العلوم سازمان

تبلیغات اسلام ایران

عمادزادہ

تحقیق حسن غفاری

عبدالواحد مظفر

انطون بارا

محمد علی عابدین

عباس جعفر

آیت اللہ سید محمد تقی مدرسی

عبدالزہرا کعبی

سید حسین قالی

ہادی مدرسی

احمد صابری ہمدانی

ابوالحسن نقوی

آیت اللہ سید محمود ہاشمی

محمد علی عابدین

عبدالوہود والامین

مقتل الحسينؑ

پیام عاشورا

سفیر الحسین مسلم بن عقیلؑ

ابنا عا لرسول فی کربلا

الدواع الذاتیة الانصار الحسینؑ

قیام عاشورا در کلام و پیام امام خمینی

مقتل الحسینؑ للنجف ارزی

مجموعه مقالات کنگره بین المللی

امام خمینی و فرهنگ عاشورا (حصہ دوم)

انصار الحسینؑ

تہمت الحسینؑ

لواعج الاشجان فی مقتل الحسینؑ

العیون العبری فی مقتل سید الشہداء

ثورة الحسینؑ

الماتم الحسینیہ

اسرار عاشورا

الشعائر الحسینیہ بین الوعی والحرفہ

البصار الحسینؑ فی انصار الحسینؑ

یوم الطف

حسینؑ نفس مطمئنہ

شیخ فاضل عباس حیادی

آیت اللہ سید باقر میر دامادی

عبدالواحد شیخ احمد ظفر

خالد محمد خالد

محمد علی عابدین

آقا زہرا امام خمینی

تحقیق علامہ شیخ محمد ساوی

آقا زہرا امام خمینی

آیت اللہ محمد مہدی شمس الدین

آیت اللہ حمید الدین حسینی شہرستانی

آیت اللہ محسن امین آملی

سید امیر اہم میانجی

آیت اللہ محمد مہدی شمس الدین

علی شخص

سید محمد نجفی یزدی

سید کامل ہاشمی

محمد بن شیخ طاہر سائری

ہادی نجفی

آیت اللہ محمد علی

الامام الحسینؑ

الامام الحسینؑ فی حلد البر فیر

عوالم الامام الحسینؑ البحرانی

عاشورا

حیات امام حسینؑ (تین جلدیں)

الملمحہ الحسینیہ

نفس المہموم

حسینؑ منظر آزادگی

سیاست الحسینیہ

سلام بر حسینؑ

حسینؑ کیست

خصائص حسینہ

دروس من ثورة الحسینؑ

عاشورا

مع الحسینؑ فی ہبہتہ

الشہید والثورة

فی رحاب کربلا

مقتل الحسینؑ

نہج الشہادۃ

ماساۃ احدی و ستین وثورة الخالدین

ابن عسا کر

سلیمان کتانی

شیخ عبداللہ بحرانی

شیخ کاظم احمد الاحسانی نجفی

باقر شریف قرشی

آیت اللہ مرتضیٰ مطہری

آیت اللہ شیخ عباس قمی

سید جواد افتخاریان

آیت اللہ شیخ محمد حسین کاشف الغطا

محمود نشی

فضل اللہ کپانی

آیت اللہ شیخ جعفر شوشتری

عباس علی موسوی

آیت اللہ شیخ محمد مہدی شمس الدین

اسد حیدر

ہادی مدرسی

شیخ حسین کورانی

آیت اللہ سید محمد تقی بحر العلوم

سید مرتضیٰ سید محسن حسینی

عبداللہ حسین نور الدین

واقعہ کربلا	شیخ الرکابی	مجلات الرصد	راپڑنی جمہوری اسلامی لبنان
مقتل الحسینؑ	عبدالرزاق مقرر	محنان حسینؑ	محمد صادق نجفی
مقتل الشمس	محمد جواد صاحبی	ہجر حسینؑ	محمد باقر مدرس
شہید جاوید	صالحی نجف آبادی	فوائد المشاہد	شیخ جعفر التستری
زندگانی امام حسینؑ	سید ہاشم رسولی محلاتی	بحار الانوار	علامہ مجلسی
الحسین الشہید	حسین شاکری	مقاتل الظالمین	ابولفرج اصفہانی
عرفان و حماسہ	آیت اللہ جواد آملی	المکھوف علی قتلہ الطفوف	السید الجلیل ابن طاووسؒ
الامام الحسین	عبداللہ العلامی		
قامعہ احل الباطل بدفع شہادت المجادل	شیخ علی بن عبداللہ بحرانی		
مقتل حسینؑ	مترجم انصاری		
چشمہ خورشید	مجموعہ مقالات کنگرہ بین المللی امام خمینی		
اندھنہ عاشورا	مجموعہ مقالات کنگرہ بین المللی امام خمینی		
الحسینؑ سائتہ و سیرتہ	محمد رضا حسینی		
الحسینؑ فی طریقہ الی الشہادۃ	علی بن حسین ہاشمی		
نیم رخمی از حسین ابن علیؑ در بارہ انقلاب خونیں	سید علی اصغر احدی		
ویژگیہائی امام حسینؑ	آیت اللہ شیخ جعفر شوشتری		
قیام حسینیؑ در آئینہ سناہتہ ربیعی	عبدالکریم حسینی قزوینی		
لولو و مرجان	آیت اللہ محمد شاد نوری		
رسالت الحسینؑ (مجلہ)	مرکز دراسات نہضت حسینؑ قم		
مجلات ثقافتہ الاسلامیہ	راپڑنی جمہوری اسلام دمشق		
		اولاً: بنو ہاشم	
		۱. علی بن ابی طالب.	
		۲. جعفر بن ابی طالب.	
		۳. أم الفضل بنت الحارث.	